

فہم القرآن سیریز نمبر 1

پارہ 3

تِلْكَ الرُّسُلُ



سوال و جواب کی صورت میں

قرآن مجید کی ہر آیت کی وضاحت

نگہت ہاشمی

رکوع نمبر 1

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۗ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْكِتَابَ وَآيَدِنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ وَكُونُوا لِلَّهِ مَا اقْتَتَلُوا وَلَكِنْ اِخْتَلَفُوا فِيهِمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ ۗ وَكُونُوا لِلَّهِ مَا اقْتَتَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ يُفَعِّلُ مَا يُرِيدُ (253) ﴾

”یہ سب رسول ہیں ان کے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔ ان میں سے کچھ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اور بعض کو اس نے درجات میں بلند کیا اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو واضح نشانیاں دیں اور ہم نے روح پاک کے ساتھ اس کو قوت عطا کی اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ لوگ جو ان کے بعد تھے آپس میں نہ لڑتے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آئیں، لیکن انہوں نے اختلاف کیا تو ان میں سے کوئی ایمان لایا اور ان میں سے کسی نے کفر کیا اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔“ (253)

سوال 1: ﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ ﴾ ”یہ سب رسول ہیں ان کے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے منتخب کردہ انسان تھے۔ رب العزت نے فرمایا: ﴿اللَّهُ يُصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ﴾ اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب فرماتا ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ (الحج: 75) ﴿2﴾ سب رسولوں کے اعمال صالح تھے اور وہ انسانوں کو نفع پہنچاتے تھے۔ ﴿3﴾ رسول براہ راست اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی پاتے تھے۔ رب العزت نے فرمایا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوْحٍ إِلَيْهِ أَتَىٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر ہم اس کی طرف وحی کرتے رہے کہ بلاشبہ میرے سوا کوئی معبود نہیں چنانچہ تم میری ہی عبادت کرو۔ (الانبیاء: 25) ﴿4﴾ ﴿فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ ”ان کے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے“ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو تمام لوگوں پر فضیلت دی کہ رسولوں پر وحی نازل کی۔ انہوں نے تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلا یا۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى بَعْضٍ﴾ یقیناً ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ (بنی اسرائیل: 55) ﴿6﴾ صحیح ابن حبان کی ایک حدیث میں معراج کے بیان میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے الگ الگ کس نبی کو کس آسمان میں پایا؟ یہ رسولوں کے مرتبوں کی کمی بیشی پر دلیل ہے۔ ﴿7﴾ صحیح بخاری میں اس وضاحت کے بغیر کہ رسول اللہ ﷺ نے کس آسمان پر کس نبی کو پایا، یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے مختلف آسمانوں پر مختلف انبیاء علیہم السلام کو پایا۔ (بخاری: 3342)

سوال 2: رسالت کا فریضہ کیسے ادا کیا جاتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ رسول براہ راست فرشتے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی حاصل کرتے رہے۔ ﴿2﴾ رسول انسانوں کو تعلیم دیتے رہے

اور ان کے نفوس کو پاک کرتے رہے۔ ﴿3﴾ رسول اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کی دعوت دیتے رہے اور شرک سے بچاتے رہے۔ ﴿4﴾ رسول چار کام کرتے رہے: (الف) اللہ تعالیٰ کی کتاب کی آیات تلاوت کرتے رہے۔ (ب) کتاب کی تعلیم دیتے رہے۔ (ج) حکمت کی تعلیم دیتے رہے۔ (د) انسانوں کے نفوس کا تزکیہ کرتے رہے۔ ﴿5﴾ رسولوں نے پاک باز افراد کی تربیت کی جو انسانیت کی راہ نمائی کرتے رہے۔

سوال 3: کیا انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت دی جاسکتی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ فضیلت دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے بندوں کا نہیں، بندوں کا کام سن کر ایمان لانا اور اطاعت کرنا ہے۔ ﴿2﴾ نبی ﷺ نے فرمایا: پیغمبروں کو ایک دوسرے پر فوقیت نہ دو۔ (بخاری، مسلم) ﴿3﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مسلمان اور یہودی میں جھگڑا ہو گیا کیونکہ یہودی نے مسلمان کے سامنے اس طرح قسم کھائی کہ اس کی قسم جس نے موسیٰ کو دنیا والوں میں منتخب کیا۔ مسلمان سے ضبط نہ ہو سکا اور یہودی کے چاٹا مارا اور بولا کیا رحمت عالم ﷺ پر بھی! یہودی نے رحمت عالم ﷺ سے شکایت کی، آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے موسیٰ رضی اللہ عنہ پر فوقیت نہ دو، کیونکہ قیامت کے دن تمام لوگ بے ہوش ہو جائیں گے پھر مجھے سب سے پہلے ہوش آئے گا اور میں موسیٰ کو عرش کا پایہ پکڑے ہوئے پاؤں گا۔ معلوم نہیں وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آئیں گے یا طور والی بے ہوشی کے بدلے میں بے ہوش ہی نہیں ہوں گے۔ (صحیح بخاری: 3408) ﴿4﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے میرے مرتبے سے زیادہ نہ بڑھاؤ جیسے عیسیٰ ابن مریم رضی اللہ عنہما کو نصاریٰ نے ان کے مرتبے سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔ میں تو صرف اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، اس لیے یہی کہا کرو (میرے متعلق) کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ (صحیح بخاری: 3445)

سوال 4: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَأَىٰ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ﴾ ”ان میں سے کچھ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اور بعض کو اس نے درجات میں بلند کیا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللَّهُ﴾ ”ان میں سے کچھ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا“ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم رضی اللہ عنہ سے کلام کیا، سیدنا موسیٰ رضی اللہ عنہ سے طور پہاڑ پر اور سیدنا محمد ﷺ سے معراج والی رات میں کلام کیا جیسا کہ ابن حبان کی ابو ذر رضی اللہ عنہ والی حدیث سے ثابت ہے۔ (مختصر ابن کثیر: 166/1) ﴿2﴾ ﴿وَرَأَىٰ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ﴾ ”اور بعض کو اس نے درجات میں بلند کیا“ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو دوسرے انبیاء سے افضل بنایا اور آپ ﷺ میں وہ تمام فضائل جمع فرمادے جو دوسرے رسولوں کو الگ الگ ملے تھے اور آپ ﷺ کو ایسے مناقب بخشے جن کی وجہ سے آپ اولین اور آخرین سے اشرف قرار پائے۔ (تفسیر سعدی: 302/1) ﴿3﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قیامت کے دن میں سیدنا آدم رضی اللہ عنہ کی اولاد کا سردار ہوں گا اور سب سے پہلے میری قبر کھلے گی اور سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی۔“ (مسلم: 5940)

سوال 5: ﴿وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ﴾ اللہ تعالیٰ نے رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم مجھے انبیاء کے درمیان فضیلت نہ دو“ دونوں کے درمیان کیا مطابقت ہے؟

جواب: ﴿1﴾ دونوں کے درمیان مطابقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو فضیلت دی ہے اور یہ حق ہے اس لیے انبیاء علیہم السلام کی فضیلت کے بارے میں اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے مگر نبی ﷺ کی فضیلت اس طرح بیان نہیں کرنی کہ کسی نبی کی شان میں کمی ہو۔ ﴿2﴾ نبی ﷺ نے اپنی امت کو انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ادب و احترام سکھایا ہے کہ آپ کو لوگوں کے بارے میں پورا علم نہیں کہ انہیں کس بنیاد پر ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہے اس لیے میری فضیلت بھی اس طرح بیان نہیں کرنا کہ کسی نبی کی شان میں کمی ہو۔

سوال 6: ﴿وَاتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْكِتَابَ﴾ ”اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو واضح نشانیاں دیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو جو واضح نشانیاں دیں وہ ان کے معجزات تھے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے، اس کے رسول اور سیدہ مریم علیہا السلام کی طرف نازل ہونے والا اللہ تعالیٰ کا کلمہ اور اس کی جانب سے آنے والی روح ہیں۔

سوال 7: عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو کون سے معجزات عطا کئے گئے تھے؟

جواب: ﴿1﴾ مردوں کو زندہ کرنا۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مٹی کے پرندوں میں پھونک مار کر انہیں زندہ کرنا۔ ﴿3﴾ پیدائشی اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرنا۔ ﴿4﴾ لوگوں کو ان کے کھانے اور ذخیرہ کرنے کے بارے میں بتادینا وغیرہ۔

سوال 8: ﴿وَإِذْ نُنزِّلُ الْبُرُوجَ الْفُؤَادِ﴾ ”اور ہم نے روح پاک کے ساتھ اس کو قوت عطا کی“ قوت عطا کرنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ قوت عطا کرنے سے مراد ایمان اور یقین ہے جس کے ذریعے انہوں نے وہ فریضہ ادا کیا جو ان پر عائد کیا گیا تھا۔ ﴿2﴾ روح القدس سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں جو ہر وقت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہتے تھے۔

سوال 9: ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنْ اٰخْتَلَفُوا﴾ ”اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ لوگ جو ان کے بعد تھے آپس میں نہ لڑتے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آئیں، لیکن انہوں نے اختلاف کیا“ اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ﴾ ”اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ لوگ جو ان کے بعد تھے آپس میں نہ لڑتے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آئیں“ اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور گمراہی دونوں کے راستے واضح کر دیے اور انسانوں کو کوئی راستہ اختیار کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا بلکہ انسان کو اختیار اور ارادے کی آزادی دی تاکہ انسان کا امتحان لے۔ اس طرح ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ لوگ ہدایت یا گمراہی پر رہنے کا فیصلہ خود کریں۔ ﴿2﴾ ﴿وَلَكِنْ اٰخْتَلَفُوا﴾ ”لیکن

انہوں نے اختلاف کیا، رسول کی مخالفت کے لیے جو چیز انسانوں کو جبری بناتی ہے وہ یہ سوچ ہے کہ ہم بزرگوں کے وارث ہیں، ہم نے اپنے بڑوں کا دامن تھام لیا ہے، ہمیں کسی اور کی کیا ضرورت ہے، کسی بھی امت کے زوال کے دور میں لوگ دنیا کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جنت بھی محفوظ رہے۔ اس وقت یہ عقیدہ کہ ہم بزرگوں کے وارث ہیں ایک نفسیاتی سہارا بن جاتا ہے۔ وہ بزرگوں کے تصور میں یہ سکون پالیتے ہیں کہ دنیا میں جو جی چاہے کریں ہماری آخرت خراب ہونے والی نہیں ہے۔ یہی اعتماد اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والے کی مخالفت پر جبری بنا دیتا ہے۔

سوال 10: کیا اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین میں اختلاف پسندیدہ ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین میں اختلاف پسندیدہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا تو اسی میں ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی شریعت پر عمل کر کے اس کے عذاب سے بچیں۔ اسی لیے اس نے کتابیں نازل کیں، انبیاء کا سلسلہ جاری کیا اور بعد والوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ جاری کیا تاکہ لوگ اس کی پسندیدہ راہ اختیار کریں۔

سوال 11: ﴿فِيهِمْ مِّنْ أٰمِنٍ وَمِنْهُمْ مِّنْ كٰفِرٍ﴾ ”تو ان میں سے کوئی ایمان لایا اور ان میں سے کسی نے کفر کیا“ اللہ تعالیٰ کو ہدایت کا راستہ پسند ہے پھر لوگوں میں کوئی مومن اور کوئی کافر کیوں ہو جاتا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے چونکہ ہدایت کا راستہ اختیار کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا اس لیے کوئی اپنے اختیار کا صحیح استعمال کر کے مومن بن جاتا ہے اور کوئی اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے کافر بن جاتا ہے۔ یہ اختیار انسانوں کو اس کی حکمت اور مشیت سے ملا ہے ورنہ اس کی رضا تو اسی میں ہے کہ لوگ ہدایت کا راستہ اختیار کریں۔

سوال 12: ﴿وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا فتنكوا﴾ ”اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ لوگوں میں اختلاف نہ ہو، ان کا معاملہ لڑائی تک نہ پہنچے تو وہ آپس میں نہ لڑتے۔ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَبِيْعًاۗ اَفَاَنْتَ تَكْفُرُ بِاللّٰسِ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مَوْمِنِيْنَ﴾ اور اگر آپ کا رب چاہتا تو جو زمین میں ہیں سب اکٹھے ضرور ایمان لاتے، تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے یہاں تک کہ وہ سب مومن ہو جائیں۔ (پولس: 99)

سوال 13: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو جبراً اختلاف سے کیوں نہیں روکا؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اختلاف سے اس لیے نہیں روکا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو امتحان کی غرض سے پیدا کیا اور اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ارادے اور اختیار کی آزادی دی ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے اس امتحان میں کامیابی کے لیے نبی بھیجے تاکہ وہ انسانوں کو سیدھا راستہ دکھائیں۔ ﴿3﴾ اگر انبیاء علیہم السلام لوگوں کو دین قبول کرنے کے لیے مجبور کرتے تو امتحان ختم ہو جاتا۔ ﴿4﴾ اگر سب لوگ پیدائشی طور پر ہدایت یافتہ ہوتے تو امتحان کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔

سوال 14: ﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ﴾ ”لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے“ کی وضاحت کریں؟
 جواب: ﴿1﴾ ”لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے“ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے کی کوئی رکاوٹ نہیں۔ وہ قدرت رکھتا ہے،
 باختیار ہے، قوی ہے کوئی اس کے فیصلے بدل نہیں سکتا۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے لیکن وہ عادل ہے، وہ الحق ہے۔ اس کا ہر کام حق اور انصاف پر
 مبنی ہوتا ہے۔ وہ حکیم ہے۔ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ ﴿2﴾ آیت میں اس کی تعلیم ہے کہ چھوٹی بڑی، اچھی بری کوئی شے بھی
 ہو، ہر حال مشیت الہی سے باہر نہیں۔

رکوع نمبر 2

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمْ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكَافِرُونَ هُمْ

الظَّالِمُونَ﴾ (254)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ کوئی تجارت
 ہوگی اور نہ کوئی دوستی اور نہ کوئی سفارش اور کافر ہی ظالم ہیں۔“ (254)

سوال 1: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ﴾ ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہیں رزق
 دیا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ اے لوگو جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تصدیق کی۔ ﴿2﴾ ﴿أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ﴾ ”اس
 میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے“ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ایمان کا تقاضا پورا کرنے کا حکم دیا ہے کہ اس رزق میں سے خرچ کرو جو
 ہم نے تمہیں دیا ہے۔ ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے صدقے کو ہمارے لئے ثواب کا
 ذریعہ بنایا۔

سوال 2: ﴿مَنْ قَبْلُ أَنْ يَأْتِيَكُمْ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ﴾ ”اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ کوئی تجارت ہوگی اور نہ
 کوئی دوستی اور نہ کوئی سفارش“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ رب العزت نے قیامت کے دن کے لئے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے جب انسان کو نیکیوں کی شدید ضرورت ہوگی اور زمین
 بھر دولت خرچ کر کے بھی نہ نیکیاں ملیں گی نہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات ملے گی۔ ﴿2﴾ وہ دن جب نہ کوئی دوست کام آئے گا نہ سفارش
 اسی لیے فرمایا کہ اس دن کے آنے سے پہلے صدقہ کرلو۔

سوال 3: ﴿وَلَا شَفَاعَةٌ﴾ ”اور نہ کوئی سفارش ہوگی“ قرآن حکیم نے شفاعت کی نفی کیوں کی ہے؟

جواب: قرآن حکیم میں ایک جگہ بھی شفاعت کی تائید نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی جس شفاعت کے قائل تھے اس کے مطابق یہودیت اور عیسائیت قبول کر لینے کے بعد ہر معصیت اور ہر گناہ جائز ہے۔ قرآن مجید اس قسم کی شفاعت کی نفی کرتا ہے۔ البتہ شفاعت ہوگی ضرور۔ اللہ تعالیٰ جس کو اذن دیں گے وہ شفاعت کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ بھی پابند صوم و صلوة مسلمانوں کی شفاعت کریں گے۔

سوال 4: انفاق کے معاملے کو آخرت کے ہولناک منظر کے ساتھ مربوط کرنے کی حکمت بتائیں؟

جواب: آخرت کا دن کائنات کے مالک کی عظمت و جلال کے ظاہر ہونے کا دن ہے۔ جس دن کوئی سفارش، دوستی، فدیہ یا مدد کام نہیں آئے گی۔ انسان کے شعور کو اس ہولناک دن میں پہنچا کر انفاق کرنے پر ابھارا گیا ہے کہ جب کوئی کام آنے والا نہیں ہوگا تب بندے کا صدقہ اس کا سایہ بنے گا۔ یوں انسان انفاق کا راستہ اختیار کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

سوال 5: ﴿وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ اور کافر ہی ظالم ہیں کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور کافر ہی ظالم ہیں“ ﴿1﴾ اس میں دلیل ہے کہ کافر اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں۔ ﴿2﴾ ظلم سے مراد ہے حق دار کو اس کا حق نہ دینا۔ ﴿3﴾ ایک چیز کو اس کے مقام سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینا ظلم ہے۔ ﴿4﴾ کافروں نے اللہ تعالیٰ کا کفر کیا اور اپنے جیسی مخلوق کی عبادت کی۔ ﴿5﴾ کافروں نے حلال کی بجائے حرام کو اختیار کر کے ظلم کیا۔ ﴿6﴾ کافر خود بھی ہدایت کے راستے پر نہ چلے اور دوسروں کو بھی اس راستے سے روک کر ظلم کیا۔ ﴿7﴾ کافر آخرت کا انکار کر کے دنیا میں من مانی زندگی اختیار کر کے آخرت میں ناکامی مول لے کر اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ حق یہ ہے کہ کافر ہی ظالم ہیں۔

سوال 6: انفاق فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ابن جریج نے کہا: اللہ تعالیٰ کے راستے میں جو مال خرچ کیا جائے خواہ وہ زکوٰۃ ہو یا صدقات انفاق فی سبیل اللہ کہلاتا ہے۔ (الدر المنثور: 1/571) ﴿2﴾ انفاق فی سبیل اللہ سے مراد اپنے مال میں سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق، اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔ ﴿3﴾ انفاق فی سبیل اللہ میں زکوٰۃ اور صدقات دونوں شامل ہیں۔ زکوٰۃ کی ادائیگی بھی انفاق ہے، اہل و عیال کا نان و نفقہ بھی انفاق ہے اور اپنی حیثیت کے مطابق نیک کاموں پر مال خرچ کرنا بھی انفاق ہے۔

سوال 7: رسول اللہ ﷺ کیسے انفاق کیا کرتے تھے؟

جواب: سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ سے دو پہاڑوں کے درمیان کی بکریاں مانگیں تو آپ ﷺ نے اسے اتنی ہی بکریاں عطا فرمادیں۔ وہ آدمی اپنی قوم کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے قوم! اسلام قبول کر لو۔ اللہ کی قسم! محمد ﷺ اس قدر عطا فرماتے ہیں کہ پھر محتاجی کا خوف ہی نہیں رہتا۔ (مسلم: 6021)

سوال 8: انفاق کرنے کا مقصد کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ انفاق کرنے کا بنیادی مقصد اپنے رب کو راضی کر کے اپنے دل کی تنگی کو دور کرنا ہے۔ ﴿2﴾ آخرت کی کامیابی کے لیے کوششیں کرنا ہے۔ ﴿3﴾ انفاق کرنے کا مقصد اسلام کی بقاء کے لیے کی جانے والی کوششوں میں اپنا حصہ ڈالنا ہے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے علم کی ترویج و اشاعت کے لیے مال لگا کر ماحول کی اصلاح کے لیے کی جانے والی کوششوں میں اپنا حصہ ڈالنا ہے۔

سوال 9: رسول اللہ ﷺ نے کیسے صدقہ کرنے کی ترغیب دلائی؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں سوائے تین اعمال کے: صدقہ جاریہ، وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے یا صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔ (صحیح مسلم 4223: ﴿2﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قیامت والے دن کسی بندے کے قدم نہیں ہٹیں گے یہاں تک کہ اس سے (پانچ چیزوں کی بابت) نہ پوچھ لیا جائے: اس کی عمر کے متعلق کہ اس نے اسے کن کاموں میں ختم کیا؟ اس کے علم کے متعلق کہ اس کے مطابق کیا کیا؟ اس کے مال کے بارے میں اس نے اسے کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ اور اس کے جسم کے بارے میں کہ کن چیزوں میں اسے بوسیدہ کیا (کھپایا)؟“ (جامع ترمذی: 2417) ﴿3﴾ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے کون ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ”یا رسول اللہ ﷺ! ہم میں سے ہر شخص کو اپنا مال ہی سب سے زیادہ محبوب ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”پس انسان کا مال تو وہی ہے جو اس نے (صدقہ و خیرات) کر کے آگے بھیجا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو وہ پیچھے چھوڑ گیا۔“ (بخاری: 6442) ﴿4﴾ عَنْ عَبْدِ بْنِ حَاتِمٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ : سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ : اتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ سِيدِنَا عَدِيُّ بْنُ حَاتِمٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ كُوفِرَاتٍ هُوَ سَنَا: ”تم آگ سے بچو اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے (کے صدقے) کے ساتھ ہی۔“ (بخاری: 6023) ﴿5﴾ ایک دفعہ نبی ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تکبیر ہو چکی تھی لیکن آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وہیں چھوڑ کر گھر تشریف لے گئے، تھوڑی دیر کے بعد آئے اور نماز پڑھائی۔ کسی نے اس بے وقت گھر جانے کی وجہ پوچھی تو نبی ﷺ نے فرمایا: گھر میں ایک سونے کا ٹکڑا پڑا رہ گیا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ ایسا نہ ہو وہ گھر میں پڑا ہے اور میں چل بسوں۔“ (بخاری: 851)

سوال 10: اسلام کو اختیار کرتے ہی انفاق (صدقہ کرنے) کا حکم ملتا ہے۔ اسلام کو انفاق کی قیمت پر اختیار کرنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اسلام کو انفاق کی قیمت پر اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انفاق کرنے والا اسلام سے مخلص ہے اور اسلام کے معاملے میں سنجیدہ ہے۔

سوال 11: انفاق (اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ) نہ کرنے کا نقصان کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ انفاق (اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ) نہ کرنے والا ہمیشہ اندھیرے میں رہتا ہے، اسے اسلام کا مقصد ہی سمجھ نہیں آتا۔ ﴿2﴾

اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرنے والے کو شیطان بہکا کر ایسے راستے پر چلاتا ہے جس کی آخری منزل جہنم ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کی راہ

میں خرچ نہ کرنے والا آخرت کے معاملے کو سادہ معاملہ سمجھنے لگتا ہے اور چند نطاہری کاموں کو آخرت کی نجات کے لیے کافی سمجھنے لگتا ہے۔
 ﴿4﴾ انفاق (اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ) نہ کرنے سے انسان کے دل سے نیکیاں کرنے کی خواہش نکل جاتی ہے۔

سوال 12: اہل ایمان سے صدقہ کرنے کا مطالبہ کس نوعیت کی اپیل ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ایک محبت بھری اپیل ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ایک روحانی رابطہ ہے۔ ﴿3﴾ اپیل یہ ہے کہ جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس کا ایک حصہ ہمیں دے دو، آخر ہم ہی دینے والے ہیں۔ ہم اپنے دیے ہوئے میں سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ ﴿4﴾ توجہ دلائی جا رہی ہے کہ ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔ اگر تم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر یہ مواقع نصیب نہیں ہوں گے۔ یہ آخری موقع ہے، اگر یہ ہاتھ سے نکل گیا پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ ﴿5﴾ توجہ دلائی جا رہی ہے کہ مال نفع بخش بزنس میں لگ رہا ہے۔ اس کے بعد کوئی دوستی، کوئی سفارش اس نقصان کی تلافی کے لیے نہیں ہے۔ ﴿6﴾ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تک لوگوں کے درمیان فیصلہ نہیں کر دیا جائے گا ہر شخص اپنے صدقے کے سائے تلے رہے گا۔ (متدرک حاکم) ﴿7﴾ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صدقہ اہل قبور سے گرمی کو ختم کرتا ہے اور مومن قیامت کے دن اپنے صدقے کے سائے تلے ہوگا۔ (طبرانی)

﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۗ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۗ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۗ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ۗ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۗ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (255)﴾

”اللہ تعالیٰ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہمیشہ زندہ ہے، ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے، اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ ہی نیند، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے، کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کی جناب میں سفارش کرے، وہ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے، اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو سموئے ہوئے ہے اور ان دونوں کی حفاظت اسے نہیں تھکتی اور وہی سب سے بلند، سب سے بڑا ہے۔“ (255)

سوال 1: آیت الکرسی کا موضوع کیا ہے؟

جواب: آیت الکرسی اسلامی نظام زندگی کے بنیادی تصور توحید کے موضوع پر ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفات کریمہ اور عظیم مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔

سوال 2: آیت الکرسی کی فضیلت بیان کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ترمذی میں ہے ہر چیز کی کوہان اور بلندی ہے اور قرآن کی بلندی سورہ بقرہ ہے اور اس میں بھی آیت الکرسی تمام آیتوں کی سردار ہے۔ ﴿2﴾ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس سوال پر کہ سارے قرآن میں سب سے زیادہ بزرگ آیت کون سی ہے؟ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے خوب معلوم ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ وہ آیت الکرسی ہے۔ (ابن مردویہ) ﴿3﴾ سیدنا ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ دریافت فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ میں سب سے زیادہ عظمت والی آیت کون سی ہے؟ آپ رضی اللہ عنہ جواب دیتے ہیں: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو اس کا سب سے زیادہ علم ہے۔ آپ ﷺ پھر یہی سوال کرتے ہیں۔ بار بار سوال کرنے پر ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جواب دیتے ہیں: آیت الکرسی۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں: ابوالمندر! اللہ تعالیٰ تجھے تیرا علم مبارک کرے۔ اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! آیت الکرسی کی زبان ہوگی اور ہونٹ ہوں گے اور یہ بادشاہ حقیقی کی تقدیس بیان کرے گی اور عرش کے پایہ سے لگی ہوگی۔ (مسند احمد) ﴿4﴾ آیت الکرسی میں اسم اعظم ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: 351/1) ﴿5﴾ آیت الکرسی پڑھنے سے شیطان دور ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں سورہ البقرہ میں ایک آیت ہے جو قرآن کریم کی تمام آیتوں کی سردار ہے جس گھر میں وہ پڑھی جائے وہاں سے شیطان بھاگ جاتا ہے وہ آیت، آیت الکرسی ہے۔ (مسند رک حاکم) ﴿6﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ صدقہ فطر کے غلہ کی حفاظت پر مجھے مقرر کیا، ایک شخص آیا اور دونوں ہاتھوں سے غلہ لپ بھر بھر کر لینے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ اب میں تجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ پھر انھوں نے آخر تک حدیث بیان کی۔ اس چور نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جب تم اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹنے لگو تو آیت الکرسی پڑھ لیا کرو، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر ایک نگہبان مقرر ہو جائے گا اور شیطان تمہارے قریب صبح تک نہ آسکے گا۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ بات تو اس نے سچی کہی ہے اگرچہ وہ خود جھوٹا ہے۔ وہ شیطان تھا۔ (صحیح بخاری: 3275) ﴿7﴾ نماز کے بعد پڑھنے والے اور جنت کے درمیان صرف موت حائل ہوتی ہے۔ ﴿8﴾ نماز کے بعد پڑھنے سے آئندہ نماز تک اللہ تعالیٰ کی حفاظت ہوتی ہے۔ ”جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے لے اسے جنت میں جانے سے کوئی چیز نہیں روکے گی سوائے موت کے۔“ (ابن مردویہ) ﴿9﴾ بستر پر لیٹتے وقت آیت الکرسی پڑھنے والے کے ساتھ ایک محافظ فرشتہ مقرر کر دیا جاتا ہے۔ (بخاری: 2311) ﴿10﴾ صبح کے وقت آیت الکرسی پڑھنے والا شام تک، شام کے وقت پڑھنے والا صبح تک شیطان کے شر سے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔

سوال 3: آیت الکرسی کی اہمیت کیا ہے؟

جواب: آیت الکرسی میں اسلامی زندگی کی بنیاد بننے والے عقائد و تصورات کی وضاحت کی گئی ہے۔ جب تک بنیاد ٹھیک نہ ہو عمارت درست نہیں ہو سکتی، اسی طرح جب تک انسان کے ذہن میں صحیح عقیدہ نہیں جمتا اس وقت تک زندگی کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی توحید و صفات کو نہایت خوب صورتی اور نزاکت سے بیان فرمایا ہے جس سے ایک طرف تو رب ذوالجلال کی عظمت و عزت

دلوں میں پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف تمام شبہات جو اس کے متعلق یہودیوں اور عیسائیوں کے دلوں میں تھے، دور ہو جاتے ہیں۔ (سراج البیان: 98,99/1)

سوال 4: ﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ ”اللہ تعالیٰ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ ”اللہ تعالیٰ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں“ اللہ تعالیٰ معبود برحق ہے لہذا ہر قسم کی عبادت اور اطاعت اسی کے لئے ہونی چاہئے کیونکہ وہ تمام صفات سے متصف اور عظیم نعمتیں دینے والا ہے۔ ﴿2﴾ بندے کا حق یہ ہے کہ اپنے رب کا بندہ بن کر رہے، اس کے احکامات کی تعمیل کرتا رہے، اس کے منع کئے ہوئے کاموں سے بچتا رہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے باطل ہے لہذا اس کے سوا ہر ایک کی عبادت باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز مخلوق اور ناقص، ہر لحاظ سے محتاج ہے لہذا کسی قسم کی عبادت کا حق نہیں رکھتی۔ (تفسیر سعدی: 304/1) ﴿4﴾ اس جملے میں نفی اور اثبات ہے۔ نفی اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی عبادت کا مستحق نہیں اور اثبات اس بات کا ہے کہ ہر قسم کی الوہیت و عبودیت کے حق دار صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہیں۔ ﴿5﴾ امام طبری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حیی و قیوم کے علاوہ کسی بھی چیز کی عبادت کی ممانعت ہے۔ (تفسیر طبری: 386/5) ﴿6﴾ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں اس بات کی خبر ہے کہ وہ تمام مخلوقات کے لیے تنہا الوہیت والے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر: 330/1) ﴿7﴾ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿الْحَقُّ الْقَيُّومُ﴾ ا۔ ل۔ م۔ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہمیشہ زندہ ہے، ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے۔ (آل عمران: 1، 2) ﴿8﴾ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي الْمَيِّتَ وَيُمِيتُ الْحَيَّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُدْخِلُكَ فِي رَحْمَتِهِ وَمَنْ يُضِلْ اللَّهُ فَمَا لَهُ سَبِيلٌ﴾ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تم سب کو قیامت کے دن ضرور جمع کرے گا جس میں کوئی شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ بات میں سچا اور کون ہے! (النساء: 87) ﴿9﴾ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾ پھر اگر وہ منہ موڑیں تو آپ کہہ دیں اللہ تعالیٰ ہی مجھے کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور وہی عرش عظیم کا رب ہے۔ (التوبہ: 129) ﴿10﴾ اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى﴾ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کے لیے بہترین نام ہیں۔ (طہ: 8) ﴿11﴾ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اس آیت کریمہ میں عقیدہ توحید کا اثبات اور ان سب گروہوں کی تردید ہے، جن کے باطل عقائد پہلے تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اس آیت میں سب سے جلیل القدر، سب سے بڑی عظمت والی، سب سے زیادہ عدل و انصاف والی اور سب سے سچی گواہی ہے جو کہ سب سے بڑی شان و عظمت والے اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑی قدر و منزلت والی بات عقیدہ توحید کی دی ہے۔ (بدائع النثیر: 217/1) ﴿12﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ایمان کی ساٹھ سے کچھ اوپر یا ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑی فضیلت والی ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ شاخ ہے اور سب سے کم رتبے والی راستے سے اذیت کو ہٹانا ہے اور حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔“ (صحیح مسلم: 58) ﴿13﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: ”جب کبھی بھی بندہ کبائر سے اجتناب کرتے ہوئے اخلاص سے (یعنی ریاکاری اور دکھاوے کے لیے نہ کہا جائے ایمان و یقین کے ساتھ کہے) ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ کہتا ہے تو اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ کلمہ تو حید عرش تک پہنچ جاتا ہے۔“ (ترمذی: 3824) ﴿14﴾ سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ”سب سے زیادہ فضیلت والا ذکر ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ ہے“ (ترمذی: 3607) ﴿15﴾ عبد الرحمن مبارک پوری لکھتے ہیں: کیونکہ یہ کلمہ تو حید ہے اور تو حید جیسی کوئی چیز نہیں۔ یہ کفر و ایمان کے درمیان حد فاصل ہے۔ دل کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ جوڑنے والا، غیر اللہ کی سب سے زیادہ نفی کرنے والا، تزکیہ نفس میں سب سے مؤثر، باطن کی صفائی میں سب سے قوی، خیالات کو نفس کی خباثت سے سب سے زیادہ دور کرنے والا اور شیطان کو سب سے زیادہ دفع کرنے والا ہے۔ (تحتہ الاحوذی: 229/9) ﴿16﴾ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقُولُ عِنْدَ الْكَرْبِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْعَلِيمُ الْحَلِيمُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَرَبُّ الْأَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ پریشانی کے وقت یہ دعا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں جو بہت جاننے والا بڑا بڑا بار ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں جو عرش عظیم کا رب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی رب نہیں جو آسمانوں کا رب ہے، زمین کا رب اور عرش کریم کا رب ہے۔ (صحیح بخاری: 7426)

سوال 5: ﴿الْحَيُّ﴾ ”ہمیشہ زندہ ہے“ اس کا مفہوم واضح کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿الْحَيُّ﴾ سے مراد وہ ہستی ہے جسے کامل حیات حاصل ہو اور یہ مستلزم ہے تمام صفات ذاتیہ کو مثلاً سننا، دیکھنا، جاننا اور قدرت رکھنا وغیرہ۔ (تفسیر سعدی: 301/1) ﴿2﴾ قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ﴿الْحَيُّ﴾ وہ ذات ہے جو فوت نہیں ہوتی۔“ (تفسیر قرطبی: 271/1) ﴿3﴾ امام سعدی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ”الْحَيُّ سے مراد باقی رہنے والے۔“ (تفسیر قرطبی: 271/3) ﴿4﴾ امام طبری رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں: ”بلاشبہ الْحَيُّ سے مراد وہ ذات ہے کہ اسی کے لیے دائمی زندگی اور ایسی بقا ہے کہ نہ تو اس کے اول کے لیے کوئی حد ہے اور نہ آخر کے لیے کوئی انتہا، کیونکہ اس کے علاوہ ہر چیز اگرچہ زندہ ہو، اس کی زندگی کے اول کے لیے حد ہے اور آخر کے لیے انتہا ہے وہ اپنی مدت کے ختم ہونے سے ختم ہو جاتی ہے اور اپنے وقت کے پورے ہونے پر ناپید ہو جاتی ہے۔“ (تفسیر طبری: 386، 387/5) ﴿5﴾ امام بغوی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ”وہ ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔“ (تفسیر بغوی: 238/1) ﴿6﴾ امام ابن قیم رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں: ”اسی کے لیے زندگی اپنی انتہائی شکل میں ہے اسی لیے اس پر موت کا بالکل غلبہ نہیں۔“ (القصيدة النونية: 538) ﴿7﴾ رب العزت کا فرمان ہے: ﴿هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۗ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، چنانچہ اسی کو پکارو کہ دین کو اس کے لیے خالص کرنے والے ہو، تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ (المومن: 65) ﴿8﴾ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ کی رائے میں اسم مبارک تمام صفات کمال کو لازم کر دیتا ہے اور یہی اسم اعظم ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”﴿الْحَيُّ﴾ بجائے خود تمام صفات کو لازم کرتا ہے اسی لیے قرآن کریم کی عظیم ترین

آیت ﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ﴾ ہے وہی اسم اعظم ہے کیونکہ ہر زندہ، شعور اور ارادے والا ہوتا ہے اسی لیے وہ تمام صفات کو لازم کرتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی ایسی صفت پر اکتفا کرنا ہوتا جو دیگر صفات کو لازم کرے تو صفت الْحَيُّ سے کیا جاتا۔ (مجموع الفتاویٰ: 311/18) ﴿9﴾ شیخ محمد بن صالح عثیمین نے بیان کیا: ﴿الْحَيُّ الْقَيُّومُ﴾ اللہ تعالیٰ کے اسمائے مبارکہ میں سے دو نام ہیں اور وہ دونوں اپنے اندر تمام اوصاف اور افعال کو سموائے ہوئے ہیں کمال اوصاف الْحَيُّ میں اور کمال افعال الْقَيُّومُ میں ہیں، کیونکہ الْحَيُّ کا معنی کامل زندگی والے۔ اللہ تعالیٰ کی زندگی کا کمال وجود عدم اور کمال و نقض دونوں پہلوؤں سے ہے (یعنی وہ ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا اور اس کی زندگی ہر قسم کے نقض، عیب، خلل اور کوتاہی سے یکسر خالی ہے۔) ﴿10﴾ نبی ﷺ کی دعاؤں میں سے ہے، ”اللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ ، وَبِكَ اَمَنْتُ ، وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ ، وَ اِلَيْكَ اَنْبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ ، اللّٰهُمَّ اِنِيْ اَعُوْذُ بِعِزَّتِكَ ، لَا اِلَهَ اِلَّا اَنْتَ اَنْ تُصَلِّتَنِيْ ، اَنْتَ الْحَيُّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ ، وَالْجَنُّ وَالْاَنْسُ يَمُوْتُوْنَ“ اے اللہ! میں نے تیری فرماں برداری کی اور تجھ پر ایمان لایا اور تجھ پر بھروسہ کیا اور تیری طرف رجوع کیا اور تیری ہی مدد سے جہاد کیا یا اللہ! میں تیری عزت کے ذریعہ پناہ مانگتا ہوں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں کہ تو مجھے گمراہ کر دے۔ تو زندہ ہے جسے موت نہیں اور جن وانس سب مرجائیں گے۔ (صحیح بخاری: 6948) (صحیح مسلم: 6899)

سوال 6: ﴿الْقَيُّومُ﴾ ”ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿الْقَيُّومُ﴾ سے مراد وہ ذات ہے جو خود قائم ہو اور دوسروں کا قیام اس سے ہو۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے وہ تمام افعال شامل ہو جاتے ہیں جس سے وہ متصف ہو، یعنی وہ جو چاہے کر سکتا ہے استواء، نزول، کلام قول، پیدا کرنا، رزق دینا، موت دینا زندہ کرنا اور دیگر نوع کی تدبیر سب اس کے قیوم ہونے میں شامل ہیں۔ اس لئے بعض محققین کا کہنا ہے یہی وہ اسم اعظم ہے جس کے ذریعے دعا رد نہیں ہوتی۔ (تفسیر سعدی: 305/1) ﴿2﴾ ﴿الْقَيُّومُ﴾ ”ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے“ اس سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری مخلوقات کی تخلیق، رزق، دیکھ بھال اور حفاظت کرنے والے ہیں۔ ہر چیز کا وجود بقا اور تدبیر اس کے دست قدرت سے ہے۔ ﴿3﴾ امام طبری لکھتے ہیں: ﴿الْقَيُّومُ﴾ لفظ قیام سے فَيُؤَلِّقُ کا وزن ہے اور اس کا اصلی لفظ الْقَيُّومُ ہے۔ ”اپنی مخلوق کو رزق دینے اور اس کی حفاظت کا بندوبست فرمانے والے ہیں۔“ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ بذات خود قائم ہے اس کا قیام کسی دوسری چیز پر منحصر نہیں۔ قیام ذات کی عزت کا وہی مالک ہے۔ ﴿5﴾ بیہوشی اسی کو حاصل ہے۔ وہ ہر چیز پر قائم، موجود، لازوال اور غیر متغیر ہے۔ ﴿6﴾ امام ربیع سے نقل ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ”ہر چیز کا نظم و نسق چلانے والا کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرتا اسے رزق دیتا اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔“ (تفسیر طبری: 388/5) ﴿7﴾ امام قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ”اپنی مخلوق کے معاملات کی تدبیر کرنے والا ہے۔“ (المحرر المحیط: 287/1) ﴿8﴾ امام ابن قیم رضی اللہ عنہ نے اپنے القصيدة النونية میں قلم بند کیا ہے: ﴿الْقَيُّومُ﴾ میں دو باتیں ہیں: ان دو میں سے ایک یہ کہ وہ از خود قائم ہے اور دوسری یہ کہ پوری کائنات کا قیام اس کے ساتھ ہے وہ دو باتیں ہیں: (الف) وہ اپنے سوا ہر کسی سے مستغنی ہے۔ (ب) تمام مخلوق اس کی محتاج ہے۔ ﴿الْقَيُّومُ﴾ کی صفت والا ہونا بہت بڑی شان و عظمت والی بات ہے اس

طرح اس صفت والا اللہ تعالیٰ بھی بہت بڑی شان والا ہے۔ ﴿9﴾ اپنے سوا دیگر سب چیزوں کو قائم رکھنے والا، اسی لیے سب موجود چیزیں اس کی محتاج ہیں اور وہ ان سے بے نیاز ہے۔ اس کے حکم کے بغیر ان سب چیزوں کا قیام نہیں یعنی نہ تو از خود وجود میں آسکتی ہیں اور نہ ہی وجود میں آنے کے بعد اپنے تئیں باقی رہ سکتی ہیں۔“ (تفسیر ابن کثیر: 330/1) ﴿10﴾ کائنات کی تمام چیزوں کا وجود، بقا اور حفاظت حکم الہی ہی سے ہے، قرآن و سنت میں اس کے پختہ دلائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بغیر ان چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ رب العزت کا ارشاد ہے۔ ﴿أُولَٰئِكَ يَرْوٰوْا إِلَى الظَّيْرِ فَوَقَّهُمْ صَفَّيْتُ وَيَقْبُضُنَّ مَا يَسْكُفُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ ۗ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ اور کیا انہوں نے اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھا اس حال میں کہ وہ پر پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سمیٹ لیتے ہیں رحمان کے سوا انہیں کوئی نہیں تھامتا، بلاشبہ وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہے۔ (الملک: 19) ﴿11﴾ ﴿أَلَمْ يَرْوٰوْا إِلَى الظَّيْرِ مُسْتَعْتَبِينَ فِي جَوِّ السَّمَآءِ ۗ مَا يَسْكُفُنَّ إِلَّا اللّٰهُ ۗ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ کیا انہوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کی فضا میں مسخر ہیں؟ انہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں تھامتا بلاشبہ اس میں یقیناً نشانیاں ہیں ان کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔ (انحل: 79) ﴿12﴾ قاضی ابن ابی العزحنی لکھتے ہیں: ”تمام اسمائے حسنیٰ کا مدار ان دونوں ﴿الْحَيُّ الْقَيُّومُ﴾ پر ہے اور ان سب کے معنی ان دونوں ہی کی طرف پلٹتے ہیں، اور اسم مبارک وہ اپنے اندر کمال غنی اور کمال قدرت سموئے ہوئے ہے سو وہ بلاشبہ اپنی وجہ سے قائم ہیں، وہ اپنے علاوہ کسی کے بھی کسی بھی اعتبار سے محتاج نہیں ہیں۔ اپنے سوا سب کو قائم کرنے والے ہیں۔ ان کے علاوہ کسی کا بھی ان کے بغیر قیام نہیں۔ اس طرح ان دونوں ناموں نے اپنے اندر صفات کمال کو بہترین انداز میں سمو کر رکھا ہے۔“ (شرح الطحاوی فی العقیدۃ السلفیہ، ص: 78)

سوال 7: ﴿لَا تَأْخُذُكَ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾ ”اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ ہی نیند“ وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کی حیات اور قومیت کا ایک مظہر ہے کہ اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ ﴿لَا تَأْخُذُكَ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾ ”اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ ہی نیند“ اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اونگھ، غفلت، نیند اور بے خبری سے پوری طرح پاک ہے۔ اسی لیے وہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔ ﴿2﴾ مولانا عبد الماجد دریا بادی لکھتے ہیں: ”جاہلی مذہبوں کے دیوتا نیند سے جھوم بھی جاتے ہیں اور سونے بھی لگتے ہیں اور اسی غفلت کی حالت میں ان سے طرح طرح کی فروگذاشتیں ہو جاتی ہیں، مسیحیوں اور یہود کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب چھ روز میں آسمانوں اور زمین کو بنا ڈالا تو ساتویں دن اسے سستانے اور آرام لینے کی ضرورت پڑ گئی، اسلام کا خدا، دائم، بے دار، غفلت، سستی اور تھکن سب سے ماوراء خدا ہے۔“ (تفسیر ماجدی) ﴿3﴾ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ کھڑے ہو کر صحابہ رضی اللہ عنہم کو چار باتیں بتائیں: اللہ تعالیٰ سوتا نہیں نہ نیند اس کی ذات کے لائق ہے، وہ ترازو کا محافظ ہے جس کے لیے چاہے جھکا دے جس کے لیے چاہے نہ جھکائے، دن کے اعمال رات سے پہلے اور رات کے اعمال دن سے پہلے اس کی طرف لے جائے جاتے ہیں، اس کے سامنے نور یا آگ کے پردے ہیں اگر وہ ہٹ جائیں تو اس کے چہرے کی تجلیاں ان تمام چیزوں کو جلا دیں جن تک اس کی نگاہ پہنچے۔

سوال 8: ﴿لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ ”جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے“ کی وضاحت کریں؟
 جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا مالک ہے اور باقی سب مملوک ہیں۔ وہ خالق ہے اور باقی مخلوق، وہ رازق ہے اور باقی سب مرزوق ”جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے“ سورج، چاند، ستارے، فرشتے اور آسمان میں موجود ہر چیز اور زمین میں موجود ہر چیز، اپنی تخلیق، ملکیت، بندگی، تدبیر اور انتظام و انصرام کے اعتبار سے تنہا اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ ﴿2﴾ زمین و آسمان میں کسی کو نہ اپنے معاملے میں خود اختیار ہے نہ دوسرے اختیار رکھتے ہیں۔ امام طبری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”وہ ان تمام چیزوں کے کسی شریک اور مد مقابل کے بغیر مالک اور دیگر تمام معبودان باطلہ کے بغیر خالق ہیں۔“ (تفسیر طبری: 395/5) ﴿3﴾ قاضی ابن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”ملکیت کے ساتھ لہذا وہ تمام چیزوں کے مالک اور رب ہیں۔“ (المحرر الوجیز: 276/2) ﴿4﴾ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”ملکیت اور تخلیق کے اعتبار سے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ان ہی کے لیے ہے۔“ (تفسیر بغوی: 239/1)

سوال 9: اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا مالک ہے، اس عقیدے کا انسان کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے، اس کی ملکیت کسی حد میں محدود نہیں، اس کی ملکیت کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں، اس کی ملکیت میں کوئی اس کا شریک نہیں، اس کی ملکیت کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ اس عقیدے کا مومن کی زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ وہ شعوری طور پر اپنی ہر چیز کو مالک کی ملکیت سمجھنے لگتا ہے۔ ﴿2﴾ اس عقیدے کی وجہ سے مومن کے دل سے لالچ، حرص، بخل اور رات دن جمع کرنے کی فکر ختم ہو جاتی ہے۔ ﴿3﴾ اس عقیدے کی وجہ سے مومن کے اندر صبر، قناعت اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہونے کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ فیاض اور سخی ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں سکون اور اطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔ ﴿4﴾ اس عقیدے کی وجہ سے مومن کے دل میں کسی چیز کے نہ ملنے پر حسرت، جلن یا گھٹن پیدا نہیں ہوتی۔

سوال 10: ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَ اٰلِهٖٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ ”کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کی جناب میں سفارش کرے“ اس میں بندے کے مقام کی کیسے وضاحت کی گئی ہے، واضح کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کی جناب میں سفارش کرے“ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اور کبریائی کا بیان ہے۔ روز قیامت کوئی اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور شفاعت کرنے کی جسارت بھی نہیں کر پائے گا۔ رب العزت کا فرمان ہے: ﴿وَلَا يَشْفَعُونَ اِلَّا لِمَنْ اٰمَنَ﴾ ”اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اس کے لئے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرے۔“ (الانبیاء: 28) ﴿2﴾ کوئی شفاعت نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ شفاعت کا مالک ہے لیکن جب وہ چاہے گا تو جس بندے پر رحم کرے گا اس کے حق میں اجازت دے گا۔ اجازت ملنے سے پہلے کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کی جانب سے شفاعت کی خاطر اجازت کا حاصل ہونا ثابت ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کے دربار میں غلاموں کی طرح کھڑا ہوگا۔ نہ اپنے مقام سے آگے بڑھ سکے گا نہ سفارش کی جرأت کر سکے گا الا یہ کہ پیشگی اس کی اجازت دی گئی

ہو۔ ﴿4﴾ اذن الہی کے بغیر شفاعت کی نفی پر دلالت کرنے والی آیات کے مقابلے میں اس آیت یعنی آیت الکرسی کے حصے سے حاصل ہونے والی بات کہیں درجے زیادہ زور دار ہے۔ ﴿5﴾ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”اس میں اس شخص کے لیے انتہا درجے کی ڈانٹ ڈپٹ اور زبردستی ہے جو کہ یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی شخص کسی کو شفاعت کے ذریعے نفع پہنچا سکتا ہے۔ اس میں قبروں کے پجاریوں کے سینوں پر ایسی ضرب کاری، چہروں پر ایسا زور دار طمانچہ اور بازوؤں کا اس قدر توڑنا ہے کہ اس کا کماحقہ اندازہ کرنا محال اور اس کی انتہا کو پہنچانا ممکن ہے۔“ ﴿6﴾ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ کی شان کبریائی کا بیان ہے کہ یہ تو بہت دور کی بات ہے کہ کوئی عناد یا دشمنی یا جھگڑے سے اس کے ارادے کی راہ میں رکاوٹ بنے بلکہ صورت حال یہ ہے کہ ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی اس کے مساوی یارتے میں قریب ہونے کی بنا پر شفاعت یا اس کے روبرو عاجزی کر کے، اس کے ارادے کو ٹال دے۔“ (تفسیر بیضاوی: 1/134) ﴿7﴾ ابو حیان اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر کیا ہے: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی بادشاہت اور کبریائی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ کسی کے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرنے کی خاطر آگے بڑھے۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اذن سے شفاعت کے ہونے پر دلالت کرتی ہے اور اذن کا یہاں معنی حکم ہے۔ (البحر المحیط: 1/288) اس انداز سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے، کون ہے جو یہ جرأت کرے؟ ﴿8﴾ اس حقیقت کی روشنی میں سارے غلط نظریات واضح ہو جاتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رب رب ہے اور بندہ بندہ ہے۔

سوال 11: شفاعت کا عقیدہ خود اللہ تعالیٰ نے دیا، شفاعت کیسے ہوگی، وضاحت کریں؟

جواب: شفاعت اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوگی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسی طرح جیسے ہم دنیا میں جمع ہوتے ہیں، مومنوں کو اکٹھا کرے گا (وہ گرمی وغیرہ سے پریشان ہو کر) کہیں گے: کاش ہم کسی کی سفارش اپنے مالک کے پاس لے جاتے تاکہ ہمیں اپنی اس حالت سے آرام ملتا۔ چنانچہ سب مل کر سیدنا آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ ان سے کہیں گے: آدم علیہ السلام آپ لوگوں کا حال نہیں دیکھتے کس بلا میں گرفتار ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے (خاص) اپنے ہاتھ سے بنایا اور فرشتوں سے سجدہ کرایا اور ہر چیز کے نام آپ کو بتلائے، کچھ سفارش کیجیے تاکہ ہم کو اس جگہ سے نجات ہو کر آرام ملے۔ کہیں گے میں اس لائق نہیں، ان کو وہ گناہ یاد آجائے گا جو انہوں نے کیا تھا (ممنوع درخت میں سے کھانا) مگر تم لوگ ایسا کرو نوح علیہ السلام پیغمبر کے پاس جاؤ وہ پہلے پیغمبر ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف بھیجا تھا۔ آخر وہ لوگ سب نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے، وہ بھی یہی جواب دیں گے کہ میں اس لائق نہیں۔ اپنی خطا جو انہوں نے (دنیا میں) کی تھی یاد کریں گے۔ کہیں گے تم لوگ ایسا کرو ابراہیم علیہ السلام پیغمبر کے پاس جاؤ جو اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں (ان کے پاس جائیں گے) وہ بھی اپنی خطا میں یاد کر کے کہیں گے: میں اس قابل نہیں، تم موسیٰ علیہ السلام پیغمبر کے پاس جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تورات عنایت فرمائی، ان سے بول کر باتیں کیں۔ یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے وہ بھی یہی کہیں گے میں اس لائق نہیں اپنی خطا جو انہوں نے دنیا میں کی تھی یاد کریں گے مگر تم ایسا کرو عیسیٰ علیہ السلام پیغمبر کے پاس جاؤ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے، اس کے رسول، اس کے خاص کلمہ اور خاص روح

ہیں۔ یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے وہ کہیں گے میں اس لائق نہیں تم ایسا کرو محمد ﷺ کے پاس جاؤ وہ اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے ہیں جن کی اگلی پچھلی سب خطائیں بخش دی گئی ہیں۔ آخر یہ سب لوگ جمع ہو کر میرے پاس آئیں گے۔ میں چلوں گا اور اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی اجازت مانگوں گا، مجھ کو اجازت ملے گی۔ میں اپنے پروردگار کو دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑوں گا اور جب تک اس کو منظور ہے وہ مجھ کو سجدے میں ہی پڑا رہنے دے گا۔ اس کے بعد حکم ہوگا ”محمد اپنا سراٹھاؤ اور عرض کرو، تمہاری عرض سنی جائے گی، تمہاری درخواست منظور ہوگی، تمہاری سفارش مقبول ہوگی۔“ اس وقت میں اپنے مالک کی ایسی تعریفیں کروں گا جو وہ مجھ کو سکھا چکا ہے۔ (یا سکھلائے گا) پھر لوگوں کی سفارش شروع کروں گا۔ سفارش کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی۔ میں ان کو بہشت میں لے جاؤں گا، پھر لوٹ کر اپنے پروردگار کے پاس حاضر ہوں گا اور اس کو دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑوں گا جب تک پروردگار چاہے گا مجھ کو سجدے میں پڑا رہنے دے گا۔ اس کے بعد ارشاد ہوگا: ”محمد ﷺ اپنا سراٹھاؤ! جو تم کہو گے سنا جائے گا اور سفارش کرو گے تو قبول ہوگی۔ پھر میں اپنے پروردگار کی ایسی تعریفیں کروں گا جو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو سکھلائیں (یا سکھلائے گا) اس کے بعد سفارش کروں گا لیکن سفارش کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی میں ان کو بہشت میں لے جاؤں گا، پھر لوٹ کر اپنے پروردگار کے پاس حاضر ہوں گا۔ اس کو دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑوں گا جب تک پروردگار چاہے گا مجھ کو سجدے میں پڑا رہنے دے گا اس کے بعد ارشاد ہوگا: ”محمد اپنا سراٹھاؤ! جو تم کہو گے سنا جائے گا اور سفارش کرو گے تو قبول ہوگی۔“ پھر میں اپنے پروردگار کی ایسی تعریفیں کروں گا جو اس نے مجھ کو سکھلائیں (یا سکھلائے گا) اس کے بعد سفارش شروع کروں گا لیکن سفارش کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی۔ میں ان کو بہشت میں لے جاؤں گا پھر لوٹ کر اپنے پروردگار کے پاس حاضر ہوں گا عرض کروں گا: یا پاک پروردگار! اب تو دوزخ میں ایسے ہی لوگ رہ گئے ہیں جو قرآن کے بموجب دوزخ ہی میں ہمیشہ رہنے کے لائق ہیں (یعنی کافر اور مشرک) انس رضی اللہ عنہ نے کہا نبی ﷺ نے فرمایا، دوزخ سے وہ لوگ بھی نکال لیے جائیں گے جنہوں نے لا الہ الا اللہ کہا ہوگا اور ان کے دل میں چیونٹی برابر (یا بھنگے برابر) ایمان ہوگا۔ (صحیح بخاری: 7410)

سوال 12: ﴿يَعْلَمُ﴾ ”وہ جانتا ہے“ اللہ تعالیٰ کا علم کیسا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اس کا علم کامل ہے، وہ ماضی، حال اور مستقبل کا علم رکھتا ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں ”کائنات کی تمام چیزوں کے ماضی حال اور مستقبل کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم کے احاطہ کرنے کی دلیل ہے“ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبُرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ سَّمَاءٍ أَوْ يَأْتِيهَا مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمَا تَحْتَ الثَّرَىٰ وَلَا يُحِيطُ بِشَيْءٍ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ﴾ اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا انہیں کوئی نہیں جانتا، اور وہ خشکی اور سمندر کی ہر چیز کو جانتا ہے اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اسے بھی جانتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ نہیں گرتا اور نہ کوئی ترچیز اور نہ کوئی خشک چیز مگر سب کھلی کتاب میں ہے۔ (الانعام: 59) سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: غیب کی پانچ کنجیاں ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا کہ رحم

مادر میں کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا کہ بارش کب آئے گی، اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا کہ کس جگہ کوئی مرے گا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ قیامت کب ہوگی۔ (صحیح بخاری: 7379) ﴿2﴾ وہ ہر ظاہر و باطن کا علم رکھتا ہے، ہر حاضر و غائب کا علم رکھتا ہے، وہ ساری جزویات پر حاوی علم رکھتا ہے۔ نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں ”اس کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام معلومات کا ایسا جاننے والا ہے کہ مخلوق کے حالات میں سے کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں، یہاں تک کہ وہ غبار آلود زمین کے نیچے ہر طرف سے بند پتھر کے اوپر تاریک رات میں سیاہ چیونٹی کے چلنے، آسمان کی فضا میں ذرہ کی حرکت، ہوا میں (اڑنے والے) پرندے اور پانی میں (تیرنے والی) مچھلی سے آگاہ ہے۔“

سوال 13: اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے کا تصور انسان پر کیسے اثرات مرتب کرتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے کے عقیدے کی وجہ سے مومن اس ذات سے قلبی اور ذہنی تعلق میں بندھ جاتا ہے، وہ ہر لمحے اللہ تعالیٰ کو خود پر نگران محسوس کرتا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے کے عقیدے کی وجہ سے مومن یہ یقین رکھتا ہے کہ اس سے کچھ بھی چھپایا نہیں جا سکتا۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے پر یقین سے مومن کی روح کا پختی ہے پھر وہ ہر ایسے کام سے بچتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہو۔ ﴿4﴾ مومن تکلیف میں اسی کو پکارتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرا رب میرے حالات سے واقف ہے، وہ قدرت رکھنے والا ضرور میری مدد فرمائے گا۔ ﴿5﴾ مومن یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کا علم رکھتا ہے، ہر حاضر و غائب کا علم رکھتا ہے، وہ ساری جزویات پر حاوی علم رکھتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ اس نے زندگی گزارنے کے لیے جو طور طریقے، اصول، ضابطے اور قوانین دیے ہیں وہی اصل حق ہے، ان ہی کی پابندی کرنی ہے۔ ﴿6﴾ مومن یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی زندگی کو ہمارے لیے نمونہ بنایا ہے تو پوری زندگی ان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ ﴿7﴾ اس لیے مومن اپنے اعمال میں حد درجہ محتاط ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ہر سوچ، اپنی گفتگو، اپنے تعلقات، حقوق و فرائض کی ادائیگی میں اپنے آپ کو اپنے رب کے سامنے محسوس کرتا ہے کیونکہ وہ یقین رکھتا ہے کہ میرا مولا علیم ہے مجھ سے حساب لے گا۔ یوں مومن متقی بن جاتا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا مولا اسے وہاں دیکھے جہاں سے اس نے روکا ہے۔ ﴿8﴾ اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے کے عقیدے کی وجہ سے مومن کو اللہ تعالیٰ کی رضا عزیز ہو جاتی ہے۔ ﴿9﴾ اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے کا عقیدہ مومن کو ہر بدی اور ہر ظلم سے روکتا ہے۔

سوال 14: اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے کا یقین کیسے نصیب ہوتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے کا یقین اس کے ’علیم‘ ہونے کے پختہ علم کے ساتھ نصیب ہوتا ہے۔ ﴿2﴾ اس پر غور و فکر سے کہ اس سے کچھ بھی چھپایا نہیں جا سکتا۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے پر گفتگو کرنے سے، اس پر علمی مذاکرے کرنے سے پختہ علم نصیب ہوتا ہے اور اس علم کے ساتھ یقین نصیب ہوتا ہے۔ ﴿4﴾ تو اوصو ابالحق کرنے سے اس کے علیم ہونے کا یقین نصیب ہوتا ہے۔

سوال 15: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ ”وہ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے“ اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”وہ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے“ اللہ تعالیٰ انسانوں کے ماضی اور مستقبل کے حالات اور معاملات کی تفصیلات جانتا ہے یعنی اگلے پچھلے حاضر غائب سب کا علم رکھتا ہے۔ ان میں بندوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ ﴿2﴾ اس میں مخلوق کی بغیر اجازت کے شفاعت سے محرومی کا سبب بتایا گیا ہے۔ شفاعت کرنے اور شفاعت پانے کی اہلیت کا علم صرف اللہ رب العزت کو ہے۔ اس لیے شفاعت کرنے کا اختیار بھی صرف وہی دے سکتا ہے۔ ﴿3﴾ ﴿مَابِئِن آيَاتِنَاهُمْ﴾ سے مراد ان سے پہلے دنیا کے معاملات اور وَمَا خَلَقْنَاهُ سے مقصود ان کے بعد آخرت کا معاملہ۔ (تفسیر بغوی: 239/1) ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ اپنے علم سے ہر اس چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو تھی اور جو ہے اور جو ہوگی۔ کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے مخفی اور چھپی ہوئی نہیں وہ ساری مخلوقات کے تمام حالات سے خوب آگاہ ہے۔ جابر بن عبد اللہ سلمی رضی اللہ عنہ نے خبر دی، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کو اپنے ہر مباح کام میں استخارہ کرنا سکھاتے تھے جس طرح آپ ﷺ قرآن کی سورت سکھاتے تھے۔ آپ ﷺ فرماتے کہ جب تم میں سے کوئی کسی کام کا قصد کرے تو اسے چاہیے کہ فرض کے سوا اور رکعت نفل نماز پڑھے، پھر سلام کے بعد یہ دعا کرے ”اے اللہ میں تیرے علم کے طفیل اس کام میں خیریت طلب کرتا ہوں اور تیری قدرت کے طفیل طاقت مانگتا ہوں اور تیرا فضل۔ کیونکہ تجھے قدرت ہے اور مجھے نہیں، تو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا اور تو غیوب کا بہت جاننے والا ہے۔ اے اللہ! پس اگر تو یہ بات جانتا ہے (اس وقت استخارہ کرنے والے کو اس کام کا نام لینا چاہیے) کہ اس کام میں میرے لیے دنیا و آخرت میں بھلائی ہے یا اس طرح فرمایا کہ ”میرے دین میں اور گزران میں اور میرے ہر انجام کے اعتبار سے بھلائی ہے تو اس پر مجھے قادر بنا دے اور میرے لیے اسے آسان کر دے، پھر اس میں میرے لیے برکت فرما۔ اے اللہ! اور اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے لیے برا ہے میرے دین اور گزارہ کے اعتبار سے اور میرے انجام کے اعتبار سے، یا فرمایا کہ میری دنیا و دین کے اعتبار سے تو مجھے اس کام سے دور کر دے اور میرے لیے بھلائی مقدر کر دے جہاں بھی وہ ہو اور پھر مجھے اس پر راضی اور خوش رکھ۔“ (صحیح بخاری: 7390) ﴿5﴾ ﴿مَابِئِن آيَاتِنَاهُمْ﴾ سے مراد آخرت ہے، کیونکہ وہ ان کے آگے ہے اور وہ اس کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں اور ﴿وَمَا خَلَقْنَاهُمْ﴾ سے مقصود دنیا ہے کیونکہ وہ اسے اپنے پیچھے چھوڑ رہے ہیں۔ (تفسیر کبیر: 11,10/7) ﴿6﴾ ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ﴾ جو خیر و شر وہ کر چکے ہیں اور ﴿وَمَا خَلَقْنَاهُمْ﴾ جو وہ اس کے بعد کریں گے۔ (تفسیر کبیر: 11/7) ﴿7﴾ ﴿مَابِئِن آيَاتِنَاهُمْ﴾ جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں اور ﴿وَمَا خَلَقْنَاهُمْ﴾ جو کچھ وہ سمجھتے ہیں۔ (تفسیر بیضاوی: 134/1) ﴿8﴾ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا اپنے علم سے احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ تمام مخلوقات کے سب احوال سے خوب آگاہ ہیں۔ کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

سوال 16: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ وِلْيَةِ الْإِلَهَاءِ﴾ ”اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے“ اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی چیز انسان کو تب ملتی ہے جب وہ خود دینا چاہے اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے“ اللہ تعالیٰ کی معلومات کے بارے میں کوئی علم نہیں

رکتا۔ اس کے بارے میں انسان اتنا ہی جانتے ہیں جتنا اس نے خود علم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی چیز انسان کو تب ملتی ہے جب وہ خود بنا چاہے۔ ﴿2﴾ انسان کا علم محدود ہے اس لیے کوئی بھی اپنے علم سے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا احاطہ نہیں کر سکتا ماسوائے اس کے جو اس نے خود علم دیا ہے۔ ﴿3﴾ کائنات کی ہر چیز کا کامل اور محیط علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اس کے سوا کسی اور کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ جس قدر مناسب سمجھتا ہے اتنا علم انسان کو عطا کر دیتا ہے۔ ﴿4﴾ علامہ ابو حیان اندلسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”احاطہ کا تقاضا تمام اطراف سے چیز کو گھیرنا اور اس پر مشتمل ہونا ہے۔“ (البحر المحیط: 289/1) ﴿5﴾ علامہ ابن ابی العزخنی اس کی شرح میں تحریر کرتے ہیں: ”اور اس کا معنی یہ ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا اور ہر چیز کے اوپر ہے۔“ (العقیدۃ الطحاویہ: 259) ﴿6﴾ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”اور وہ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا اور اس کے اوپر ہے۔“ (العقیدۃ الطحاویہ: 257) ﴿7﴾ علامہ راغب اصفہانی نے تحریر کیا ہے: ”کسی چیز کے علم کے اعتبار سے احاطہ یہ ہے کہ اس کے وجود، جنس، کیفیت، غرض و غایت، اس کی ایجاد کس چیز کے ساتھ اور کس سے ہوئی اور ان سب باتوں کے بارے میں علم ہو۔“ (المفردات: 136، 137) صرف اللہ تعالیٰ کا علم کامل ہے، بے قید ہے۔ ﴿8﴾ اس طرح یہ دو باتیں کہ ”جو ان کے آگے ہے اور وہ جانتا ہے جو ان کے پیچھے ہے“ اور ”وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے“ ﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ کے لیے دلیل ہیں کہ الوہیت و عبودیت کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جسے کائنات کی ہر چیز کے بارے میں کامل اور محیط علم ہو اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں۔ اس لیے اس کے علاوہ کوئی بھی الوہیت و عبودیت کا حق دار نہیں۔

سوال 17: انسان سے کون سے علوم پوشیدہ رکھے گئے؟

جواب: ﴿1﴾ وہ علوم جن کا ہدایت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ ﴿2﴾ وہ علوم جن کا احاطہ انسانی عقل نہیں کر سکتی۔

سوال 18: ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾ ”اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو سموائے ہوئے ہے“ ”اس کی کرسی“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿كُرْسِيُّهُ﴾ ”اس کی کرسی“ اس بارے میں علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ”حقیقی معنی چھوڑ کر کسی دوسرے معنی کی طرف جانے کا کوئی معقول سبب نہیں۔“ (فتح القدر: 412/1) ﴿2﴾ وسع سے مراد جیسے کہ امام بغوی نے بیان کیا ہے ”بھر دیا“ اور ”احاطہ کیا“۔ (تفسیر بغوی: 239/1) ﴿3﴾ علامہ شوکانی نے تحریر کیا ہے: ”یعنی سارے آسمان اور زمین اس آیت میں ہیں اور بلاشبہ وہ ان کا احاطہ کرنے میں کوتاہ نہیں، کیونکہ وہ بہت فراخ اور وسیع ہے۔“ (فتح القدر: 412/1) ﴿4﴾ حافظ ابو بکر بن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے حوالے سے روایت نقل کی ہے کیونکہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے الکرسی کے بارے میں پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں الکرسی کے مقابلے میں ایسے ہی ہیں جیسے کہ چٹیل زمین پر پھینکا ہوا چھلہ ہو اور بلاشبہ عرش کی الکرسی پر برتری چٹیل زمین کی اس چھلے پر فوقیت کی مانند ہے۔“ (تفسیر ابن کثیر: 332/1) ﴿5﴾ شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: یہ

حدیث ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾ کی تفسیر کی غرض سے بیان کی گئی ہے اور یہ واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ الکرسی مخلوقات میں سے عرش کے بعد سب سے بڑی مستقل موجود چیز ہے اور وہ کوئی معنوی چیز نہیں۔ اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو اس کی تاویل بادشاہت اور وسیع حکمرانی سے کرتے ہیں جیسا کہ بعض تفسیروں میں ذکر کیا گیا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کردہ تفسیر کہ اس سے مراد ”علم“ ہے، اس کی سند درست نہیں۔ (سلسلہ احادیث صحیحہ: 109) ﴿6﴾ شیخ ابن عاشور رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾ ”اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو سموائے ہوئے ہے“ ﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ کی تائید کرتا ہے کہ عبودیت والوہیت کے حق دار صرف اللہ جل جلالہ ہیں۔ (تفسیر التحریر والتبیین: 3-23)

سوال 19: ﴿وَلَا يُؤْذُوا كَفْظُهُمَا﴾ ”اور ان دونوں کی حفاظت اسے نہیں تھکاتی“ وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور ان دونوں کی حفاظت اسے نہیں تھکاتی“ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی حفاظت کے بارے میں ذکر فرمایا ہے کہ اس پر گراں نہیں لیکن ان دونوں میں جو کچھ موجود ہے ان کی حفاظت کے متعلق کچھ نہیں فرمایا۔ قاضی ابوسعود رحمہ اللہ اس بارے میں لکھتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ نے ان دونوں میں موجود چیزوں کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ ان دونوں کی حفاظت کے ضمن میں ان میں موجود چیزوں کی بھی حفاظت ہے۔“ (تفسیر ابی سعید: 248/1) اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی حفاظت کے بارے میں ذکر فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا ۗ وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ﴾ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا۔ اور وہ اس کی نشانیوں سے منہ موڑنے والے ہیں۔ (الانبیاء: 32) ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کو زمین و آسمان کی حفاظت کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ يَتَسَبَّحُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَدْرُوْا﴾ یقیناً اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ دونوں ٹل نہ جائیں۔ (فاطر: 41) ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کو حفاظت سے تھکاؤ نہیں ہوتی۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے۔ اسے رات دن کی بخشش بھی کم نہیں کرتی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب سے اس نے آسمان وزمین پیدا کیے ہیں اس نے کتنا خرچ کیا ہے۔ اس نے بھی اس میں کوئی کمی پیدا نہیں کی جو اس کے ہاتھ میں ہے اور فرمایا کہ اس کا عرش پانی پر ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں ترازو ہے۔ جسے وہ جھکاتا اور اٹھاتا رہتا ہے۔ (صحیح بخاری: 7411) ﴿4﴾ اپنی کتاب عزیز کی حفاظت کے بارے میں فرمایا: ﴿إِنَّكَ خَيْرٌ نَزَّلْنَا الَّذِي كَرِهْتَ وَإِنَّكَ لَكُلِّفْتَ لِحَفْظُونَ﴾ بے شک ہم ہی نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور بلاشبہ ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (الحجر: 9)

سوال 20: ﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ﴾ ”اور وہی سب سے بلند، سب سے بڑا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ ﴿الْعَلِيُّ﴾، اپنی ذات کے اعتبار سے بہت بلند ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ اس لئے بھی ﴿الْعَلِيُّ﴾ ہے کہ وہ عرش عظیم پر مستوی ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ اس لئے بھی ﴿الْعَلِيُّ﴾ ہے کہ تمام مخلوقات اس کی زیر نگین ہیں۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ اس لئے بھی بلند شان والا ہے کہ اس کی صفات کامل ہیں۔ (تفسیر سعدی: 306/1) ﴿5﴾ امام بغوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس سے مراد ”اپنی مخلوق سے

بہت بلند اور سب چیزوں اور شرکاء سے بہت اونچا اور یہ بھی کہا گیا ہے بادشاہت اور اقتدار کے ساتھ بہت بلند و بالا۔“ (تفسیر بغوی: 1/240) ﴿6﴾ امام ابن قیمؒ اپنے القصیدہ النونیہ میں لکھتے ہیں: ”وہ ہی ﴿الْعَلِيُّ﴾ ہے، پس بلندی کی تمام اقسام اسی کے لیے بلا انکار ثابت ہیں۔“ (القصیدہ النونیہ: 3233) ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: ”اسی کے لیے ذات، غلبہ اور اونچے مقام و مرتبہ کے تمام اعتبارات سے بلندی ہے۔“ (القصیدہ النونیہ: 3233) ﴿7﴾ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: ”اور اس کے نام ﴿الْعَلِيُّ﴾ کی تفسیر، ان دو معنوں سے کی گئی ہے: وہ مقام و مرتبہ میں سب سے برتر ہے اسی لیے کمال کی صفات کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔ وہ ان سے فہر و غلبہ کے اعتبار سے بلند ہے اس بنا پر وہ ان سب پر کمال قدرت رکھنے والا اور وہ سب اس کے زیر اقتدار ہیں اور اس کے ضمن میں یہ بھی ہے کہ وہ ان کا خالق اور رب ہے۔ ان دونوں معنوں میں ضمنی طور پر یہ بھی ہے کہ وہ خود ہر چیز سے بلند و بالا ہے اور کوئی چیز اس سے اوپر نہیں۔“ (مجموع الفتاویٰ: 16/358) ﴿8﴾ شیخ صالح بن عبدالعزیز آل الشیخ نے تحریر کیا ہے: ”﴿الْعَلِيُّ﴾ پس وہ ذات کہ اسی کے لیے الْعَلِيُّ بلندی کی یہ ساری انواع و اوصاف ہیں۔ اس ہی کے لیے ذات کی بالادستی، غلبہ کی برتری اور شان و عظمت کی فوقیت ہے۔ ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ﴾ اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ (الانعام: 18) (عقیدۃ الواسطیہ: 1/251) ﴿9﴾ اللہ تعالیٰ العلیٰ ہے جو اپنے خالص اور برگزیدہ بندوں کے لیے تعریف کو دنیا میں قائم فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ العلیٰ ہے اپنی حکمت، کبریائی اور عظمت کے ساتھ۔ ﴿10﴾ شیخ ابوبکر جزائریؒ لکھتے ہیں: ”الْعَلِيُّ وہ ذات ہے کہ اس کے اوپر کوئی چیز نہیں اور وہ ﴿الْقَاهِرُ﴾ ہے کہ جس پر کوئی چیز غالب نہیں۔“ (ایر التفاسیر: 1/203) ﴿11﴾ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے اپنے بارے میں بالا ہونے، عرش پر بلند ہونے اور اوپر ہونے کا وصف بیان کیا ہے۔ انہوں نے یہ بات اپنی کتاب کی بہت زیادہ آیات میں بیان فرمائی ہے یہاں تک کہ امام شافعی کے بعض اکابر شاگردوں نے کہا: ”قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے مخلوق سے بالا اور اپنے بندوں سے اوپر ہونے کے ایک ہزار یا اس سے زیادہ دلائل ہیں۔“ (مجموع الفتاویٰ: 5/121) ﴿12﴾ اللہ تعالیٰ العظیم ”سب سے بڑا ہے“ ہے۔ سیدنا ابن عباسؓ نے بیان کیا: ”الْعَظِيمُ وہ ذات جو اپنی عظمت و شان میں درجہ کمال پر ہے۔“ (تفسیر طبری: 5/405) ﴿13﴾ حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے: ”وہ بہت بڑے سب سے عالی شان کی مانند ہے۔“ (ابن کثیر: 1/333) ﴿14﴾ امام طبریؒ لکھتے ہیں کہ ”وہ عظمت والا ہے۔ ہر چیز ان سے فروتر ہے اور کوئی چیز بھی اس سے زیادہ عظمت والی نہیں۔“ (تفسیر طبری: 5/405) ﴿15﴾ امام بغویؒ نے تحریر کیا ہے: ”بہت بڑی وہ ذات کہ کوئی چیز اس سے زیادہ عظمت والی نہیں۔“ (تفسیر بغوی: 1/134) ﴿16﴾ شیخ ابوبکر الجزائریؒ لکھتے ہیں کہ ”وہ ذات کہ اس کی عظمت کے سامنے ہر چیز چھوٹی اور معمولی ہے۔“ (ایر التفاسیر: 1/203) ﴿17﴾ اللہ تعالیٰ العظیم ہے۔ عرش عظیم پر مستوی ہے جس کی عظمت کے سامنے بڑے سے بڑے جبار، متکبر اور زبردست بادشاہوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس آیت میں توحید الوہیت بھی ہے اور توحید اسماء و صفات بھی۔ اس میں بادشاہت کا محیط ہونا بھی مذکور ہے اور علم کا بھی، اس کی سلطنت کی وسعت بھی ہے۔ اس کا جلال، مجد اور اس کی عظمت و کبریائی

کا بھی بیان ہے۔ لہذا یہ آیت اکیلی ہی اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء و صفات اور تمام اسماء حسنیٰ کے معنی کی جامع ہے۔ (تفسیر سعدی: 1/306)

سوال 21: ”اور وہی سب سے بلند، سب سے بڑا ہے“ یہ عقیدہ مومن پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور وہی سب سے بلند، سب سے بڑا ہے۔“ اس عقیدے کی وجہ سے مومن سرکشی چھوڑ دیتا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کے ﴿الْعَظِيمُ﴾ ”سب سے بڑا“ ہونے پر یقین ہونے کی وجہ سے مومن کی طبیعت میں جھکاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کے ”سب سے بلند، سب سے بڑا“ ہونے پر یقین کی وجہ سے مومن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور خوف بیٹھ جاتا ہے۔ ﴿4﴾ اس عقیدے کی وجہ سے مومن کا طرز عمل مودبانہ ہو جاتا ہے۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ کے ”سب سے بلند، سب سے بڑا“ ہونے پر یقین کی وجہ سے مومن اللہ تعالیٰ کے بندوں کے مقابلے میں بھی غرور و تکبر کا رویہ چھوڑ دیتا ہے۔ ﴿6﴾ اللہ تعالیٰ کے ”سب سے بلند، سب سے بڑا“ ہونے پر یقین کی وجہ سے اس کی روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے پھر وہ ہر ایسے کام سے بچتا ہے جس سے اس نے روکا ہو۔ ﴿7﴾ اللہ تعالیٰ کے الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ہونے کا عقیدہ مومن کو ہر برائی اور ظلم سے روکتا ہے۔

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۚ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ ۚ لَا

انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ (256)

”دین میں کوئی زبردستی نہیں، یقیناً ہدایت گمراہی سے صاف واضح ہو چکی، چنانچہ جو باطل معبود کا انکار کرے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑا تھام لیا جس نے کبھی ٹوٹنا ہی نہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔“ (256)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ انصار کے کچھ لوگ یہودی یا عیسائی ہو گئے بعد میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو انہوں نے اپنی اولاد کو بھی جو یہودی یا عیسائی ہو چکے تھے زبردستی مسلمان بنانا چاہا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿2﴾ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ مدینہ کی مشرکہ عورتیں جب انہیں اولاد نہ ہوتی تھی تو نذر مانتی تھیں کہ اگر ہمارے ہاں اولاد ہوئی تو ہم اسے یہود بنا دیں گے یہودیوں کے سپرد کر دیں گے، اسی طرح ان کے بہت سے بچے یہودیوں کے پاس تھے۔ جب یہ لوگ مسلمان ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے دین کے انصار بنے، یہودیوں سے جنگ ہوئی اور ان کی اندرونی سازشوں اور فریب کاریوں سے نجات پانے کے لئے سرور رسل علیہ السلام نے یہ حکم جاری فرمایا کہ بنی نضیر کے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا جائے، اس وقت انصار یوں نے اپنے بچے جو ان کے پاس تھے ان سے طلب کئے تاکہ انہیں اپنے اثر سے مسلمان بنا لیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جبر اور زبردستی نہ کرو۔ (تفسیر ابن کثیر: 1/354)

سوال 2: ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ ”دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے“ اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے“ دین کو قبول کرنے میں زبردستی نہیں لیکن دین قبول کرنے کے بعد اطاعت کرنا لازم ہے۔ ﴿2﴾ زبردستی اس کام میں کی جاتی ہے جس کے حقائق واضح نہ ہوں یا جو کام انتہائی ناپسندیدہ ہو۔ اس صراطِ مستقیم کا توہر گوشہ واضح ہے۔ اس کا چہرہ روشن ہے۔ کوئی بھی سمجھ دار آدمی معمولی سا غور و فکر کرے تو اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ لیکن جس کی نیت درست نہ ہو، غلط ارادے رکھتا ہو، ایسا بدن آدمی حق دیکھ کر بھی باطل کو اختیار کر لیتا ہے۔ اچھی چیز کو دیکھ کر پھر گندی چیز کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں کہ اسے دین قبول کرنے پر مجبور کرے کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں اور زبردستی قبول کرایا گیا ایمان معتبر نہیں۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ جو کافر مسلمانوں سے لڑتے ہیں ان کے خلاف جہاد نہ کیا جائے۔ (تفسیر سعدی: 1/306)

سوال 3: اسلام نے یہ اصول دیا ہے کہ دین کے معاملے میں زبردستی مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اس اصول کا انسان کو کیا فائدہ ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے اس اصول سے ”دین کے معاملے میں زبردستی مجبور نہیں کیا جائے گا“ انسان کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ اس سے اس کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ارادے، اس کی فکر اور شعور کا احترام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اصول سے انسان کو عزت دی ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے اس اصول سے ہدایت اور گمراہی اختیار کرنے میں انسان کو آزادی دی ہے۔ ﴿4﴾ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا غلام اسبق نصرانی تھا، آپ اس پر اسلام پیش کرتے، وہ انکار کرتا آپ کہہ دیتے کہ خیر تیری مرضی اسلام جبر سے روکتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: 1/354)

سوال 4: قرآن حکیم بندے اور رب کے تعلق کے بارے میں کیا وضاحت کرتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ قرآن بندے اور رب کے تعلق کے بارے میں واضح کرتا ہے کہ رب بندے پر رحمت کرتا ہے، وہ بندے کے قریب ہے اس کی سنتا ہے، اس کے حالات جانتا ہے۔ ﴿2﴾ رب بندے کی مدد کرتا ہے، وہ اس کا ایسا سہارا بنتا ہے جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ ﴿3﴾ رب بندے سے محبت کرتا ہے اور بندہ رب سے محبت کرتا ہے۔ بندہ رب کا سہارا لیتا ہے اور رب بندے کو تھام لیتا ہے۔ ﴿4﴾ مومن رحمت رب کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی بسر کرتا ہے تو اپنے آپ کو بے آسرا نہیں سمجھتا اور محفوظ پناہ گاہ میں اطمینان محسوس کرتا ہے۔

سوال 5: ﴿قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ ”یقیناً ہدایت گمراہی سے صاف واضح ہو چکی“ یہ کہہ کر کس چیز کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”یقیناً ہدایت گمراہی سے صاف واضح ہو چکی“ یہ کہہ کر یہ توجہ دلائی جا رہی ہے کہ ایمان کا راستہ، ہدایت کا راستہ ہے لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ اسے اختیار کرے اور اس پر چلے۔ ﴿2﴾ اس سے یہ توجہ بھی دلائی جا رہی ہے کہ کفر گمراہی ہے لہذا انسان کو چاہئے کہ اس سے نفرت کرے اور اس کی طرف نہ جائے۔

سوال 6: ہدایت پر کون ہے؟

جواب: ہدایت پر وہ ہے جو طاغوت کا انکار کرے اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔

سوال 7: ﴿فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ﴾ ”چنانچہ جو باطل معبود کا انکار کرے“ طاغوت کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ہر عقیدہ جس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے نہ ہو طاغوت ہے۔ ﴿2﴾ ہر وہ قوت جو اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرنے سے روکے طاغوت ہے۔ ﴿3﴾ عمر بن خطاب نے کہا: طاغوت شیطان ہے۔ ﴿4﴾ محمد نے کہا: طاغوت ساحر ہے۔ (تفسیر جامع البیان: 20/3) ﴿5﴾ ﴿فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ﴾ جو شخص بھی غیر اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر، شیطان کی فرماں برداری کو ترک کرے وہ اللہ تعالیٰ پر صحیح ایمان لا کر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت پر قائم ہو سکتا ہے۔ (تفسیر سعدی: 367/1)

سوال 8: ﴿وَيُؤْمِنُ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لِأَنَّ أَقْصَامَهَا﴾ ”اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑا تھام لیا جس نے کبھی ٹوٹنا ہی نہیں“ مضبوط کڑا، مضبوط سہارا کون سا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَيُؤْمِنُ بِاللَّهِ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے“ جو طاغوت کا انکار کرے اللہ تعالیٰ پر صحیح ایمان لے آئے تو وہ صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت پر قائم ہو جائے گا۔ ﴿2﴾ ﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ﴾ ”تو اس نے مضبوط کڑا تھام لیا“ یعنی ایسا پختہ دین اختیار کیا جس کی بنیادیں بھی مضبوط ہیں اور عمارت بھی۔ وہ پورے اعتماد سے اس پر قائم رہتا ہے۔ (تفسیر سعدی: 307/1) ﴿3﴾ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول: ﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ﴾ ”تو اس نے مضبوط کڑا تھام لیا“ کے بارے میں کہا: لا الہ الا اللہ ہے۔ (جامع البیان: 22/3) ﴿4﴾ سدی نے کہا: عروۃ الوثقیٰ اسلام ہے۔ ﴿5﴾ سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کے عہد میں ایک خواب دیکھا جو آپ ﷺ سے بیان کیا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا میں ایک باغ میں ہوں اور اس کی کشادگی اور سرسبزی کی تعریف کی، اور اس کے درمیان میں ایک لوہے کا ستون ہے جس کا پایہ زمین میں ہے اور سر آسمان میں، اس کے اوپر کی طرف ایک کڑا لگا ہے۔ تو مجھے کہا گیا کہ اس کے اوپر چڑھ۔ میں نے کہا کہ میں اتنی طاقت نہیں رکھتا (نہیں چڑھ سکتا) پھر ایک خدمت گار آیا اور اس نے پیچھے کی طرف سے میرے کپڑے اٹھادیے، پس میں چڑھنے لگا یہاں تک کہ چوٹی پر پہنچ گیا اور میں نے وہ کڑا پکڑ لیا تو مجھ سے کہا گیا کہ مضبوطی سے تھامے رکھ۔ جب تک میں نیند سے اٹھایا کڑا تھامے رہا۔ میں نے یہ خواب نبی ﷺ سے بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”باغ سے دین اسلام مراد ہے اور ستون سے مراد اسلام کا ستون (کلمہ شہادت یا پانچوں ارکان) اور کڑا عروۃ الوثقیٰ ہے اور تو اپنی موت تک اسلام پر قائم رہے گا۔“ (صحیح بخاری: 7014)

سوال 9: ﴿وَاللَّهُ سَبِيحٌ عَلَيْهِمُ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ طاغوت کا انکار کرنے والے کے انکار اور ایمان لانے والے کے اقرار کو سننے والا سمیع ہے۔ ﴿2﴾ انسانوں کے کفر اور اپنی ذات پر ایمان کی حقیقت کا علم رکھنے والا علیم ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور گمراہی کے معاملے کو واضح کیا۔ اسی نے ہدایت اور

گمراہی کی حقیقت سے آگاہ کیا، یقیناً وہ انسانوں کے معاملات کا جاننے والا علیم ہے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے اعمال کو جانتا ہے وہ اپنے علم کے مطابق بدلہ دے گا۔

﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (257)﴾

﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾

”اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے دوست باطل معبود ہیں، وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں، یہی لوگ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والے

ہیں۔“ (257)

سوال 1: ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ ”اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ یہ آیت ایمان والوں کی اللہ تعالیٰ سے دوستی پر مشتمل ہے۔ وہ رب سے محبت رکھتے ہیں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کفر، جہالت اور نافرمانیوں کے اندھیرے سے نکال کر ایمان اور علم کی روشنی میں پہنچاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ قبر کے اور حشر کے اندھیروں سے محفوظ رہ کر جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔ ﴿2﴾ اللہ رب العزت نے فرمایا: ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ لَمْ كُفُّوا﴾ یقیناً تمہارے دوست اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور ایمان والے ہی ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ رکوع کرنے والے ہیں۔ (المائدہ: 55) ﴿3﴾ ﴿إِنَّ وَلِيََّ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ ۗ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ﴾ بلاشبہ میرا مددگار وہ اللہ تعالیٰ ہے، جس نے یہ کتاب اتاری ہے۔ اور وہی نیک لوگوں کا مددگار بنتا ہے۔ (الاعراف: 196) ﴿4﴾ سیدنا براء رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ احد کے موقع پر ابوسفیان نے کہا: ”ہبل بلند رہے۔“ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”اس کا جواب دو۔“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ”کیا جواب دیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کہو، اللہ تعالیٰ سب سے بلند اور بزرگ و برتر ہے۔“ ابوسفیان نے کہا: ”ہمارے پاس عزمی (بت) ہے اور تمہارے پاس کوئی عزمی نہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کا جواب دو۔“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ”کیا جواب دیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کہو، اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و مددگار ہے اور تمہارا کوئی حامی نہیں۔“ (صحیح بخاری: 4043) ﴿5﴾ ﴿يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ﴾ ”وہ ان کو اندھیروں سے نکالتا ہے“ اللہ تعالیٰ جہالت کی تاریکیوں سے، کفر سے نکالتے ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے، تیرے رب کو ان لوگوں پر تعجب آتا ہے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت کی طرف گھسیٹے جاتے ہیں، یعنی وہ کفار جو میدان جنگ سے قیدی ہو کر طوق و سلاسل پہنا کر یہاں لائے جاتے ہیں پھر وہ اسلام قبول

کر لیتے ہیں اور ان کا ظاہر باطن اچھا ہو جاتا ہے اور وہ جنت کے لائق بن جاتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر: 355/1) ﴿6﴾ ﴿إِنِ الْنُّورِ﴾ ”روشنی کی طرف“ (ا) ایمان (ب) اللہ تعالیٰ کے دین کا علم۔ دونوں ہی وہ نور ہیں جن سے انسان دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلتے ہیں۔ ﴿7﴾ ظلمات ”اندھیروں“ سے مراد گمراہی کی حالت ہے اور ”نور“ سے مراد ہدایت ہے۔ اس آیت سے یہ سمجھ آتی ہے کہ گمراہی کے راستے بہت سے ہیں جب کہ حق کا راستہ ایک ہے کیونکہ ایمان ایک ہے۔ (البحر المحیط: 2/618) ﴿8﴾ اسی جانب اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے: ﴿وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۗ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ اور بلاشبہ یہی میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے چنانچہ تم اس کی پیروی کرو۔ اور دیگر راستوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ یہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں تاکید کر دیا ہے تاکہ تم بچ جاؤ۔ (الانعام: 153)

سوال 2: اللہ تعالیٰ کو ولی بنانے والوں کے لئے کیا لازم ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کو ولی بنانے والوں کے لئے لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اخلاص پیدا کریں۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ادھر ادھر نہ بھٹکیں۔ ﴿3﴾ خود کو اللہ تعالیٰ کی غلامی میں دے دیں۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ پر ہی توکل کریں۔

سوال 3: ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا أُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے دوست باطل معبود ہیں، وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے دوست باطل معبود ہیں“ کفر کرنے والوں کے دوست شیاطین ہیں۔ (تفسیر بیضاوی: 559/1-558) ﴿2﴾ ﴿يُخْرِجُوهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ﴾ ”وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں“ مقاتل بن حیان نے اس آیت کے بارے میں کہا: اس سے مراد اہل کتاب ہیں جو محمد ﷺ کو پہچان گئے کہ وہ رسول اللہ ﷺ ہیں کیونکہ وہ اپنی کتابوں میں ان کے بارے میں لکھا ہوا پاتے تھے۔ وہ نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے ان پر ایمان رکھتے تھے پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا تو انہوں نے کفر کیا، یہ ان کا نور سے نکلنا تھا یعنی محمد ﷺ پر ایمان لانے سے جن پر وہ پہلے ایمان رکھتے تھے، اور ظلمات سے مراد ان کا کفر ہے۔ (ابن ابی حاتم: 2/496)

سوال 4: ﴿أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ ”یہی لوگ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”یہی لوگ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں“ اہل ظلمات جن کے دلوں میں حق کا نور باقی نہ رہا ہوان کے لیے وہ گھر ہوگا جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ (تفسیر مراغی: 1/389)

رکوع نمبر 3

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ سَاجَدُوا لِإِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ أَنشأَ اللَّهُ لَكَ مُدًا قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي

وَأُمِيتُ قَالُوا إِنَّهُمْ قَالُوا اللَّهُ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

الظَّالِمِينَ (258)

”کیا آپ نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حکومت دی تھی“ جب ابراہیم نے کہا میرا رب تو وہ ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے۔“ اس نے کہا: ”میں بھی زندگی دیتا ہوں اور موت دیتا ہوں“ ابراہیم نے کہا: ”اللہ تعالیٰ تو بلاشبہ سورج کو مشرق سے لاتا ہے پھر تم اس کو مغرب سے نکال لاؤ“ تو وہ حیران رہ گیا جس نے کفر کیا اور اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“ (258)

سوال 1: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهٖ﴾ ”کیا آپ نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا“ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے کس نے جھگڑا کیا تھا؟
جواب: جھگڑا کرنے والے بادشاہ کا نام نمرود بن کنعان بن سام بن نوح تھا۔ (ابن کثیر)

سوال 2: ﴿أَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ﴾ ”یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حکومت دی تھی“ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے کس بنیاد پر جھگڑا کیا گیا تھا؟
جواب: نمرود نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے رب کے بارے میں جھگڑا کیا تھا اور اس بناء پر کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حکومت دے رکھی تھی۔ حکومت پا کر اس میں رعونت، سرکشی آگئی تھی جس کی بنا پر اس نے جھگڑا کیا۔

سوال 3: نمرود بادشاہ کیسے بنا؟

جواب: قدیم بادشاہ لوگوں کو یہ یقین دلا کر ان پر حکومت کیا کرتے تھے کہ وہ خدا کا انسانی پیکر ہیں۔ نمرود کی قوم سورج کو دیوتاؤں کا سردار مانتی تھی اور اس کی پوجا کرتی تھی۔ نمرود نے کہا کہ وہ سورج دیوتا کا اوتار ہے اس لیے وہ لوگوں پر حکومت کرنے کا خدائی حق رکھتا ہے۔

سوال 4: ﴿أَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ﴾ ”یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حکومت دی تھی“ کہہ کر کس طرف توجہ دلائی جا رہی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حکومت دی تھی“ یہ کہہ کر توجہ دلائی جا رہی ہے کہ بادشاہ اللہ تعالیٰ کے غلام ہوتے ہیں۔ بادشاہت اس لیے نہیں ملتی کہ لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا جائے اور ان سے اپنے بنائے ہوئے قوانین کی پابندی کروائی جائے۔ ﴿2﴾ بادشاہت کی وجہ سے شکرگزاری کا رویہ اختیار کرنا چاہیے تھا لیکن اس نے کفر اور طغیانی کا رویہ اختیار کیا۔ ایک مدت تک بادشاہت کرنے کی وجہ سے کبر و غرور میں مبتلا ہو گیا تھا اور شیطان نے اس کے دماغ میں یہ خیال بٹھادیا تھا کہ وہی لوگوں کا رب ہے۔ اس نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے بارے میں بحث کی اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ بھی وہی کام کر سکتا ہے۔ ﴿3﴾ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے توحید کی دعوت دی تھی کہ ہم سب کا معبود ایک ہے ہمارا خالق اور مالک صرف ایک اللہ تعالیٰ ہے۔ کوئی نہیں جو خدائی میں اس کا شریک ہو، وہ بے مثل ہے۔

سوال 5: سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے کی دلیل دی کہ ﴿سَرَّيْنَا لِلْذِي يُعْبَىٰ وَيُؤْتَىٰ﴾ ”میرا رب تو وہ ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ﴾ جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کے بارے میں واضح فرمایا۔ ﴿2﴾ ﴿سَرَّيْنَا لِلْذِي يُعْبَىٰ وَيُؤْتَىٰ﴾ ”میرا رب تو وہ ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے“ میرا رب تو وہ ہے جسے ہر کام کا اختیار حاصل ہے اسے زندگی اور موت پر اختیار ہے۔ زندگی اور موت کی مثال اس لیے دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا سب سے عظیم کام ہے۔ زندگی دنیا کی ابتداء اور موت آخرت کی۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ زندگی عطا کرتا ہے، زندگی کو پیدا کیا، روح کو پیدا کیا، جسموں میں روح پھونک کر زندگی عطا کی۔ وہی اللہ تعالیٰ دلوں کو زندگی عطا کرتا ہے۔ وہی اللہ تعالیٰ مردہ دلوں کو ایمان عطا کر کے زندگی دیتا ہے۔ وہی اللہ تعالیٰ عدم سے وجود میں لا کر ساری قوتیں اور صلاحیتیں عطا کرتا ہے۔ ﴿4﴾ وہی موت سے ہم کنار کرتا ہے کیونکہ وہ موت کا مالک ہے، وہی موت کا خالق ہے، اسی کے فیصلے موت اور حیات کے لیے نافرمان ہوتے ہیں۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ کے زندگی دینے سے مراد عدم سے وجود میں لانا ہے یعنی پہلے کچھ نہیں ہوتا پھر وہ حیات عطا کرتا ہے۔ اس کے موت دینے سے مراد یہ ہے کہ سب کچھ موجود ہوتا ہے اور وہ مٹا ڈالتا ہے ختم کر دیتا ہے۔ یعنی موجودات کا نہ ہونا۔ پھر ہونا، پھر مٹ جانا، پیدا کرنے والے کی کھلی دلیل ہے کہ وہ ہے، با اختیار ہے، جو چاہے کر سکتا ہے۔ تمام موجودات پر اسی کا قانون چلتا ہے۔ ﴿6﴾ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ توحید کی دعوت دی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہی واحد معبود ہے تو اس کے لیے ایجاد کائنات کی عقلی دلیل دی کہ چیزوں کی ایجاد اور فنا کے لیے کسی ذات کے وجود کی ضرورت ہے یعنی کوئی ایسا ہو جو موت اور حیات پر قادر ہو۔ یہی اس کئی اختیار رکھنے والے، کئی تصرف رکھنے والے کے لیے دلیل ہے کہ کائنات میں تبدیلیاں یونہی نہیں آجاتیں وہی اللہ تعالیٰ جو زندگی اور موت پر قادر ہے تمہارا معبود ہے جس کی عبادت کی تمہیں دعوت دی جا رہی ہے۔

سوال 6: ﴿قَالَ أَنَا أَحْيِي وَأُمِيتُ﴾ ”اس نے کہا: ”میں بھی زندگی دیتا ہوں اور موت دیتا ہوں“ اس سے نمرود کے کس شبہ کا پتہ چلتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”اس نے کہا: ”میں بھی زندگی دیتا ہوں اور موت دیتا ہوں“ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نمرود سمجھتا تھا کہ وہ اپنی قوم کا خود مختار حاکم ہے اس کے فیصلے قوم پر نافذ ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں سزائے موت بھی دے سکتا ہوں اور معاف بھی کر سکتا ہوں تو گویا میں رب ہوں۔ ﴿2﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ اس نے اسی مجلس میں دو قیدی منگائے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا۔ وہ موت اور زندگی کے راز کے بارے میں شبہ میں تھا۔ (تیسیر الرحمن: 180/1)

سوال 7: سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے توحید کے لیے دوسری دلیل دی کہ ﴿فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالْحَمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾ ”اللہ تعالیٰ تو بلاشبہ سورج کو مشرق سے لاتا ہے پھر تم اس کو مغرب سے نکال لاؤ“ اس دلیل کا انتخاب کس وجہ سے کیا؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دلیل اس لیے دی کہ جو موت اور حیات پر قادر ہو وہ ہر تصرف پر بھی قدرت رکھتا ہے وہی ذروں کو پیدا کرتا ہے اور اپنے ارادے سے ان کی حرکات کو قائم کرتا ہے اس لیے انہوں نے نمرود کو دعوت دی کہ سارے ستاروں کو چھوڑ کر ایک سورج کی حرکت پر اپنے تصرف کو ثابت کر دو۔ اگر تم سورج کی حرکت کنٹرول کر لو تو تم واقعی خدا ہو اور نہ جھوٹے ہو۔ اس دلیل پر نمرود حیران رہ گیا، اس کے پاس اس دلیل کا کوئی توڑ موجود نہیں تھا، اس طرح اس پر حجت قائم ہو گئی۔ ﴿2﴾ ہماری آنکھ روزانہ فطرت کا یہ نظارہ دیکھتی ہے کہ کبھی اس نظام میں کوئی خلل نہیں آیا۔ کائنات کی گواہی انسان کی فطرت کو اپیل کرتی ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فطرت انسانی کا ہاتھ پکڑ کر چیلنج کیا تو نمرود کے پاس کوئی جواب نہیں رہ گیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لیے نمرود حریف نہیں تھا اس لیے وہ چاہتے تھے ایسی دلیل دیں جو اس کے دل کو اپیل کرے اس وجہ سے انہوں نے دل لگتی دلیل کا انتخاب کیا۔

سوال 8: ﴿قُبُحَتِ الذِّمَىٰ كَفَرًا﴾ ”تو وہ حیران رہ گیا جس نے کفر کیا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا دیا ہوا چیلنج سامنے آیا تو حق واضح ہو گیا، اب انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ ایمان لے آتا لیکن اس نے انکار کیا اور کافرانہ رویہ اختیار کیا۔ کافر تکبر میں مبتلا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ حق کی طرف نہیں آتا، وہ حیران و پریشان رہ جاتا ہے، اسے نہیں سوچتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے، یہی کیفیت نمرود کی تھی۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس کی دلیل غلط ثابت ہو گئی اور اس کا پیش کردہ شبہ کا عدم ہو گیا۔ جو جھوٹا بھی حق اور عناد کے ذریعے سے حق کا مقابلہ کرنا چاہے وہ اسی طرح مغلوب اور شکست خوردہ ہو جایا کرتا ہے۔ (تفسیر سعدی: 308/1)

سوال 9: نمرود نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعوت سے اپنے اوپر زد پڑتے ہوئے کیوں محسوس کی؟

جواب: سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے رب کی طرف دعوت دی۔ اس عقیدے کے مطابق سورج ایک بے زور غلام ہے۔ اس طرح وہ اس عقیدے کی بنیاد کو ڈھارہے تھے جس کے اوپر نمرود نے اپنا تخت بچھا رکھا تھا۔ اسی وجہ سے وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا دشمن ہو گیا۔

سوال 10: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو سے انبیاء علیہم السلام کے طریقہ دعوت کے کون سے نکات پتہ چلتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ انبیاء علیہم السلام سوالوں کا تسلی بخش جواب دیتے ہیں، مناظرانہ انداز اختیار نہیں کرتے۔ ﴿2﴾ وہ فطرت انسانی کا ہاتھ پکڑ کر حکیمانہ دلائل دیتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کائنات کی گواہی پیش کرتے ہیں جو انسانی فطرت کو اپیل کرتی ہے۔ ﴿3﴾ انبیاء مخالفین کو اپنا حریف نہیں بلکہ مدعو سمجھتے ہیں۔

سوال 11: ﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا“ اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ ظالموں کے دلوں میں قطعی دلائل کے لیے گنجائش نہیں بناتا، اس لیے کہ انہیں نہ ہدایت کے راستے کی تلاش ہوتی ہے نہ اس پر چلنے کا شوق ہوتا ہے۔ ﴿2﴾ سیدھے راستے پر آنا انسان کا حق ہے اور ظالم اپنے آپ کو اس حق سے محروم کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی

اسے حق کا راستہ نہیں بجاتے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ ظالموں کو کفر اور گمراہی میں مبتلا رہنے دیتے ہیں کیونکہ وہ خود اپنے لیے اسی کو پسند کرتے ہیں۔ اگر کسی کا مقصد ہدایت حاصل کرنا ہو تو اللہ تعالیٰ ہدایت دے دیتا ہے اور ہدایت تک پہنچنے کے اسباب بھی مہیا کر دیتا ہے۔

سوال 12: سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی چیز کو انسان مختلف معنوں میں لے سکتا ہے، واضح کریں؟
جواب: ﴿1﴾ دنیا امتحان کی جگہ ہے اور امتحان میں دونوں پہلو سامنے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ ایک ہی چیز کو دو مختلف معنوں میں لیا جاسکے تاکہ امتحان کا مقصد پورا ہو سکے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کے پاس دولت ہے وہ اس کو ایسے رخ سے بھی دیکھ سکتا ہے کہ اسے یہ اپنی صلاحیت اور محنت کا نتیجہ نظر آئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھے۔ ایسے ہی کسی شخص کو اقتدار ملا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی کامیابی کو اپنی محنت کا نتیجہ سمجھے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھے۔ دونوں مثالوں میں پہلی صورت ظلم کی ہے اور دوسری شکر کی۔ ﴿2﴾ جو شخص ظالمانہ مزاج رکھتا ہے اس کو ہر واقعے سے تکبر اور خود پسندی کی غذا ملے گی جس کی وجہ سے وہ مزید گمراہ ہوگا۔ گمراہی کی غذا تکبر اور خود پسندی ہے۔ شکر گزار کے لیے ہر واقعے میں ہدایت کا سامان ہوتا ہے۔ اس کے لیے ہر واقعے میں اللہ تعالیٰ کی ذات کی پہچان ہوتی ہے۔ اس طرح اس کے ایمان میں ترقی ہوتی ہے اس کے لیے ہر واقعے میں عاجزی کا سامان ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و بڑائی کو پاتا ہے۔ دنیا اور اس کی ساری وسعتیں شکر گزار انسان کے لیے ایمانی رزق کا دسترخوان ہیں۔

سوال 13: اس آیت کے کیا اسباق ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ یہ آیت قطعی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق اور وہی مختار کل ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عبادت اور ہر حال میں توکل اس کا حق ہے۔ رب العزت نے فرمایا: ﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ سو آپ اسی کی عبادت کریں اور اسی پر بھروسہ کریں۔ (صود: 123) ﴿2﴾ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا: اس مناظرے میں ایک باریک نقطہ ہے کہ دنیا میں شرک کا دار و مدار ستاروں اور قبروں کی عبادت پر ہے۔ بعد میں انہی کے نام سے بت تراشے گئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے جو دلائل پیش کیے ہیں ان میں ان سب کی الوہیت کی اجمالا تردید موجود ہے کیونکہ اللہ وحدہ لا شریک ہی زندہ کرتا اور موت دیتا ہے وہ زندہ جسے مرجانا ہے وہ زندگی میں معبود بننے کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ مرنے کے بعد کیونکہ اس کا ایک رب ہے، پھر جو قادر ہے، زبردست ہے، وہ اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرتا ہے جو ایسا مجبور ہو وہ معبود کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کی صورت کا بت بنایا جائے اور اس کی پوجا کی جائے۔ اسی طرح ستاروں کا حال ہے ان میں سے بڑا نظر آنے والا سورج ہے۔ یہ بھی حکم کا پابند ہے، اپنے بارے میں آزادی سے فیصلہ نہیں کر سکتا بلکہ اس کا خالق و مالک ہی اسے مشرق سے لاتا ہے تو اس کے حکم اور مرضی کے مطابق اطاعت کرتا ہے یعنی یہ بھی مرہوب اور مسخر یعنی حکم کا پابند غلام ہے معبود نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے۔ (مفتاح دار السعدۃ: 211، 210/1) ﴿3﴾ حقیقت یہ ہے کہ ایمان انسان کے لیے اتنا اہم اور ضروری ہے جس قدر زندگی کے لیے کھانا، پینا اور ہوا ضروری ہے۔

﴿أَوْ كَأَنَّ مِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَلِي يَحْيٰ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَا مَاتَهُ اللّٰهُ مَاتَهُ عَامِرٌ مِّمَّ بَعَثَهُ ؕ قَالَ

كَمْ لَبِثْتَ ۚ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۗ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةً عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۗ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۗ وَانظُرْ إِلَىٰ الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا الْحَمَامَ ۗ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۗ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿259﴾

شئی قَدِيرٌ ﴿259﴾

”یا اس شخص کی مانند جس کا گزرا ایک بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں کے اوپر اوندھی پڑی تھی، اس نے کہا: ”اس کی موت کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو کیسے زندہ کرے گا؟“ تو اللہ تعالیٰ نے اس کو سو سال تک موت دے دی، پھر اس کو زندہ کیا اور پوچھا: ”تم کتنی دیر رہے؟“ اس نے کہا: ”میں ایک دن یا اس کا کچھ حصہ رہا،“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”بلکہ تم سو سال تک رہے، سو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو وہ بالکل بھی خراب نہیں ہوئیں اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو اور تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے نشانی بنائیں اور بڈیوں کی طرف دیکھو کیسے ہم ان کو اٹھا کر جوڑتے ہیں پھر ان کو گوشت پہناتے ہیں“ پھر جب اس پر خوب واضح ہو گیا تو اس نے کہا: ”میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر واقعاً پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے۔“ (259)

سوال 1: ﴿أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا﴾ ”یا اس شخص کی مانند جس کا گزرا ایک بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں کے اوپر اوندھی پڑی تھی“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿أَوْ كَالَّذِي﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہدایت خدا کی دین ہے جسے چاہے دے اور جس طریق سے چاہے دے۔ نمرود کو تم نے دیکھا۔ کیونکہ دلائل ہی سے گھبرا گیا۔ اب اس شخص کا قصہ سنو جس نے جب تک موت و زندگی کو تجربہ نہ دیکھ لیا یقین نہیں کیا۔ (سراج البیان: 101/1) ﴿2﴾ غالباً وہ سیدنا عزیر تھے جن کا دور پانچویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ ﴿3﴾ کسی نے کہا کہ وہ خضر علیہ السلام تھے۔ مجاہد کا قول ہے کہ وہ بنی اسرائیل کا ایک فرد تھا۔ اور یہی قول اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ واقعہ کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آدمی اللہ تعالیٰ کی اس قدرت میں شبہ کرتا تھا کہ وہ دوبارہ مردوں کو زندہ کرے گا اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ وہ نبی نہ تھا بلکہ ایک عام انسان تھا جسے بعث بعد الموت میں شبہ تھا۔ (تیسیر الرحمن: 150/1) ﴿4﴾ ﴿مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ﴾ ”اس کا گزرا ایک بستی پر ہوا“ وہ بستی بیت المقدس تھی جسے بخت نصر نے اجاڑا تھا۔ ﴿5﴾ ﴿وَهُنَّ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا﴾ ”جو اپنی چھتوں کے اوپر اوندھی پڑی تھی“ خاوی یعنی خالی جگہ جہاں کوئی رفیق نہ ہو ﴿عُرُوشِهَا﴾ سے مراد اس کی عمارتیں ہیں۔ (بخاری کتاب الشجر) ﴿6﴾ ایک بستی ہے جو گر کر اپنی بنیادوں پر پڑی ہے، ریزہ ریزہ ہو چکی ہے۔ موت، بوسیدگی اور ٹوٹ پھوٹ کا نقشہ پرتا شیر انداز میں نہایت رقت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہے۔ انسان کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟ اس تباہی میں سے تعمیر کیسے ابھرے گی؟

سوال 2: ﴿قَالَ أَلَيْسَ لِي بِحَيٍّ هَذِهِ إِذْ قَالَ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ ”اس نے کہا: ”اس کی موت کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو کیسے زندہ کرے گا؟“ اس شخص کے دل میں یہ خیال کیوں آیا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو کیسے زندہ کرے گا؟

جواب: اس شخص نے بیت المقدس کو ویران دیکھ کر یہ سوچا کہ یہ شہر کتنا پر رونق تھا اس کی رونق خاک میں مل گئی۔ اب اجڑنے کے بعد کیسے آباد ہوگا؟ نہ کوئی انسان ہے، نہ مکان۔ کھنڈرات کیسے آباد ہوں گے؟ بیت المقدس کی ویرانی کے بارے میں سوچتے سوچتے یہ خیال آیا کہ اب یہ آباد کیسے ہوگا؟ اسے یہ چیز ناممکن محسوس ہوئی، اس نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔

سوال 3: ﴿فَأَمَّا اللَّهُ مِائَةٌ عَامٍ ثُمَّ بَعَثْنَا قَالِ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ ”تو اللہ تعالیٰ نے اس کو سو سال تک موت دے دی، پھر اس کو زندہ کیا اور پوچھا: ”تم کتنی دیر رہے؟“ اس نے کہا، ”میں ایک دن یا اس کا کچھ حصہ رہا“ کی وضاحت کریں؟
جواب: ﴿1﴾ ﴿فَأَمَّا اللَّهُ مِائَةٌ عَامٍ﴾ ”تو اللہ تعالیٰ نے اس کو سو سال تک موت دے دی“ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو سو سال کے لیے سلا دیا جس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کو کیسے زندہ کرے گا۔ ﴿2﴾ ﴿ثُمَّ بَعَثْنَا قَالِ كَمْ لَبِثْتَ﴾ ”پھر اس کو زندہ کیا اور پوچھا: ”تم کتنی دیر رہے؟“ پھر اٹھایا اور پوچھا کتنا عرصہ اس حال میں رہے؟ ﴿3﴾ ﴿قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ ”اس نے کہا: ایک دن یا اس کا کچھ حصہ“ وہ دن نکلتے ہی فوت ہو گئے تھے اور غروب آفتاب کے وقت زندہ ہوئے اس لیے سمجھے کہ ایک دن گزرا اور ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کہا کہ دن کا بھی کچھ حصہ رہا ہوں۔ دوسرے یہ کہ اس کے احساسات ختم ہو چکے تھے۔ اسے صرف اپنی موت سے پہلی والی حالت یاد تھی۔

سوال 4: ﴿قَالَ بَلْ لَبِثْتُ مِائَةً عَامٍ فَأَنْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ ”بلکہ تم سو سال تک رہے سو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو وہ بالکل بھی خراب نہیں ہوئیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿قَالَ بَلْ لَبِثْتُ مِائَةً عَامٍ﴾ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا بلکہ تم سو برس اس حال میں رہے ہو۔ ﴿2﴾ ﴿فَأَنْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ اپنے کھانے پینے کی طرف دیکھو اس میں سے کچھ بھی خراب نہیں ہوا۔ اس شخص کے پاس انگور، انجیر اور کچھ پھلوں کا رس تھا ان میں سے کچھ خراب نہیں ہوا تھا نہ انگور خراب ہوئے نہ پھلوں کا رس خراب ہوا حالانکہ وہ جلد خراب ہونے والی چیزیں ہیں اور سو سال گزر چکے تھے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بہت بڑی دلیل ہے کہ سو سالوں کی مدت گزر جانے کے باوجود اس نے کھانے پینے کی چیزوں کو تبدیل یا خراب ہونے سے بچائے رکھا۔

سوال 5: ﴿وَأَنْظُرْ إِلَى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ﴾ ”اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو اور تا کہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے نشانی بنا سکیں“ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے گدھے کو کس چیز کی نشانی بنا دیا؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے گدھے کو زندگی کے بعد موت کی نشانی بنا دیا۔ اس کا گدھا مر چکا تھا ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس کی طرف توجہ دلائی اپنے گدھے کو دیکھو کیسے بوسیدہ ہو رہا ہے حالانکہ کھانے کی نسبت زندہ مخلوق دیر سے گلٹی سڑتی ہے۔

سوال 6: ﴿وَإِنظُرْ إِلَىٰ الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا لِمَ تَسْمُوهَا حَمِيًّا﴾ ” اور ہڈیوں کی طرف دیکھو کیسے ہم ان کو اٹھا کر جوڑتے ہیں پھر ان کو گوشت پہناتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے گدھے کو کیسے ان کے سامنے زندہ کیا؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی آنکھوں کے سامنے گدھے کو زندہ کیا۔ گدھے کی ہڈیاں اٹھا کر اس میں جوڑیں پھر ان کے سامنے گدھے کا ڈھانچہ تیار کر دیا۔ پھر ان ہڈیوں پر گوشت پوست، رگیں اور پٹھے پیدا کر دیے پھر فرشتہ بھیجا اور اس نے گدھے کے نتھنوں سے روح پھونک دی اور گدھا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہنہانے لگا۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے ایک شخص اور اس کے گدھے کو سو سال بعد زندہ کر دیا اور اس کے کھانے پینے کی چیزوں کو خراب نہیں ہونے دیا اس سے اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندہ کرنے کو ثابت کیا ہے۔

سوال 7: ﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ” جب اس پر خوب واضح ہو گیا تو اس نے کہا: میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر واقعاً پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے، کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ” جب اس پر خوب واضح ہو گیا، اس شخص کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا علم ہو گیا۔ اس کے سامنے گدھے کو زندہ کیا گیا۔ ان کے سامنے زندگی کے بعد موت کا معاملہ واضح ہو گیا۔ ﴿2﴾ ” قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ” اس نے کہا: میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر واقعاً پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے، آیت کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص موت کے بعد زندگی کا منکر تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوئی کہ اسے ہدایت دے کر لوگوں کے لیے نشانی اور قیامت کی دلیل بنا دے۔ اس موقف کے تین دلائل ہیں (الف) اس نے کہا: ﴿أَلَيْسَ لِي بِحَيٍّ هَذَا وَاللَّهُ بَعْدَ مَوْتِي﴾ ” اس کی موت کے بعد اللہ تعالیٰ اسے کس طرح زندہ کرے گا؟“ اگر وہ نبی یا نیک بندہ ہوتا تو یوں نہ کہتا۔ (ب) اللہ تعالیٰ نے اس کی خوراک، اس کے مشروب، اس کے گدھے اور اس کی ذات میں اپنی نشانی دکھادی، تاکہ وہ جس چیز کا انکار کرتا ہے اسے آنکھوں سے دیکھ کر اقرار کر لے۔ آیت میں یہ ذکر نہیں کہ وہ بہت ہی بعد میں پہلے کی طرح آباد ہو گئی تھی۔ نہ سیاق کلام سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔ نہ اس کا کوئی خاص فائدہ ہی ہے۔ ایک بہت ہی جو بے آباد ہو گئی۔ بعد میں اس کے باشندوں نے واپس آ کر یاد دوسرے لوگوں نے رہائش اختیار کر کے اسے آباد کر دیا تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا؟ اصل دلیل تو خود اسے اور اس کے گدھے کو زندہ کرنے میں اور اس کے سامان خورد و نوش کو اصلی حالت میں باقی رکھنے میں ہے۔ (ج) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ﴾ ” جب اس کے لیے ظاہر ہو گیا، یعنی جو چیز اسے معلوم نہیں تھی، اس سے مخفی تھی، وہ ظاہر اور واضح ہو گئی۔ اس سے معلوم ہوا ہمارا قول صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر سعدی: 1/310، 311) ﴿3﴾ اس نے کہا میں جانتا ہوں یعنی زندگی کے بعد موت کا عقیدہ رکھتا ہوں آنکھوں سے دیکھ کر تو سب سے بڑھ کر جانتا ہوں۔ یہ یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھنے والے ہیں۔ ﴿4﴾ ” أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ” اللہ تعالیٰ ہر چیز پر واقعاً پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ”القدر“ ہے کہ وہ تقدیر کا مالک ہے۔ اس نے ہر چیز کو اندازے سے پیدا کیا۔ وہ موت اور زندگی کو اندازے کے مطابق رکھتا ہے۔ کوئی انسان اس کی قدرت کا اندازہ نہیں لگا سکتا نہ اس کی

شان کے مطابق اس کی تعظیم کر سکتا ہے۔

﴿وَاذْأَقَالَ اِبْرَاهِيمُ رَبِّ اٰرْبِئِ كَيْفَ تُنْفِى النُّوْفِىؕ اَقَالَ اَوْ لَمْ تُؤْمِنُؕ اَقَالَ بَلِىؕ وَ لَكِن لَّيَطْمِئِنُّ قَلْبِىؕ اَقَالَ فَاَحْذِ اَرْبَعَةً مِّنَ الظُّلْمِؕ فَمَنْ اِيَّاكَ لَمْ اَجْعَلْ عَلَى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا مِّنْ اِيَّاكَ سَعِيًّاؕ وَاَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ﴾ (260)

”اور جب ابراہیم نے کہا: ”اے میرے رب! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اور کیا تو یقین نہیں رکھتا؟“ اس نے کہا: ”کیوں نہیں؟ لیکن اس لیے کہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”تو پرندوں میں سے چار لے کر انہیں اپنے سے مانوس کرو پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ٹکڑا رکھ دو پھر انہیں بلاؤ وہ تمہاری طرف بھاگتے چلے آئیں گے۔“ اور جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔“ (260)

سوال 1: ﴿وَاذْأَقَالَ اِبْرَاهِيمُ رَبِّ اٰرْبِئِ كَيْفَ تُنْفِى النُّوْفِىؕ﴾ ”اور جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ”اے میرے رب! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟“ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے والے، خشوع و خضوع کرنے والے عبادت گزار پیغمبر تھے۔ انہوں نے کہا کہ مالک! مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ یہ شوق کس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے؟
جواب: یہ ذوق و شوق ایک فطری امر ہے۔ اس شوق کا تعلق ایمان کی چٹنگی کے ساتھ نہیں ہے۔ ایمان کے نتیجے میں مومن کے دل میں کئی قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قدرت کے رازوں میں جھانکے۔ یہ شوق بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

سوال 2: سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال ﴿كَيْفَ تُنْفِى النُّوْفِى﴾ ”اے میرے رب! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟“ کیوں کیا تھا؟

جواب: سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مردود سے کہا تھا کہ میرا رب زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے اس لیے آپ علم الیقین سے عین الیقین کی طرف جانا چاہتے تھے اور مشاہدہ کی طرف ترقی کرنا چاہتے تھے کہ کہیں مردود یہ نہ پوچھ لے کہ کبھی رب کو مارتا اور جلاتا ہوا دیکھا بھی ہے اس لیے انہوں نے مشاہدہ زندگی بعد موت کے لیے دعا کی تھی۔ (مختصر ابن کثیر: 176/1)

سوال 3: ﴿اَقَالَ اَوْ لَمْ تُؤْمِنُؕ اَقَالَ بَلِىؕ﴾ ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اور کیا تو یقین نہیں رکھتا؟“ اس نے کہا: ”کیوں نہیں؟“ اس کی وضاحت کریں؟

جواب: سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا تھا یقین تو ہے مگر دل کا اطمینان چاہتا ہوں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ”ابراہیم کی نسبت ہم اطمینان قلب کے زیادہ محتاج ہیں۔“ (بخاری)

سوال 4: ﴿وَلَكِن لَّيَطْمِئِنُّ قَلْبِى﴾ ”لیکن اس لیے کہ میرا دل مطمئن ہو جائے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو یقین تو تھا لیکن حق یقین کا مقام چاہتے تھے تاکہ ایمان میں اضافہ ہو یعنی دلائل سے انسان کا دل مطمئن ہو جاتا ہے کیونکہ دلائل سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور یقین کامل ہو جاتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شک کرنے کا ہمیں ابراہیم رضی اللہ عنہ سے زیادہ حق ہے، جب انہوں نے عرض کیا تھا کہ اے میرے رب! مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا، کیا تجھ کو یقین نہیں ہے؟ عرض کی یقین ضرور ہے، لیکن میں نے یہ درخواست اس لئے کی ہے کہ میرے دل کو اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ (صحیح بخاری: 4537) ﴿2﴾ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ابراہیم علیہ السلام شک میں مبتلا ہوتے تو ہم لوگ اس کے زیادہ قریب تھے اور جب ہم شبہ نہیں کرتے تو ابراہیم علیہ السلام کیسے شبہ کر سکتے تھے؟ قرطبی نے لکھا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے لیے اس قسم کا شبہ جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ وَّوَكْفٰى بِرَبِّكَ وَاَكْبٰرًا﴾ میرے بندوں پر بلاشبہ تجھے کوئی اختیار نہیں اور آپ کا رب ہی کارساز کافی ہے۔ (الاسراء: 65) (تیسیر الرحمن)

سوال 5: ﴿قَالَ فَخُذْ اٰمْرًا بَعْدَ اَمْرٍ مِنَ الظَّالِمِ فَاِنَّهُمْ لَمَّا يَلٰئِكُمْ يَلٰئِكُمْ اَجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا مِّنْ اٰمْرِ اٰدَمَ اِذْ عٰمُرُوْهُنَّ اَنْ يَّاتِيَنَّكَ سَعِيًّا﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو پرندوں میں سے چار لے کر انہیں اپنے سے مانوس کر دو پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ٹکڑا رکھ دو پھر انہیں بلاؤ وہ تمہاری طرف بھاگتے چلے آئیں گے، اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لیے تخلیق کے راز کو کیسے واضح کیا؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿قَالَ فَخُذْ اٰمْرًا بَعْدَ اَمْرٍ مِنَ الظَّالِمِ﴾ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ چار پرندے لیں۔ ﴿2﴾ ﴿فَاِنَّهُمْ لَمَّا يَلٰئِكُمْ يَلٰئِكُمْ اَجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا مِّنْ اٰمْرِ اٰدَمَ اِذْ عٰمُرُوْهُنَّ اَنْ يَّاتِيَنَّكَ سَعِيًّا﴾ پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ٹکڑا رکھ دو پھر انہیں بلاؤ، پھر ذبح کر کے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ ان کے اجزا کو پہاڑوں پر بکھیر دیں پھر پکاریں۔ ان میں زندگی لوٹ آئے گی۔ ﴿4﴾ ﴿يَّاتِيَنَّكَ سَعِيًّا﴾ وہ دوڑ کر تمہاری طرف لوٹ آئیں گے، پوری قوت سے دوڑتے ہوئے اور تیزی سے اڑتے ہوئے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ایسے ہی کیا۔ اس طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے تخلیق کے راز کو پالیا۔ انہیں مردوں کے زندہ ہونے کا مشا ہدہ حاصل ہو گیا رب العزت نے فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ نُرِيْ اٰبْرٰهِيْمَ مَلٰٓئِكٰتِ السَّمٰوٰتِ وَاٰلِہٖمُ السَّلٰمِ وَاِذْ اٰمُرُوْهُنَّ اَنْ يَّاتِيَنَّكَ سَعِيًّا﴾ اور ابراہیم کو اسی طرح ہم آسمانوں اور زمین کی عظیم سلطنت دکھاتے تھے تاکہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ (الانعام: 85)

سوال 6: کیا زندگی اور موت کی حقیقت اور موت کے بعد زندگی کے راز کو انسان اپنی عقل سے پاسکتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ انسان کثرت سے پیدا ہوتے ہیں اور کثرت سے جہان سے جاتے ہیں لیکن عقل موت اور حیات کی حقیقت کو پانے سے عاجز ہے۔ ﴿2﴾ انسانی عقل کے پاس موت اور حیات کی حقیقت کو پانے کے لیے زیادہ سے زیادہ جو ذریعہ ہے وہ زندگی کے آثار ہیں جن کو دیکھ کر انسان زندگی کا اندازہ لگاتا ہے۔ انسان مرنے والوں کی موت کے آثار دیکھ کر موت کا اندازہ لگاتا ہے۔ ﴿3﴾ موت کے بعد زندگی کو اللہ تعالیٰ نے ذہن پر نقش کیا ہے۔ عقلی دلائل نہیں دیئے گئے، ماضی کا کوئی واقعہ نہیں سنایا گیا، ذاتی تجربے سے گزار کر شعور دیا گیا۔ سب سے

زیادہ ذاتی تجربہ انسان کے شعور اور احساسات پر چھایا رہتا ہے، اور دل مطمئن ہو جاتا ہے مزید یقین دہانی کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

سوال 7: انبیاء علیہم السلام کو غیب کے پردے کے پیچھے چھپے حقائق دکھانے کا خصوصی معاملہ کیوں ہوتا ہے؟

جواب: انبیاء علیہم السلام کو غیب کا پردہ ہٹا کر اس لیے سب کچھ دکھایا جاتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو ان چھپی ہوئی حقیقتوں سے باخبر کر سکیں اور ان کے بارے میں کہہ سکیں کہ ہم دیکھی ہوئی چیز سے باخبر کر رہے ہیں نہ کہ سنی ہوئی چیز سے۔

سوال 8: ﴿وَأَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ اور جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات ”عزیز“ اور ”حکیم“ کا کیسے شعور دلا یا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی زندگی پر غلبے سے اپنے ”عزیز“ ہونے کا شعور دلا یا ہے یقیناً جو ٹکڑے ٹکڑے گوشت کو پورے وجود کی شکل میں زندگی دیتا ہے وہ غالب ہے۔ ﴿2﴾ ہر چیز اس کی قدرت کے دائرے میں ہے کوئی اس کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ جو وہ چاہتا ہے بغیر کسی رکاوٹ کے ہو جاتا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ اپنے اقوال و افعال، اپنی شریعت میں بڑی حکمت والا ہے۔

رکوع نمبر 4

﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ وَاللَّهُ يُضْعِفُ لِمَنْ

يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ (261)

”جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایک دانے جیسی ہے جو سات خوشے اگاتا ہے، ہر خوشے میں سو دانے ہیں اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے کئی گنا بڑھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔“ (261)

سوال 1: اس آیت کا سبب نزول کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ یہ آیت سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے غزوۃ تبوک میں انفاق کے بارے میں نازل ہوئی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جب ایک ہزار اونٹ اور ایک ہزار دینار نبی ﷺ کے سامنے لا کر رکھے تو آپ ﷺ ان کو الٹے پلٹے رہے اور فرمایا: آج کے بعد عثمان کا کوئی فعل اسے نقصان نہیں دے گا۔ ﴿2﴾ سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے پاس چار ہزار درہم لے کر آئے اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے پاس آٹھ ہزار درہم تھے۔ میں نے چار ہزار اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے روک لیے اور چار ہزار میں نے اپنے رب کو قرض دے دیے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بَارَكَ اللَّهُ لَكَ فِيمَا أُمْسَكْتَ وَفِيمَا أُعْطِيَتْ اللَّهُ تَعَالَىٰ آپ کو اس میں برکت دے جو آپ نے روک دیا اور جو آپ نے عطا کر دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ

اللَّهُ﴾ (اسباب النزول للواحدی: 47)

سوال 2: ﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ﴾ ”جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایک دانے جیسی ہے جو سات خوشے اگاتا ہے، ہر خوشے میں سو دانے ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایک دانے جیسی ہے جو سات خوشے اگاتا ہے، ہر خوشے میں سو دانے ہیں“ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو مال خرچ کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بڑھادیتے ہیں۔ اس کی مثال ایک دانے سے دی گئی ہے جس کو بونے سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اس سے اللہ تعالیٰ یہ سمجھا رہے ہیں کہ اس کی راہ میں مال خرچ کرتے ہوئے جتنا خلوص ہوگا اسی کے مطابق اس کا جز زیادہ ہوگا۔ جو رب ایک دانے سے سات سو دانے نکال سکتا ہے، وہ ایک روپے کو ترقی دے کر سات سو بھی کر سکتا ہے۔

سوال 3: انفاق فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: انفاق فی سبیل اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور خوشنودی کے لیے خرچ کیا جانے والا مال ہے۔ فی سبیل اللہ سے مراد ہر وہ راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچائے۔ جہاد فی سبیل اللہ، مسلمانوں کو نفع پہنچانے والے اعمال، نفع مند علوم کی نشر و اشاعت اور فقراء و مساکین پر خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔

سوال 4: اللہ تعالیٰ کی راہ میں کون اپنا مال خرچ کرتا ہے؟

جواب: رب العزت نے فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوْا الزَّكَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُسِرُّوْنَ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ الْبِزْيَارَةَ بِيَمِينِهِمْ وَإِنَّا لَنَنظُرُهُمْ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ إِنَّهُمْ فِي عُنُقِهِمْ مِيزَانٌ ۚ وَإِنَّا نَحْنُ الرَّحِيمُ ۚ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ إِنَّهُمْ فِي عُنُقِهِمْ مِيزَانٌ ۚ وَإِنَّا نَحْنُ الرَّحِيمُ ۚ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ إِنَّهُمْ فِي عُنُقِهِمْ مِيزَانٌ ۚ وَإِنَّا نَحْنُ الرَّحِيمُ ۚ﴾ یقیناً جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے چھپے اور کھلے خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جو ہرگز برباد نہیں ہوگی۔ تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے اجر ان کو پورے کے پورے دے اور اپنے فضل سے ان کو اور زیادہ دے۔ یقیناً وہ بے حد بخشنے والا، نہایت قدر دان ہے۔ (فاطر: 29,30)

سوال 5: انفاق کو بیچ سے تشبیہ دے کر رب العزت نے کس طرح انسانی فطرت کو جھنجھوڑا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اس مثال کے ذریعے عمل کے ثواب میں اضافے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ رب العزت نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے۔ ﴿2﴾ اس حقیقت کے خوب صورت اظہار کی وجہ سے انسانی شعور میں جوش و خروش پیدا ہوتا ہے اور انسانی ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ ﴿3﴾ انسان کے سامنے زندہ ہری بھری فصل آتی ہے۔ ﴿4﴾ انسان کے سامنے عام لیکن عجیب تجربہ آتا ہے۔ ﴿5﴾ اس زندہ منظر کی وجہ سے انسان کا ضمیر بھی سخاوت کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور انسان اپنا سب کچھ لگانے کے لئے

تیار ہو جاتا ہے۔ ﴿6﴾ انسان کو اپنے کیے کا اتنا پھل ملنے کا یقین ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ اور زیادہ خرچ کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

سوال 6: انفاق کو بیخ سے تشبیہ دے کر ہمیں کیا سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے؟

جواب: انسان کا عمل بیخ کی طرح ہے جو اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ زمین بھی اچھی بری ہو سکتی ہے۔ انسان دنیا کی زمین میں ڈالے گا تو یہیں پھل پائے گا، آخرت کی زمین میں انفاق کا بیخ ڈالے گا تو آخرت میں کئی گنا پھل پائے گا۔

سوال 7: انفاق کے لیے نبی ﷺ نے کیسے ترغیب دلائی ہے؟

جواب: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَنْفَقْ اَنْفَقْ عَلَيَّ كَمَا (میری راہ میں) خرچ کرو تو میں بھی تم پر خرچ کروں گا“ اور فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے، رات اور دن کے مسلسل خرچ سے بھی یہ کم نہیں ہوتا“ اور فرمایا: ”تم نے دیکھا نہیں جب سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے، مسلسل خرچ کیے جا رہے لیکن اس کے ہاتھ میں کوئی کمی نہیں ہوئی، اس کا عرش پانی پر تھا اور اس کے ہاتھ میں میزان عدل ہے جسے وہ جھکا تا اور اٹھاتا رہتا ہے۔“ (صحیح بخاری: 4684)

سوال 8: ﴿وَاللّٰهُ يُضَوِّفُ لِمَنْ يَّشَاءُ﴾ اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے کئی گنا بڑھاتا ہے، وہ کون سا انفاق ہے جو بڑھتا ہے؟

جواب: ”اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے کئی گنا بڑھاتا ہے“ یعنی اللہ تعالیٰ بے حساب اجر عطا فرماتا ہے۔ وہ انفاق بڑھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اخلاص کے ساتھ کیا جائے۔ انفاق خرچ کرنے والے کے حالات، اس کے اخلاص یا خرچ کی کیفیت، منافع اور موقع پر ہونے کی مناسبت سے بڑھتا ہے۔ ﴿1﴾ عَنْ خُرَيْمِ بْنِ فَاتِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ رَوَايَتِ كَرْتِي هُنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ: مَنْ أَنْفَقَ نَفَقَةً فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَتَبَتْ لَهُ سَبْعُ مِائَةِ ضَعْفٍ۔ سیدنا خریم بن فاتک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے اس کے لیے سات سو گنا اجر لکھا جاتا ہے۔“ (جامع ترمذی: 1625) ﴿2﴾ سیدنا ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی ایک اونٹنی لے کر آیا جس کو مہار ڈالی ہوئی تھی۔ عرض کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں (صدقہ) ہے تو اسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تیرے پاس قیامت کے دن اس کے بدلے سات سو اونٹنیاں ہوں گی جن کی مہار ڈالی ہوئی ہوگی۔“ (صحیح مسلم: 4897)

سوال 9: دنیا کے لیے کیا جانے والا خرچ کس نوعیت کا ہوتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ جس مال کو خرچ کر کے انسان دنیا کا فائدہ چاہے مثلاً دنیا میں شہرت، عزت وغیرہ۔ ﴿2﴾ دنیا کے لیے کیے جانے والے خرچ کا بدلہ دنیا میں مل جاتا ہے۔ ﴿3﴾ دنیا کے لیے کیے جانے والے خرچ کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

سوال 10: آخرت کے لیے کیا جانے والا خرچ کس نوعیت کا ہوتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے مال خرچ کرتا ہے وہ کسی پر بھی احسان نہیں جتا تا۔ ﴿2﴾ اگر کسی سوال کرنے والے کو نہ دیا جاسکے تو اسے برا بھلا بھی نہیں کہتا۔ ﴿3﴾ اس کے مال خرچ کرنے پر لوگ اچھا response نہ دیں تو وہ ناراضگی کا اظہار نہیں کرتا کیونکہ اس کے

دل کو یقین ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے بدلہ لینا ہے۔ ﴿4﴾ نہ دے سکنے کی صورت میں نرمی سے معذرت کر لیتا ہے کیونکہ اس کے دل کو یقین ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اپنے رب کے سامنے کہہ رہا ہوں۔

سوال 11: اللہ تعالیٰ ﴿وَاسِعٌ﴾ ”بڑی وسعت والا ہے“ کی وضاحت ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ ﴿وَاسِعٌ﴾ بڑی وسعت والا ہے، اس کی عطا میں کمی نہیں۔ ﴿2﴾ وہ وسعت والا ہے اس کا ہاتھ تنگ نہیں کہ کسی مومن کا عمل جتنی ترقی کر سکتا ہو اتنی ترقی نہ دے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کا فضل وسیع ہے، اس کی وسعت کبھی ختم ہونے والی نہیں، اس کی عطا بے حساب ہے لہذا خرچ کرنے والے کو یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ اس کے لیے کوئی انعام مشکل ہے۔

سوال 12: اللہ تعالیٰ کے ﴿عَلِيمٌ﴾ ”سب کچھ جاننے والا“ ہونے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ہے کہ جو خرچ کیا جائے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ کون دو گئے چو گئے ثواب کا مستحق ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے کہ اسے انسان کے سچے جذبوں کی خبر ہی نہ ہو اور ان کا اجر مارا جائے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نیتوں کا حال جانتا ہے، وہ اپنے علم کی وجہ سے نیکی اور نیتوں پر اصرار دیتا ہے کیونکہ اس کا علم اور حکمت کامل ہے۔

﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَمْ يَأْبَهُمْ مِمَّا أَنْفَقُوا مِمَّا وَلَا أَدَىٰ لَهُمْ أَجْرُهُمْ جُنْدًا لَهُمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (262)

”وہ جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں پھر جو انہوں نے خرچ کیا اس کے پیچھے نہ کسی طرح کا احسان جتلا نالاتے ہیں اور نہ ہی کوئی تکلیف پہنچانا، ان کے لئے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ (262)

سوال 1: ﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ”وہ جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں“ انفاق فی سبیل اللہ سے اللہ تعالیٰ کن مقاصد کو پورا کرنا چاہتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ انفاق کرنے والے کا نفس پاک ہو جائے۔ ﴿2﴾ انفاق کرنے والے کو اخلاقی پاکیزگی نصیب ہو جائے۔ ﴿3﴾ انفاق کرنے والے کے نفس کی اصلاح ہو جائے۔ ﴿4﴾ معاشرے کے افراد کے درمیان محبت پیدا ہو جائے۔ ﴿5﴾ انفاق کرنے والا خالص اللہ تعالیٰ کی خوشی کے لیے صدقہ دے۔

سوال 2: انفاق کے فوائد حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ذہن کو کیسے تیار کرتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ یہ واضح فرماتے ہیں کہ سب کچھ اسی کا دیا ہوا ہے اور مال و دولت اسی کی ملکیت میں ہے۔ ﴿2﴾ دولت کے حصول کے قریبی اور دور کے سارے اسباب اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ ﴿3﴾ دولت کے حصول کا کوئی ذریعہ انسان کے کنٹرول میں نہیں

ہے۔ ﴿4﴾ دولت والے اس رزق کے جو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے محافظ اور امین ہیں۔ ﴿5﴾ دولت والا اگر خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے میں سے خرچ کرتا ہے۔ ﴿6﴾ اگر کوئی مال خرچ کر کے نیکی کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر دیں گے۔ ﴿7﴾ صدقہ دینے والے کے لیے صدقہ لینے والا اجر کا باعث بنتا ہے۔ ﴿8﴾ صدقہ کرنے سے نہ مال کم ہوتا ہے نہ ضائع ہوتا ہے۔ ﴿9﴾ انفاق کرنے کی بیش بہا فوائد سے ترغیب دی ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مال خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعد ایسے کام نہیں کرتے جس سے عمل ضائع ہو جائے یا اس میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے مثلاً احسان جتلا نا اور زبانی اور عملی طور پر ایذا دینا تو ایسے لوگوں کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔

سوال 3: ﴿لَمْ يَلْبِسْ عَوْنًا مَّا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَدْمَى﴾ ”پھر جو انہوں نے خرچ کیا اس کے پیچھے نہ کسی طرح کا احسان جتلا نالاتے ہیں اور نہ ہی کوئی تکلیف پہنچانا“ احسان جتلا نا اور ایذا دینا کیسا عمل ہے؟

جواب: ﴿1﴾ احسان جتلا نے سے مراد ہے جس پر صدقہ کیا ہو اس کے سامنے صدقے اور اس کی تعداد کا ذکر کرنا اور اس پر اپنی بڑائی ثابت کرنا۔ ﴿2﴾ احسان جتلا نا ایک ناپسندیدہ، گھٹیا اور مکروہ کام ہے۔ ﴿3﴾ جس پر احسان جتلا یا جاتا ہے اس کے لیے باعث اذیت ہے۔ ﴿4﴾ جو احسان جتلا تا ہے وہ تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ﴿5﴾ ”آدمی“ تکلیف پہنچانے سے مراد یہ کہنا ہے کہ میں نے تمہیں فلاں فلاں چیز نہیں دی اور یہ کہ میں نے تم پر اس طرح سے خرچ نہیں کیا۔

سوال 4: انسان کب احسان جتلا تا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ انسان تب احسان جتلا تا ہے جب وہ جھوٹے احساس برتری میں مبتلا ہو اور یہ چاہے کہ لوگ اسے اچھا کہیں۔ ﴿2﴾ جب وہ یہ چاہے کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ ﴿3﴾ جب وہ یہ چاہے کہ لوگ اس کے انفاق کو پسندیدہ نظروں سے دیکھیں۔ ﴿4﴾ جب اس کے دل میں غرور و تکبر ہو۔ ﴿5﴾ جب اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو کہ وہ اپنے بھائی کو ذلیل و رسوا کرے۔ ﴿6﴾ جب اس کا دل پاک نہ ہو اس میں بخل اور حرص ہو۔ ﴿7﴾ احسان جتلا نے والے کے دل میں نفاق، ریا کاری اور اللہ تعالیٰ سے دوری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

سوال 5: جس پر احسان جتلا یا جاتا ہے اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ وہ اپنے آپ کو کم تر اور برے حالات میں محسوس کرتا ہے۔ ﴿2﴾ اس کے دل میں حقارت اور انتقام کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ ﴿3﴾ افراد معاشرہ کے درمیان دشمنیاں اور نفرتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ماہر نفسیات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ احسان جتلا نے والا اور جس پر احسان جتلا یا جاتا ہے دونوں کے درمیان کسی موڑ پر دشمنی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ جو احسان جتلا تا ہے وہ تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جس پر احسان کیا جاتا ہے اس کے اندر احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ احساس ہر وقت اس کے

اندر چھپا رہتا ہے اور اس پر غلبہ پانے کے لیے وہ احسان کرنے والے پر بھی حملہ آور ہو جاتا ہے۔ ﴿4﴾ احسان جتلانے سے انفاق فی سبیل اللہ زہر اور آگ بن جاتا ہے جس سے دشمنی پھوٹ نکلتی ہے۔ ﴿5﴾ احسان جتلانے سے انفاق اذیت کا ذریعہ بن جاتا ہے اور بے اثر ہو جاتا ہے۔

سوال 6: احسان جتلانے سے کیوں روکا گیا؟

جواب: احسان جتلانے سے اس لئے روکا گیا تاکہ ﴿1﴾ کوئی دینے والا احسان جتلا کر تکبر نہ خریدے۔ ﴿2﴾ کوئی لینے والا صدقہ لے کر احساس کم تری کا شکار نہ ہو۔ ﴿3﴾ احسان جتلانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور احسان جتلانے والا ان تین لوگوں میں سے ہے جن کی طرف قیامت کے دن نہ اللہ تعالیٰ دیکھے گا نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”تین آدمی ایسے ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا اور نہ انہیں گناہوں سے پاک و صاف کرے گا (معاف کرے گا) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے تین باریہ فرمایا۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ لوگ تو سخت نقصان اور خسارے میں ہوں گے، یہ کون لوگ ہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے والا اور دے کر احسان جتلانے والا اور جھوٹی قسم کھا کر سامان بیچنے والا۔“ (صحیح مسلم: 293)

سوال 7: انفاق فی سبیل اللہ کے معاشرے کو کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ معاشرے کے افراد کے درمیان اچھے تعلقات پروان چڑھتے ہیں۔ ﴿2﴾ وہ ایک دوسرے کے ہمدرد ہو جاتے ہیں۔ ﴿3﴾ وہ ایک دوسرے کے لیے فراخ دل ہو جاتے ہیں۔ ﴿4﴾ وہ ایک دوسرے کے لیے عالی ظرف ہو جاتے ہیں۔ ﴿5﴾ وہ ایک دوسرے کے لیے خود غرضی، بخل، تنگدلی اور سنگدلی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ ﴿6﴾ وہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ ﴿7﴾ اسلامی معاشرے میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔ ﴿8﴾ اسلامی معاشرے کے رجحانات ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ ﴿9﴾ افراد معاشرہ میں ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔ ﴿10﴾ اسلامی معاشرے کے افراد کے فرائض اور ذمہ داریوں میں یک سوئی پیدا ہو جاتی ہے۔ ﴿11﴾ وہ ایک دوسرے کی ضروریات کی کفالت کرتے ہیں۔

سوال 8: ﴿لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ ”ان کے لئے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”ان کے لئے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے“ جو انفاق فی سبیل اللہ میں احسان نہیں جتلانے اور تکلیف نہیں دیتے، ان کو اللہ تعالیٰ ان کے شایان شان اجر عطا فرمائیں گے کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے

ایسا نیک کام کیا جو اس کو ضائع کرنے والے اسباب سے پاک تھا۔ ﴿2﴾ اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے رب کی رضا کے لیے صدقہ کیا اور احسان جتلانے اور تکلیف دینے سے بچے۔

سوال 9: صدقہ کرنے والے کو کس چیز کا خوف اور غم نہیں ہوگا؟

جواب: ﴿1﴾ صدقہ کرنے والے کو مال کم ہونے کا خوف اور غم نہیں ہوگا۔ ﴿2﴾ صدقہ کرنے والے کا نہ اجر ضائع ہوگا، نہ ہی ضائع ہونے کا خوف اور غم ہوگا۔ ﴿3﴾ صدقہ کرنے والے کو نہ دنیا میں کوئی غم ہوگا اور نہ آخرت میں برے انجام سے پریشانی ہوگی۔

سوال 10: انفاق کے انفرادی فوائد کیا ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ انسان اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو اپنا ذاتی فائدہ سمجھنے لگتا ہے ﴿وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُفْسِدْكُمْ﴾ اور خیر میں سے جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ تمہارے ہی لیے ہے۔ (البقرہ: 272) ﴿2﴾ انفاق فی سبیل اللہ برائیوں کو دور کرنے کا ذریعہ ہے۔ ﴿وَيَكْفُرْ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾ اور وہ (اللہ تعالیٰ) تمہاری کچھ برائیاں تم سے دور کر دے گا۔ (البقرہ: 271) ﴿3﴾ انسان اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیے گئے مال کو پھلتا پھولتا محسوس کرنے لگتا ہے۔

سوال 11: انفاق کے معاشی فوائد کیا ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔ ﴿2﴾ جس معاشرے کے خوش حال افراد ضرورت سے زائد غریبوں کو دے دیں تاکہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں یا کاروباری لوگوں کو بلا سود قرضے دے دیں یا شراکت کے اصول پر نفع و نقصان کے حصہ دار بن جائیں یا حکومت کے پاس جمع کروائیں کہ وہ اجتماعی خدمات کے لیے استعمال کرے، اس سوسائٹی کی تجارت، صنعت اور زراعت میں بے انتہا اضافہ ہوگا۔

سوال 12: انفاق کے کیا مقاصد ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ انسانیت کی فلاح۔ ﴿2﴾ انسانیت کی بہتری۔ ﴿3﴾ انسانیت کا امن۔ ﴿4﴾ انسان کی اچھی زندگی۔

سوال 13: انفاق کے معاشرتی فوائد کیا ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ انفاق کی وجہ سے معاشرے میں بے روزگاری ختم ہو جاتی ہے۔ ﴿2﴾ معاشرے میں جرائم پروان نہیں چڑھتے۔ ﴿3﴾ معاشرے کے افراد کے اخلاق بہتر ہوتے ہیں۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ سے تعلق میں اضافہ ہوتا ہے اور دین کے کام ہونے لگتے ہیں۔ ﴿5﴾ معاشرتی تعلقات میں بہتری آتی ہے۔ ﴿6﴾ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے دشمن قوموں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا جاتا ہے۔

سوال 14: انفاق کے اخلاقی فوائد کیا ہیں؟

جواب: انفاق کی وجہ سے انسان کے اخلاق اچھے ہو جاتے ہیں۔ ﴿1﴾ انسان ہمدرد ہو جاتا ہے۔ ﴿2﴾ انفاق کرنے والوں میں فراخ دلی

پیدا ہو جاتی ہے۔ ﴿3﴾ اچھی صفات پروان چڑھتی ہیں۔

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَّبِعُهَا أَذَىٰ ۗ وَاللَّهُ عَنِّي حَلِيمٌ﴾ (263)

”اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے پیچھے کسی طرح کی اذیت پہنچانا ہو اور اللہ تعالیٰ بہت بے پرواہ، بے

حد بردار ہے۔“ (263)

سوال 1: ﴿قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَّبِعُهَا أَذَىٰ﴾ ”اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے پیچھے کسی طرح کی اذیت پہنچانا ہو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ قول معروف سے مراد سوال کرنے والے سے نرمی اور شفقت سے بات کرنا اور دعائیہ کلمات سے جواب دینا ہے۔ ﴿2﴾ کلمی نے کہا اس سے مراد وہ نیک دعا ہے جو کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے لیے اس کی غیر موجودگی میں کرتا ہے۔ (تفسیر مظہری: 39/2)

﴿3﴾ کلمہ طیبہ صدقہ ہے اور آپ کا اپنے بھائی سے مسکراتے چہرے سے ملنا صدقہ ہے۔ (مسلم: 2626) ﴿4﴾ ﴿قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ﴾ سے مراد وہ پاک کلام ہے جو کسی محتاج ضرورت مند کے لیے کہا جائے مثلاً ”اللہ یرزقنا وایاکم“ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی رزق دے اور آپ کو بھی، ”اللہ کریم“ اللہ تعالیٰ کریم ہے ”اللہ یفتح علینا وعلیک“ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی کشادگی عطا فرمائے اور آپ کو بھی۔ (ایسر التفسیر: 140، 141) ﴿5﴾ قول معروف جس کو دل پہنچانے ہیں اور اسے ناپسند نہیں کرتے۔ اس میں ہر اچھی بات شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے دل کی خوشی کا باعث بننا کار ثواب ہے۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ سائل کو جواب دینا ہو تو اچھے الفاظ سے جواب دیا جائے اور اسے عادی جائے۔ (تفسیر سعدی: 314/1) ﴿6﴾ ﴿وَمَغْفِرَةٌ﴾ ”اور درگزر کرنا“ مغفرت سے مراد ہے سوال کرنے والے کے فقر اور اس کی ضرورت کا لوگوں کے سامنے اظہار نہ کرنا اور اس کی پردہ پوشی کرنا۔ اسی طرح سوال کرنے والے کے منہ سے اگر کوئی بات نکل جائے تو اس سے چشم پوشی کرنا۔ سائل برابر پیچھے پڑا ہے اور اس کی باتیں نفس پر گراں گزریں تو اس وقت اس سے درگزر کرنا اور اسے معاف کر دینا ہی خوبی کی بات ہے۔ (تفسیر مراغی) ﴿7﴾ مغفرت یعنی درگزر کرنے سے مراد ہے مواخذہ نہ کرنا۔ ﴿8﴾ ﴿خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتَّبِعُهَا أَذَىٰ﴾ ”اس صدقے سے بہتر ہے جس کے پیچھے کسی طرح کی اذیت پہنچانا ہو“ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ”ہر مسلمان پر صدقہ کرنا ضروری ہے۔“ لوگوں نے پوچھا: ”اے اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ! اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”پھر اپنے ہاتھ سے کچھ کما کر خود کو بھی نفع پہنچائے اور صدقہ بھی کرے۔“ لوگوں نے کہا کہ ”اگر اس کی طاقت نہ ہو؟“ فرمایا کہ ”پھر کسی حاجت مند فریادی کی مدد کرے۔“ لوگوں نے کہا کہ ”اگر اس کی بھی سکت نہ ہو؟“ فرمایا: ”پھر اچھی بات پر عمل کرے اور بری باتوں سے باز رہے، اس کا یہی صدقہ ہے۔“ (صحیح بخاری: 1445)

سوال 2: اچھی بات کہنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: ﴿1﴾ قول معروف (اچھی بات) سے دل کے زخم بھر جاتے ہیں۔ ﴿2﴾ اچھی بات سے دل کو خوشی ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو وہ آدمی سب سے زیادہ پسند ہے جو دوسروں کو خوشی پہنچائے۔ ﴿3﴾ اچھی بات سے ملنے والی خوشی کا جواب آتا ہے۔

سوال 3: درگزر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: ﴿1﴾ درگزر کرنے کو بھی اللہ تعالیٰ نے صدقہ قرار دیا ہے۔ ﴿2﴾ دل کا میل دور ہو جاتا ہے یعنی بغض، کینہ وغیرہ۔ ﴿3﴾ بھائی چارہ اور دوستی پیدا ہو جاتی ہے۔ ﴿4﴾ نفس میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ ﴿5﴾ آپس کے تعلقات بہتر ہو جاتے ہیں۔

سوال 4: ﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ بہت بے پرواہ ہے، اللہ تعالیٰ کے بے پرواہ ہونے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ ﴿غَفُورٌ﴾ ”بے پرواہ ہے“ وہ کبھی کسی چیز کا محتاج نہیں ہوتا۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ ﴿غَفُورٌ﴾ ”بے پرواہ ہے“ وہ اپنی مخلوق سے بے پرواہ ہے اسی لیے انہیں سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ ﴿غَفُورٌ﴾ ”بے پرواہ ہے“ وہ کسی بھی دینے جانے والے صدقے سے بے پرواہ ہے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ ﴿غَفُورٌ﴾ ”بے پرواہ ہے“ وہ ایسے صدقے سے بے پرواہ ہے جس کے ساتھ ایذا دینا شامل ہو۔

سوال 5: اللہ تعالیٰ ﴿حَلِيمٌ﴾ ”بے حد بردبار ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ ﴿حَلِيمٌ﴾ ”بے حد بردبار ہے“ وہ انسان کو جو دیتا ہے، رزق دیتا ہے، اور وہ اس کا شکر ادا نہیں کرتے لیکن اللہ تعالیٰ فوراً سزا نہیں دیتا۔ انسانوں کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بردباری سیکھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے دینے ہوئے میں سے کچھ دیں تو جتنا نانا شروع کر دیں اور اذیت دینا نہ شروع کر دیں کہ احسان مند تو شکر ادا کر رہا ہو اور اس کی کسی ناپسندیدہ بات کی وجہ سے یہ اذیت دے رہے ہوں۔ ﴿2﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا حلیم وہ ہے جو اپنے حلم میں کامل ہے۔ (الدر المنثور: 1/599) ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ ﴿حَلِيمٌ﴾ ”بے حد بردبار ہے“ جو اس کی نافرمانی کرے اسے فوراً سزا نہیں دیتا حالانکہ وہ اس کی قدرت رکھتا ہے لیکن اس کی رحمت، احسان اور بردباری اسے گناہ گاروں کو فوری سزا دینے سے مانع ہو جاتی ہے۔ بلکہ وہ انہیں مہلت دیتا ہے انہیں مختلف انداز سے اپنی آیات سناتا اور دکھاتا ہے تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ البتہ جب یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں میں خیر کی کوئی رتق نہیں رہی اور انہیں آیات سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا پھر ان پر عذاب نازل فرما دیتا ہے اور اپنے عظیم ثواب سے محروم فرما دیتا ہے۔ (تفسیر سعدی: 1/314)

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَطْلُتُوا صِدْقَكُمْ بِالرِّبِّ وَالْأَدْمَىٰ كَالَّذِينَ يُبْفِقُونَ مَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانَ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

الْكُفْرِينَ﴾ (264)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے صدقات احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے سے ضائع نہ کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا، تو اس کی مثال ایک صاف چٹان کی مثال جیسی ہے جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور دار بارش پڑے تو اس کو ایک سخت چٹان چھوڑ جائے، جو انہوں نے کمایا اس میں سے کسی چیز پر وہ قدرت نہیں رکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“ (264)

سوال 1: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْذُّمِّ﴾ ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے صدقات احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے سے ضائع نہ کرو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ یہاں انفاق کے دو اہم آداب بتائے گئے ہیں۔ (i) منّا احسان نہیں جتلانا۔ (ii) ﴿وَالذُّمِّ﴾ تکلیف نہیں دینی۔ ﴿2﴾ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ احسان جتلانے اور تکلیف پہنچانے سے صدقات ضائع ہو جاتے ہیں اور گناہوں کے نتیجے میں نیک اعمال ضائع ہو جاتے ہیں جیسے رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ نبی کی آواز پر اپنی آوازیں بلند نہ کرو اور نہ اس سے بات کرنے میں آواز بلند کیا کرو جیسے تم میں سے بعض، بعض کے لیے آواز بلند کرتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم شعور نہ رکھتے ہو۔ (الحجرات: 2) ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿وَلَا تَبْطُلُوا أَعْمَالَكُمْ﴾ اور اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔ (محمد: 33) ﴿3﴾ سدی نے کہا: احسان جتلانے اور تکلیف پہنچانے سے صدقات ضائع ہو جاتے ہیں جیسے ریا کاری سے صدقہ ضائع ہو جاتا ہے۔ (ابن ابی حاتم: 517/2) ﴿4﴾ صدقات کا ثواب ضائع نہ کر لو جیسے ریا کار کے صدقے کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا۔ (زاد المسیر: 276/1)

سوال 2: ﴿كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ ”اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا“ اس سے مراد ہے کہ صدقات کا ثواب ضائع نہ کر لو جیسے منافق ریا کاری سے صدقے کا ثواب ضائع کر لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کے ثواب کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس طرح منافق اور ریا کار کے عمل میں مماثلت ہو جاتی ہے۔

سوال 3: ریا کاری سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ریا کاری سے مراد دکھاوے کے لیے کیا جانے والا عمل ہے جس میں نہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ ہوتا ہے نہ اس سے اجر و ثواب کی امید ہوتی ہے۔ ﴿2﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں سب سے زیادہ شرک سے لاپرواہ ہوں۔ اگر کوئی ایسا عمل کرتا ہے جس کے اندر کسی دوسرے کو میرا سا جھمی قرار دیتا ہے (یعنی خالص میری رضا کے لیے نہیں

کرتا) تو میں اس کو اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔ (مسلم) ﴿3﴾ محمود بن لبید راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے تمہارے متعلق سب سے زیادہ اندیشہ شرک اصغر کا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا: ریا کاری۔ (مسند احمد)

سوال 4: ریا کاری کون کرتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ جس دل کے اندر ایمان کی تازگی نہیں ہوتی وہ چاہتا ہے کہ اپنی نیکی کا اظہار کرے اس طرح وہ دکھاوے کے لیے عمل کر کے ریا کاری کرتا ہے جس میں نہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ ہوتا ہے اور نہ اس سے اجر و ثواب کی امید ہوتی ہے۔ ﴿2﴾ جس شخص کو ایمان کی مٹھاس کا شعور نہیں ہوتا وہ ریا کاری کرتا ہے۔ ﴿3﴾ جس کا دل گناہ اور غلطیوں سے سخت ہوتا ہے اس کا دل نہیں چاہتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مال لگائے اس طرح وہ دکھاوے کے لیے عمل کر کے ریا کاری کرتا ہے۔

سوال 5: ریا کاری سے کیے گئے صدقے کا کیا مقام ہے؟

جواب: ایسا صدقہ صرف مال کا ضیاع ہے جس سے کچھ ہاتھ نہیں آتا، ہاں نیکی برباد اور گناہ لازم ہو جاتا ہے۔ عَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: مَنْ صَلَّى يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ۔ سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ”جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کا صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔“ (مسند احمد، الترغیب والترہیب: حدیث 43)

سوال 6: دنیا میں ریا کار کے لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ ایمان نہیں رکھتا پھر آخرت میں اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہوگا؟

جواب: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ”قیامت کے دن جس کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا وہ ایک شہید ہوگا۔ اسے لایا جائے گا اور اسے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جتوائی جائیں گی۔ وہ انہیں پہچان لے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”تو نے ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے کیا عمل کیا؟“ وہ کہے گا: ”میں نے تیرے راستے میں جہاد کیا یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”تو نے جھوٹ کہا بلکہ تو تو اس لیے لڑتا رہا کہ تجھے بہادر کہا جائے اور تحقیق وہ کہا جا چکا۔“ پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دو یہاں تک کہ اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ دوسرا شخص وہ ہوگا جس نے علم حاصل کیا اور اسے لوگوں کو سکھایا اور قرآن کریم پڑھا اسے لایا جائے گا اور اسے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جتوائی جائیں گی۔ وہ انہیں پہچان لے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”تو نے ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے کیا عمل کیا؟“ وہ کہے گا: ”میں نے علم حاصل کیا، پھر اسے دوسروں کو سکھایا اور تیری رضا کے لیے قرآن مجید پڑھا۔“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”تو نے جھوٹ کہا، تو نے علم اس لیے حاصل کیا کہ تجھے عالم کہا جائے اور قرآن اس لیے پڑھا کہ تجھے قاری کہا جائے سو یہ

کہا جا چکا۔“ پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دو یہاں تک کہ اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ تیسرا وہ شخص ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ نے وسعت کی تھی اور اسے ہر قسم کا مال عطا کیا تھا۔ اسے بھی لایا جائے گا اور اسے بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جتوائی جائیں گی۔ وہ انہیں پہچان لے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”تو نے ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے کیا عمل کیا؟“ وہ کہے گا: ”میں نے تیرے ہر راستے میں جس میں مال خرچ کرنا تجھے پسند ہو، تیری رضا حاصل کرنے کے لیے مال خرچ کیا۔“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”تو نے جھوٹ کہا بلکہ تو نے ایسا اس لیے کیا کہ تجھے سخی کہا جائے سو وہ کہا جا چکا۔“ پھر حکم دیا جائے گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دو یہاں تک کہ اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (صحیح مسلم: 4923)

سوال 7: ﴿فَسَلِّ كَسْبًا عَلَىٰ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ ثَرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَ كَهْ صِلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ وَمِنَّا كَسِبُوا﴾ ”تو اس کی مثال ایک صاف چٹان کی مثال جیسی ہے جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زوردار بارش پڑے تو اس کو ایک سخت چٹان چھوڑ جائے، جو انہوں نے کمایا اس میں سے کسی چیز پر وہ قدرت نہیں رکھیں گے“ ریاکار کے صدقے کی مثال کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿فَسَلِّ كَسْبًا عَلَىٰ صَفْوَانٍ﴾ ”تو اس کی مثال ایک صاف چٹان کی مثال جیسی ہے“ ریاکار کے صدقے کی مثال ایک صاف چٹان کی مثال ہے۔ چٹان سے مراد سنگ دلی ہے، نیت اور جذبے کی خرابی ہے۔ جیسے چٹان پر کچھ اگنا ممکن نہیں ہوتا، ایسے ہی نیت کی خرابی کے ساتھ کوئی نیک عمل پھلتا پھولتا نہیں ہے۔ اس کا نہ دنیا میں کوئی فائدہ ہے نہ آخرت میں۔ ریاکار کا صدقہ دراصل ایک پردہ ہے جو دل کی سختی پر اور نفاق پر ڈالا جاتا ہے تاکہ مومنوں میں شمار ہو سکے اور لوگ اس کی مدح کریں اور اس کا شکر ادا کریں۔ ﴿2﴾ ﴿عَلَيْهِ ثَرَابٌ﴾ ”جس پر کچھ مٹی ہو“ مٹی کی تہہ سے مراد نیکی کی ظاہری شکل ہے۔ ﴿3﴾ ﴿فَأَصَابَهُ وَابِلٌ﴾ ”پھر اس پر زوردار بارش پڑے“ زوردار بارش سے مراد صدقہ ہے۔ ﴿4﴾ ﴿فَتَرَ كَهْ صِلْدًا﴾ ”تو اس کو ایک سخت چٹان چھوڑ جائے“ بارش ہونے پر زمین کو لہلہانا چاہیے لیکن پتھروں پر سے تو بارش مٹی ہی بہا کر لے جاتی ہے کیونکہ زمین کے اندر بارش کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ﴿5﴾ ﴿لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ وَمِنَّا كَسِبُوا﴾ ”جو انہوں نے کمایا اس میں سے کسی چیز پر وہ قدرت نہیں رکھیں گے“ صدقے کے اندر صلاحیت ہے کہ وہ نیکیوں کو نشوونما دے سکتا ہے لیکن اس وقت جب نیت نیک ہو۔ ریاکاری سے کیے گئے صدقے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ جیسے انسان صدقے پر احسان جتلا کر اور دکھ دے کر اجر پانے پر قدرت نہیں رکھتا۔ اسی طرح ریاکاری سے کیا گیا صدقہ بھی صرف مال کا ضیاع ہے جس سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ﴿6﴾ ﴿رَبِّ الْعِزَّتِ كَافِرًا مَّنْ هُوَ﴾ ”وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِن عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ حَبَآءً مَّنثُورًا“ اور ہم ان کے ہر عمل کی طرف آئیں گے جو انہوں نے کوئی بھی کیا تھا تو ہم اسے اڑتی ہوئی خاک بنا دیں گے۔ (الفرقان: 23) ﴿7﴾ ﴿مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِذْ يَبْعَثُ أَعْمَانَهُمْ كَمَا إِذْ أَسْتَدَّتْ بِهَا الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ﴾ جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی طرح ہے جس پر ایک آندھی والے دن میں تند ہوا چل پڑے۔ (ابراہیم: 18)

سوال 8: ﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا“ انہوں نے ان اعمال کو غلط جگہ پر رکھا اور اپنی جیسی مخلوق کے لیے انجام دیا جس کے ہاتھ میں نہ نفع ہے نہ نقصان اور جس رب کی عبادت سے فائدہ ہو سکتا ہے اس کی عبادت سے منہ موڑ لیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دلوں کو ہدایت سے پھیر دیا۔ (تفسیر سعدی)

﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَشِيئًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضَعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِيبْهَا وَابِلٌ فَكُلٌّ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (265)﴾

”اور ان لوگوں کی مثال جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی تلاش میں اور اپنے دلوں میں پختگی پیدا کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال ایک ایسے باغ کی مثال کی طرح ہے جو کسی اونچی جگہ پر ہو اسے زور کی بارش پہنچے تو وہ اپنا پھل دو گنا لائے، پھر اگر اسے زور کی بارش نہ بھی پہنچے تو کچھ شبنم ہی کافی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو خوب دیکھنے والا ہے۔“ (265)

سوال 1: ﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَشِيئًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ﴾ ”اور ان لوگوں کی مثال جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی تلاش میں اور اپنے دلوں میں پختگی پیدا کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں“ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کسی ضرورت مند کی مدد پر کیسے آمادہ کرتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور ان لوگوں کی مثال جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی تلاش میں اور اپنے دلوں میں پختگی پیدا کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں“ اللہ تعالیٰ انسان کو یہ یاد دلاتے ہیں کہ مال تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ ﴿2﴾ رزق کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جس سے چاہتا ہے رزق روک لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کثیر مقدار میں عطا کرتا ہے۔ ﴿3﴾ وہ احساس دلاتا ہے ”یا وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے اگر وہ اپنا رزق روک لے“ (الملک: 21) ایک انسان یہ سوچتا ہے کہ اگر میں نے اللہ تعالیٰ کے دئے ہوئے کو روک لیا تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے روک لے گا، یہ احساس اسے انفاق پر آمادہ کرتا ہے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ اس فضل کے بارے میں عہد بھی لیتے ہیں کہ وہ اس کے دیئے گئے رزق سے بغیر اسراف کیے اپنی ضروریات بھی پوری کریں گے اور زائد از ضرورت مال کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ بھی کریں گے۔ یہ عہد انسان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ﴿5﴾ بخل سے کراہت اور نفرت دلا کر کیونکہ بخیل انسان کی صرف مٹھی بند نہیں ہوتی بلکہ دل بھی نیکیوں کے لیے بند ہو جاتا ہے۔ ﴿6﴾ فرشتوں کی بددعاؤں سے خوف دلا کر کہ ”اے اللہ دینے والوں کو اور دے اور روکنے والے کا پہلا مال بھی ہلاک کر دے۔“ ﴿7﴾ اللہ تعالیٰ انفاق کرنے والوں کی دل جوئی بھی کرتے ہیں جس سے دل جھک جاتے ہیں اور انسانوں کے آپس کے تعلقات بھی اچھے ہو جاتے ہیں۔ ﴿8﴾ اللہ تعالیٰ کے لیے عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی خوشی کے لیے عمل کرے۔ ﴿9﴾ ﴿وَتَشِيئًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ﴾ ”اور اپنے دلوں میں پختگی پیدا کرنے کے لیے“ جو اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کرتا ہے اس کا دل ایمان سے بھرا ہوا ہے۔ ﴿10﴾ دل کو پورا یقین ہے جو خرچ کیا اس کا پورا اجر ملے گا۔ ﴿11﴾ خرچ کرنے سے دل کو اور زیادہ تروتازگی مل رہی

ہے۔ ﴿12﴾ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ رضائے الہی کی خاطر تم جو بھی خرچ کرو گے اس سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمہارا مقام بلند ہوگا۔ حتیٰ کہ وہ لقمہ جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے۔ (صحیح بخاری: 2742) دل کے ثبات و قرار کے لیے یہ دعا پڑھنی چاہئے: يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ ”اے دلوں کے پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھنا۔“ (ترمذی: 3587)

سوال 2: انسان کو کون سی چیز خدا پرستی پر جماتی ہے اور ایمان میں ثابت قدمی عطا کرتی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ انسان جو عمل کرتا ہے اس عمل کے ساتھ وہ اپنی قوت ارادی کو مضبوط کرتا ہے۔ جب انسان وہ عمل کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو اس کا دل اللہ تعالیٰ کی بات پر ایمان کے لیے جمنے لگتا ہے۔ ﴿2﴾ جب انسان آسان حالات میں عمل کرتا ہے یعنی جب (i) دل کی قبولیت، اس کی رضا شامل ہو۔ (ii) مال خرچ کرنے میں آسانی ہو۔ (iii) کوئی دوسری رکاوٹ نہ ہو تو دل کے اندر تھوڑے درجے کی ثابت قدمی آتی ہے۔ ﴿3﴾ جب انسان مشکل حالات میں خرچ کرتا ہے تو وہ اپنے مقصد کے لیے اپنے ارادے کو اور زیادہ پختہ کر لیتا ہے۔

سوال 3: انسان کو کون سی چیز خواہش پرستی پر جماتی ہے؟

جواب: خواہش کو پورا کرنے کے لیے جو عمل کیا جاتا ہے تو دل پھر خواہشات پر جمننا شروع ہو جاتا ہے۔

سوال 4: اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے مشکل راستے کون سے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا مشکل راستہ وہ ہے جس میں خرچ کرنا دنیاوی اعتبار سے بے فائدہ ہو۔ ﴿2﴾ جس کو خرچ کرنے کے لیے دل نہ چاہے اسے اللہ تعالیٰ کے لیے دینا۔ ﴿3﴾ اس انسان کے لیے خرچ کرنا جس سے اچھا معاملہ کرنے پر طبیعت آمادہ نہ ہو۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ جو مجھے محروم کرے میں اسے عطا کروں۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت کے کاموں میں خرچ کرنا۔ ﴿5﴾ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے خرچ کرنا۔

سوال 5: ﴿كَيْفَ جَنَّتٍ وَّ رِبْوَةٍ آصَابَهَا وَايُّهَا وَايُّهَا فَاتَتْ أَكْثَرُ أَكْثَرِهَا زَعْفَرِينَ فَإِنَّ لَهَا مِنْهَا وَايُّهَا فَكَلُّ﴾ ”ان کی مثال ایک ایسے باغ کی مثال کی طرح ہے جو کسی اونچی جگہ پر ہو اسے زور کی بارش پہنچے تو وہ اپنا پھل دوگنا لائے، پھر اگر اسے زور کی بارش نہ بھی پہنچے تو کچھ شبنم ہی کافی ہے“ اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کرنے والے کی مثال ایک باغ کے ساتھ دی گئی ہے، وضاحت کریں؟

جواب: ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے: ﴿1﴾ ﴿كَيْفَ جَنَّتٍ﴾ ”ان کی مثال ایک ایسے باغ کی طرح ہے“ جنت سے مراد ایسا باغ ہے جس میں درخت بے شمار ہیں اور سایہ گھنا ہے۔ جس کے درخت زمین کو چھپا لیتے ہیں اور اس تک دھوپ نہیں پہنچنے دیتے۔ باغ کی زمین کی مٹی گہری ہے یعنی ایمان دل کے اندر تک اترنا ہوا ہے۔ انفاق کرنے والے کی مثال ہے جس کا دل ایک سرسبز باغ کی طرح ہے یعنی دل میں ایمان کی تروتازگی ہے۔ ﴿2﴾ ﴿وَرِبْوَةٍ﴾ ”جو کسی اونچی جگہ پر ہو“ یہ باغ اونچی زمین پر ہے جس کو صبح، دوپہر اور شام سورج کی پوری روشنی حاصل

ہوتی ہے۔ ایسے باغ کے پھل زیادہ اور بہتر ہوتے ہیں۔ یہ ایسی جگہ نہیں جہاں نہ ہوا لگے نہ دھوپ۔ باغ اونچی زمین پر ہے جو زرخیز ہے یعنی دل کا مقام بلند ہے جو ایمان والا ہے، اس کے اندر نیکیاں کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ ﴿3﴾ ﴿أَصَابَهَا وَايْلُ قَاتَتْ أَكْثَرَ أَكْثَرِ﴾ ”اسے زور کی بارش پہنچے تو وہ اپنا پھل دوگنا لائے“ اونچی زمین پر موجود اس باغ پر زمین نم دار ہونے، دوسرے معاون اسباب ہونے اور بکثرت پانی کی موجودگی کی وجہ سے اس باغ سے دوگنا پھل حاصل ہوا۔ ﴿4﴾ ﴿فَإِنْ لَمْ يُمْسِكْهَا وَآيْلُ قَطَلُ﴾ ”پھر اگر اسے زور کی بارش نہ بھی پہنچے تو کچھ شبنم ہی کافی ہے“ یعنی عمدہ زمین کی وجہ سے معمولی بارش ہی کافی ہے۔ باغ پر زور کی بارش سے مراد صدقہ کرنے کی خالص نیت ہے۔ انتہائی جذبہ خیر اور نیک نیتی دل کو سیراب کر دیتے ہیں اسے نئی زندگی ملتی ہے کیونکہ صدقہ دل کو پاک کر دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کا حال ہے کوئی زیادہ خرچ کرے یا کم ہر ایک کو اپنے حالات کے مطابق فائدہ حاصل ہوتا ہے اور ہر ایک کے ثواب میں پوری طرح اضافہ ہوتا ہے۔ (تفسیر سعدی: 1/316) ﴿5﴾ ﴿يَزِيدُ ابْنِ أَبِي حَبِيبٍ بَيَانَ كَرْتِهِ هِيَ كَمَا مَرَّ بِنِ ابْنِ عَبْدِ اللَّهِ مَرْنِي اِبْلِ مَصْرٍ مِّنْ سَمْعِدِ جَانِ وَالْهَيْلِ شَخْصٍ هِيَ۔ جَبَّ بَيْتِ فِي مَسْجِدِ كِي طَرْفِ جَاتِ دِي كِتَانِ كِي آسْتِيْنِ مِيْنِ كِسِي نَهْ كِسِي شَكْلِ مِيْنِ صَدَقَةِ ضَرُورِ هُوْتَا۔ كَرْنِ يَارُوْتِي يَا كَنْدَمِ هُوْتِي بَلَكَمِ مِيْنِ نَهْ اَنْهِيْنِ يِيَا زَلْ جَاتِ بِي دِي كَا۔ مِيْنِ اَنْ سَهْتَا: اِهْ اِبُو الْخَيْرِ! يِهْ تِهَارِ كِيْرُوْنِ كُو بَدُو دَارِ كَرْدِ كَا۔ وَهْ كِهْتِهْ: اِهْ اِبْنِ اَبِي حَبِيبٍ! مَجْهْ كِهْرِ مِيْنِ صَدَقَةِ كِهْ لِيَهْ اِسْ كِهْ عِلَاوَهْ كُوْتِي اَوْرِ چِيْزِ نِهِيْنِ مَلْ سَكِي۔ مَجْهْ اِيَكِ صَحَابِي نَهْ حَدِيْثِ بِيَانِ كِي هِيَهْ كِهْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَهْ فَرْمَا يَا: ”قِيَامَتِ كِهْ دِنِ مَوْمِنِ كَا سَا يِهْ اِسْ كَا صَدَقَهْ هُو كَا۔“ (صحیح ابن خزیمہ: 4/95، مسند احمد: 5/411) ﴿6﴾ ﴿سَيِّدِنَا عَقِبَةَ بِنِ عَامِرِ النَّخَعِيِّ كَا بِيَانِ هِيَهْ كِهْ مِيْنِ نَهْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كُو فَرْمَاتِهْ هُو تَهْ سَنَا: ”جَبَّ تَكْ لُو كُوْنِ كِهْ دَرْمِيَانِ فَيَصْلُهْ نِهِيْنِ كَرْدِيَا جَا تَهْ كَا هَرِ شَخْصٍ اِسْ پَنِي صَدَقَةِ كِهْ سَا تَهْ تَلَهْ رَهْ كَا۔“ (صحیح ابن حبان: 5/132، مستدرک حاکم: 1/416)

سوال 6: ﴿أَصَابَهَا وَايْلُ قَاتَتْ أَكْثَرَ أَكْثَرِ﴾ ”اسے زور کی بارش پہنچے تو وہ اپنا پھل دوگنا لائے“ زور کی بارش پہنچے تو وہ اپنا پھل دوگنا لائے، وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اس بندے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے مضبوط ہو جاتا ہے۔ ﴿2﴾ اس بندے کا مال بھی پاک ہو جاتا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ اس کے مال میں برکت بھی ڈالتے ہیں۔ ﴿4﴾ امت مسلمہ کی اجتماعی زندگی میں بھی پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ ﴿5﴾ اجتماعی رابطے بڑھتے ہیں۔ ﴿6﴾ آخرت کی کامیابی بھی ملتی ہے۔

سوال 7: ﴿فَإِنْ لَمْ يُمْسِكْهَا وَآيْلُ قَطَلُ﴾ ”پھر اگر اسے زور کی بارش نہ بھی پہنچے تو کچھ شبنم ہی کافی ہے“ شبنم سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ شبنم سے مراد ایسا صدقہ ہے جس میں نیکی کے جذبے کی زیادہ شدت نہ ہو۔ ﴿2﴾ مٹی میں اگر پہلے سے نئی موجود ہو یعنی دل میں ایمان کی حرارت موجود ہو تو جذبہ خیر کی زیادہ شدت نہ بھی ہو تب بھی پھل اگتا ہے یعنی انسان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

سوال 8: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ ”اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو خوب دیکھنے والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو خوب دیکھنے والا ہے“ کہ اللہ تعالیٰ نیتوں سے بھی باخبر ہے اور اعمال کو بھی دیکھتا ہے اس لیے وہ اعمال کی مکمل جزا دے گا۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے ریاکاری سے ڈرا کر اخلاص کی ترغیب دلائی ہے۔

سوال 9: تیسری مثال میں صدقے کو ایک باغ سے تشبیہ دی گئی ہے، وضاحت کریں؟

جواب: صدقہ ایک باغ ہے۔ یہ نیکیوں اور اعمال صالحہ کا سدہا بہار باغ ہے۔ انسان صدقہ کرتا ہے تو اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ یہ باغ نہروں سے سیراب ہے، یعنی مسلسل قلب مومن میں صدقہ کرنے کی وجہ سے ایمان کو پانی مل رہا ہے۔ کھجوروں، انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا پھل صدقے کے اثرات ہیں۔ صدقے کی وجہ سے مومن کے اخلاق اور اعمال میں جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ اعمال صالحہ صدقے کے پھل ہیں۔ صدقہ لینے والے کے لیے بھی اور دینے والے کے لیے بھی فائدہ دینے والا ہے۔ صدقہ پورے معاشرے کے لیے برکتوں والا ہے، انفرادی اور اجتماعی ترقی کا باعث ہے۔

﴿أَيُّدًا أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ خَيْبٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَةٌ ضِعْفًا ۖ فَأَصَابَهَا إِعْصَابٌ فِيهِ نُارٌ فَأُحْتَرِقَتْ ۖ كَذَلِكَ يَبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ﴾ (266)

”کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں اس کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل ہوں اور اس تک بڑھا پا آئینچے؟ اور اس کے کمزور بچے ہوں، پھر اس کو ایسا بگولا آئینچے جس میں آگ بھی ہو تو وہ جل جائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کھول کر آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔“ (266)

سوال 1: ﴿أَيُّدًا أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ خَيْبٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَةٌ ضِعْفًا ۖ فَأَصَابَهَا إِعْصَابٌ فِيهِ نُارٌ فَأُحْتَرِقَتْ ۖ كَذَلِكَ يَبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ﴾ ”کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں اس کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل ہوں اور اس تک بڑھا پا آئینچے؟ اور اس کے کمزور بچے ہوں، پھر اس کو ایسا بگولا آئینچے جس میں آگ بھی ہو تو وہ جل جائے“ اس مثال کی وضاحت کریں؟

جواب: عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ ایک دن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے اصحاب سے دریافت کیا کہ آپ لوگ جانتے ہو یہ آیت کس سلسلے میں نازل ہوئی ہے؟ ”کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا ایک باغ ہو؟“ سب نے کہا کہ اللہ تعالیٰ زیادہ جاننے والا ہے۔ یہ سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بہت خفا ہو گئے اور کہا، صاف جواب دیں کہ آپ لوگوں کو اس سلسلے میں کچھ معلوم ہے یا نہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عرض کیا: ”امیر المؤمنین! میرے دل میں ایک بات آتی ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”بیٹے! کہو اور اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھو۔“ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ اس میں عمل کی مثال بیان کی گئی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیسے عمل کی؟ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ عمل کی۔ سیدنا

عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ”یہ ایک مال دار شخص کی مثال ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں نیک عمل کرتا رہتا ہے پھر اللہ تعالیٰ شیطان کو اس پر غالب کر دیتا ہے، وہ گناہوں میں مصروف ہو جاتا ہے اور اس کے اگلے نیک اعمال سب غارت ہو جاتے ہیں۔“ (صحیح بخاری کتاب التفسیر: 4538)

سوال 2: ﴿فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ﴾ ”پھر اس کو ایسا بگولا آ پہنچے جس میں آگ بھی ہو تو وہ جل جائے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: اعصار اس تیز ہوا کو کہتے ہیں جو گول گھومتی اور اوپر کو بلند ہوتی ہے یعنی بگولہ۔ اس بگولے میں آگ تھی جس سے باغ جل گیا۔ یہ حادثہ شدید غم کا باعث ہے۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے نیک عمل کرتا ہے تو اس کے اعمال کھیتی اور بیجوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے اعمال کے صلے میں اسے باغ مل جاتا ہے اور نیکیوں کو ضائع کرنے والے اعمال اس بگولے کی طرح ہیں جس میں آگ ہے۔

سوال 3: ﴿كُلُّ لَيْكٍ يَبِينُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ ”اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کھول کر آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو“ اللہ تعالیٰ نے صدقہ کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے کیسے توجہ دلائی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے نیکیوں کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے باغ کی مثال دی ہے جو بگولے کی وجہ سے راکھ ہو گیا اور اب دنیا سے جاتے ہوئے وہ نیک اعمال کرنے کے قابل نہیں رہ گیا۔ ﴿2﴾ بندہ اپنے اعمال کا سب سے زیادہ محتاج موت کے وقت ہوتا ہے کیونکہ اس وقت وہ عمل نہیں کر سکتا اور جن اعمال سے فائدے کی امید ہوتی ہے وہ جل کر راکھ ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ وہ صورت حال ہے جس کے بارے میں رب العزت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی کھلی آیات پر غور و فکر کرو تا کہ نقصان سے بچ جاؤ۔

رکوع نمبر 5

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ مِنْ حَيْثُ وَجَّهْتُمْ وَابْتَغُوا الْوَسِيلَةَ إِلَيْهِ مِنْ حَيْثُ وَجَّهْتُمْ وَلَا تَبْتَغُوا السَّبِيلَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ

وَلَسْتُمْ بِأَخْذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ ۗ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (267)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم نے کمائی ہیں اور ان میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہیں اور اس میں سے جو تم خرچ کرتے ہو گندی چیز کا ارادہ نہ کرو حالانکہ تم خود ہی اس کو لینے والے نہیں ہو مگر یہ کہ تم اس کے بارے میں آنکھیں بند کر لو اور جان لو یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا بے پروا، بے حد خوبیوں والا ہے۔“ (267)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول بتائیں؟

جواب: سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ کھجور پکنے کے زمانے میں لوگ مسجد نبوی میں دو عمودوں کے درمیان رسی سے کھجور کے گچھے لٹکا دیتے تاکہ غریب مہاجرین کھایا کریں۔ بعض لوگ ان کچھوں میں رسی لٹکا دیتے تاکہ

گچھے ملا دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا جائز ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی تنبیہ فرمائی کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ (ترمذی: 2987)

سوال 2: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ﴾ ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! خرچ کرو ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں اور ان میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ مَا كَسَبْتُمْ﴾ ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! خرچ کرو ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں“ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو حکم دیا ہے کہ اس نے تمہیں کمانے کی توفیق دی ہے تو جو تم نے کمایا اس سے کچھ پاک مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرو۔ ﴿2﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: اپنے پاک اموال میں سے صدقہ کرو۔ (الدر المنثور: 611/1) ﴿3﴾ صدقے کی قبولیت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ حلال اور پاک کمائی میں سے ہو چاہے اس کا ذریعہ کوئی بھی ہو یعنی تجارت، زراعت یا صنعت وغیرہ۔ ﴿4﴾ ﴿وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ﴾ ”اور ان میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہیں“ یعنی پھل، اجناس اور معدنیات وغیرہ میں سے کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو۔

سوال 3: دنیا میں انسان کے مال خرچ کرنے کی کون سی صورتیں ہیں؟

جواب: مال خرچ کرنے کی دو صورتیں ہیں: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے میں خرچ کیا جائے۔ ﴿2﴾ شیطان کے بتائے ہوئے راستے میں خرچ کیا جائے۔

سوال 4: اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے میں خرچ کرنے کا طریقہ کار کیا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے سب سے پہلے اپنی فکر کی اصلاح ضروری ہے۔ ﴿1﴾ مومن کو چاہئے کہ وہ مال کو اپنی ذاتی چیز نہ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ کی چیز سمجھے۔ ﴿2﴾ اپنی کمائی میں سے حقیقی ضرورت کے مطابق لے لے۔ ﴿3﴾ حقیقی ضرورت پوری کرنے کے بعد جو کچھ ہے اسے بلند مقاصد میں لگا دے۔ اللہ تعالیٰ کے کمزور بندوں کو دینا اور اس کے دین کی ضرورتوں میں خرچ کرنا انفاق کے بلند مقاصد میں سے ہے۔ ﴿4﴾ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ بنو تمیم قبیلے کا ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس بہت سامان و دولت اور اہل و عیال ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟ اور کیسے خرچ کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو اپنے مال سے زکوٰۃ دے، تجھے پاک کر دے گی اور اپنے رشتے داروں سے تعلق قائم رکھ، مسکین، یتیم اور سائل کا حق پہچان۔ (مسند احمد: 136/3)

سوال 5: کون سی سوچ اللہ تعالیٰ کے کمزور بندوں پر مال خرچ کرواتی ہے؟

جواب: یہ سوچ اللہ تعالیٰ کے کمزور بندوں پر مال خرچ کرواتی ہے کہ ایک دن آنے والا ہے جب میں کمزور ہوں گا اور خالی دامن ہو کر اللہ تعالیٰ

کے سامنے حاضر ہوں گا۔ اس دن مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ضرورت ہوگی۔ آج میں کمزوروں پر خرچ کر کے کل اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار ہو سکتا ہوں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ جب بندے صبح کو اٹھتے ہیں دو فرشتے آسمان سے نہ اترتے ہوں، ایک کہتا ہے کہ اے اللہ خرچ کرنے والوں کو اور زیادہ دے اور دوسرا کہتا ہے کہ اے اللہ ممسک اور بخیل کے مال کو تلف کر دے۔ (صحیح بخاری: 1442)

سوال 6: کون سی سوچ دین کی ضرورتوں میں مال خرچ کرواتی ہے؟

جواب: یہ سوچ دین کی ضرورتوں میں مال خرچ کرواتی ہے کہ دین اللہ تعالیٰ کا ہے اور دین کو پھیلانا اس کا حکم ہے۔ چونکہ دین کو پھیلانے کا مشن اللہ تعالیٰ کا مشن ہے اس لیے یہ میرا مشن ہے۔ میں نے دین کی ضروریات کے لیے مال لگایا تو تب ہی میں اللہ تعالیٰ کے مشن میں شریک ہوں گا۔ میں اپنے مال کو اللہ تعالیٰ کے مال میں شامل کر دوں تو یہ اس کے بڑے خزانے میں مل کر زیادہ ہو جائے گا۔

سوال 7: ﴿وَلَا تَبْسُوا السُّبُوتَ مِنْهُ مُتَّقُونَ﴾ اور اس میں سے جو تم خرچ کرتے ہو گندی چیز کا ارادہ نہ کرو، اس آیت سے رسول اللہ ﷺ کے دور کے حالات کا جو نقشہ سامنے آتا ہے، اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اور اس میں سے جو تم خرچ کرتے ہو گندی چیز کا ارادہ نہ کرو، خبیث سے مراد ردی اور نکمی چیزیں ہیں، ان کا ارادہ نہ کرو۔ ﴿2﴾ سیدنا عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مومن کی کمائی کبھی خبیث نہیں ہوتی مراد یہ ہے کہ بے کار چیز صدقہ میں نہ دو۔ ﴿3﴾ اس آیت کے حوالے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں بھی ایسے افراد موجود تھے جن کی تربیت کی ضرورت تھی، جنہیں بلندی کے راستے پر ڈالنے کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت ہر وقت، ہر دور میں موجود رہتی ہے۔ اس لیے کہ افراد کے مزاج ایک سے نہیں ہوتے، ان کی تربیت ایک سی نہیں ہوتی، ان کی طلب ایک جیسی نہیں ہوتی۔

سوال 8: ﴿وَلَسْتُمْ بِأَخِيَّةٍ إِلَّا أَنْ تُعْضُوا فِيهِ﴾ حالانکہ تم خود ہی اس کو لینے والے نہیں ہو مگر یہ کہ تم اس کے بارے میں آنکھیں بند کر لو، کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ یعنی تم خود اسے لینا پسند نہیں کرتے۔ ﴿2﴾ سیدنا براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب تمہارا حق کسی پر ہو اور وہ تمہیں وہ چیز دے جو بے قدر و قیمت ہو تم اسے نہ لو گے مگر اس وقت جب تمہیں اپنے حق کی بربادی دکھائی دیتی ہو تو تم چشم پوشی کر کے اسی کو لے لو گے۔ ﴿3﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ تم نے کسی کو اچھا مال دیا اور ادائیگی کے وقت وہ ناقص مال لے کر آیا تو تم ہرگز نہ لو گے اور اگر لو گے بھی تو اس کی قیمت گھٹا کر تو تم جس چیز کو اپنے حق میں لینا پسند نہیں کرتے اسے اللہ تعالیٰ کے حق کے عوض کیوں دیتے ہو؟ پس بہترین اور مرغوب مال اس کی راہ میں خرچ کرو۔ (تفسیر ابن کثیر: 365/1) ﴿4﴾ اس آیت میں انفاق کے معاملے میں مومنوں کے لیے نہایت عمدہ سبق ہے کہ جس چیز کو خود لینا پسند نہیں کرتے ہو اسے دینے سے بھی گریز نہ کرو۔

سوال 9: انفاق (صدقہ کرنے) کے حکم کا تقاضا کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ حلال اور پاکیزہ طریقے سے کمائے گئے مال کو خرچ کیا جائے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہترین مال خرچ کیا جائے۔ ﴿3﴾ تمام اموال میں سے خرچ کیا جائے، زرعی اجناس ہوں یا معدنیات۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ردی اور گھٹیا اشیاء کے خرچ کا ارادہ بھی نہ کیا جائے جن میں خود ان اشیاء کے مالک کی دل چسپی نہیں رہتی۔ ﴿5﴾ سیدنا عبداللہ بن معاویہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تین کام ایسے ہیں جو شخص انہیں سرانجام دے وہ ایمان کی حلاوت سے آشنا ہو جائے: جو شخص یہ یقین رکھتے ہوئے اکیلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اپنے مال کی زکوٰۃ ہر سال دل کی خوشی اور فراخ دلی سے ادا کرے، بوڑھی خارش زدہ بیمار اور گھٹیا (اوٹنی، بکری یا گائے وغیرہ) زکوٰۃ میں نہ دے بلکہ درمیانہ مال دے۔ اللہ تعالیٰ نے تم سے نہ تو بہترین مال مانگا ہے اور نہ برامال دینے کا حکم دیا ہے۔ (سنن ابوداؤد: 1582)

سوال 10: ﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَنِّي حَيُّ﴾ اور جان لو یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا بے پروا، بے حد خوبیوں والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور جان لو یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا بے پروا، بے حد خوبیوں والا ہے“ اللہ تعالیٰ اس بات سے بڑا بے پروا ہے کہ کوئی اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے یا نہیں۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اغماض برتنے سے جو کہ محتاج ہے اپنے غمی ہونے کا شعور دلایا ہے کہ جس آقا سے تم سب کچھ لیتے ہو اور وہ تمہیں دیتا ہے اور لیتا کچھ نہیں۔ اسے تمہارے مال کی ضرورت نہیں تو بے پروا، بے حد خوبیوں والا ہے۔ ہاں اس صدقے کی تمہیں ضرورت ہے اس لئے اپنی ضروریات کا خیال کر لو۔ یہ دوزخ سے بچانے کے لئے ڈھال ہے، تمہارے لئے سایہ بنے گا۔ جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہ اپنے فائدے کے لیے خرچ کرتا ہے لہذا مناسب یہی ہے کہ بہترین خرچ کرو اور خوش دلی سے کرو اور اپنے دشمن شیطان کی پیروی نہ کرو جو تمہیں بخل کا حکم دیتا ہے اور ڈراتا ہے کہ خرچ کرو گے تو فلاں ہو جاؤ گے۔ یہ اس کا دھوکہ ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ حمید ”بے حد خوبیوں والا ہے“ وہ اپنی ذات میں آپ محمود ہے، اپنی ذات میں خود قابل تعریف ہے، حمد کا مالک ہے اس لئے اسے کسی کی حمد سے، کسی کے اعترافِ نعمت سے فرق نہیں پڑتا۔ وہ پاکیزہ چیزوں پر اچھی جزا دیتا ہے۔

سوال 11: اللہ تعالیٰ کی صفات الغنی اور الحمید کا انسان پر کیا اثر ہوتا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی صفات الغنی اور الحمید سے مومن کو اپنے برے تصورات کا احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جان لیا کہ ﴿1﴾ مجھے اللہ تعالیٰ کے اجر کا پورا یقین نہیں۔ ﴿2﴾ مجھے تنگ دستی کا خوف ہے جو کبھی اللہ تعالیٰ سے تعلق والوں کو لاحق نہیں ہوتا۔ ﴿3﴾ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ نہیں۔ ﴿4﴾ مومن کو یہ احساس ہوتا ہے کہ میرے اندر یہ تصورات جگانے والی قوت شیطانی قوت ہے۔ ﴿5﴾ مومن یہ سوچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فیاض ہے کیسے ممکن ہے کہ وہ برے اخلاق والے سے محبت کرے؟ اس طرح انسان اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے کے لیے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرتا ہے اور برائی کو دور کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔

﴿الشَّيْطَانُ يُعِدُّ كُمْ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ ۗ وَاللَّهُ يُعِدُّ كُمْ مَغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ (268)

”شیطان تمہیں مفلسی کا خوف دلاتا ہے اور تمہیں شرم ناک بخل کا حکم دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی طرف سے بخشش اور فضل کا وعدہ

دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔“ (268)

سوال 1: ﴿الشَّيْطَانُ يُعِدُّ كُمْ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ﴾ ”شیطان تمہیں مفلسی کا خوف دلاتا ہے اور تمہیں شرم ناک بخل کا حکم دیتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ شیطان دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ خرچ کرو گے تو فقیر ہو جاؤ گے، اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے۔ اس وجہ سے دل کے اندر حرص اور بخل پیدا ہوتا ہے۔ شیطان نیکی کے جذبوں پر بند باندھ دیتا ہے۔ ﴿2﴾ شیطان نیک کام سے روک کر بے حیائی اور بدکاریوں کی ترغیب دلاتا ہے۔ گناہوں، نافرمانیوں، حرام کاموں اور حق کی مخالفت پر اکساتا ہے۔ ﴿3﴾ شیطان نیکی کے کام میں خرچ کرتے ہوئے ڈراتا ہے کہ ابھی تمہیں اس کی ضرورت ہے۔ ﴿4﴾ نیکی کے کام میں خرچ کرتے ہوئے شیطان انسان کو لمبی امیدیں دلاتا رہتا ہے۔ ﴿5﴾ نبی ﷺ نے فرمایا: ”شیطان ایک چوکا مارتا ہے اور ایک توفیق کی رہبری فرشتہ کرتا ہے۔ شیطان شرارت پر آمادہ کرتا ہے، حق جھٹلانے پر آمادہ کرتا ہے اور فرشتہ نیکی پر اور حق کی تصدیق پر آمادہ کرتا ہے۔ جس کے دل میں ایسا خیال آئے وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور جان لے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جس کے دل میں وسوسہ پیدا ہو وہ اعوذ باللہ پڑھے۔“ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (ترمذی: 219, 220/5) ﴿6﴾ شیطان الْفَحْشَاءِ کا یعنی شرم ناک بخل کا حکم دیتا ہے۔ عربی زبان میں الْفَحْشَاءِ ہر اس نافرمانی کے کام کو کہتے ہیں جس میں انسان حد سے باہر نکل جائے۔ اس لفظ کا زیادہ تر استعمال بے حیائی کے کاموں پر ہوتا ہے لیکن یہ لفظ عام ہے۔ مثلاً تنگ دستی کے خوف کی وجہ سے بچیوں کو زندہ دفن کر دینا، زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کے لیے سود کھانا، نمود و نمائش کے کاموں کے لیے خرچ کرنا، یہ خوف کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا تو فقیر ہو جائیں گے۔ ﴿7﴾ الْفَحْشَاءِ سے مراد ادائیگی زکوٰۃ و صدقات میں بخل ہے۔ ﴿8﴾ شیطان کا حکم خیر خواہی کا نہیں، دھوکہ دہی کا ہے۔ اس لیے اس کا نہیں اپنے رب کا حکم مانو۔ اس نے واضح فرمایا ہے: ﴿إِنَّمَا يَدْعُوا حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ یقیناً وہ اپنے گروہ کو اس لیے بلاتا ہے تاکہ وہ بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں سے ہو جائیں۔ (فاطر: 6)

سوال 2: ﴿وَاللَّهُ يُعِدُّ كُمْ مَغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا﴾ ”اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی طرف سے بخشش اور فضل کا وعدہ دیتا ہے“ اللہ تعالیٰ اپنی مغفرت (بخشش) اور فضل کا وعدہ دیتے ہیں، اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی طرف سے بخشش اور فضل کا وعدہ دیتا ہے“ اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے کہ تمہارے لیے آسانی ہو۔ وہ بخشش اور اپنے فضل کا وعدہ دیتا ہے۔ ﴿2﴾ آخرت کے لیے معافی کا ذکر پہلے کیا گیا ہے کیونکہ پہلے مغفرت

(بخشش) ہوتی ہے، فضل بعد میں ہوتا ہے۔ فضل سے مراد رزق کی کشادگی ہے یعنی انفاق فی سبیل اللہ کی دنیا میں جزا رزق کی کشادگی اور دلوں کی خوشی کی صورت میں سامنے آتی ہے اور آخرت کی بھلائی قبر میں راحت اور قیامت کے دن کے ثواب کی صورت میں ملے گی۔ ﴿3﴾ شیطان کی دھمکی کے مقابلے میں اللہ پاک کا فرمان ہے کہ صدقہ کی وجہ سے گناہ معاف کر دوں گا اور ابلیس کی جانب سے فقیری کی دھمکی پر یقین نہ رکھو کیونکہ مجھ سے زیادہ فضل والا کوئی نہیں جیسا کہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا آتَيْنَاكَ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ﴾ اور جو تم خرچ کرتے ہو پس وہی اس کا بدلہ بھی دیتا ہے۔ (سبا: 39)

سوال 3: ﴿وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا ہے، سب کچھ جاننے والا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا ہے، وہ اپنی وسعت سے، فراخ دستی سے عطا کرتا ہے۔ اس نے اپنے فضل کے وعدے سے اپنے واسع ہونے کا شعور دلایا ہے۔ ﴿2﴾ ﴿اللَّهُ تَعَالَىٰ عَلِيمٌ﴾ ”اللہ تعالیٰ علیم ہے“ کم ہو یا زیادہ، خفیہ ہو یا ظاہر اپنے فضل سے اس کا بدلہ دے گا۔ اس نے مغفرت کے وعدے سے اپنے علیم ہونے کا شعور دلایا ہے کہ اگرچہ وہ تمہارے گناہوں کا حساب کتاب رکھتا ہے، علیم ہے لیکن وہ وسیع رحمت والا ہے، علیم ہونے کے باوجود بخش دیتا ہے۔ ﴿3﴾ ﴿اللَّهُ تَعَالَىٰ انْسَانُونَ﴾ کے سارے حالات سے واقف ہے۔ اس لیے کہ وہ ان کے خلیجانات، رجحانات اور میلانات کو توازن اور اعتدال میں لانے کے لیے حکمت عطا فرماتا ہے تاکہ انسان مقصد، سبب اور نتیجے کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلے کریں۔

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَكْتُمُونَ إِلَّا الْآلِئَابَ﴾ (269)

”وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت عطا کی گئی یقیناً اس کو بہت بھلائی دے دی گئی اور عقل مند ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔“ (269)

سوال 1: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ﴾ ”وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے“ حکمت سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے عظیم کتاب نازل فرمائی ہے جس میں بڑی حکمتیں ہیں۔ اس پر عمل کرنے کی توفیق اس کو ملتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہو۔ ﴿2﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حکمت سے قرآن کی سمجھ مراد ہے۔ ﴿3﴾ مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے مراد قرآن اور فقہ ہے۔ ﴿4﴾ سیدنا امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک حکمت تفقہ فی الدین اور اس چیز کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے دلوں میں ڈال دیتا ہے۔ ﴿5﴾ صحیح بصیرت، صحیح قوت فیصلہ اور وہ سمجھ بوجھ جس کی وجہ سے انسان بھلے برے کو پہچان سکے حکمت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رأس الحكمة مخافة الله ”حکمت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے۔“ (رحمة للعالمین) ﴿6﴾ حکمت سے مراد نفع مند علم، عمل صالح اور شریعت کے اسرار اور حکمتوں سے واقفیت ہے۔ (تفسیر سعدی: 320/1)

سوال 2: ﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ ”اور جس کو حکمت عطا کی گئی یقیناً اس کو بہت بھلائی دے دی گئی“ اس کی

وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ جسے اللہ تعالیٰ نفع مند علم، عمل صالح کی توفیق اور شریعت کے اسرار اور حکمتوں سے واقفیت دے دیں تو اس سے بڑھ کر کیا بھلائی ہوگی کہ دنیا و آخرت کی ناکامیوں سے بچ کر دنیا و آخرت کی کامیابی نصیب ہو جائے۔ یہ نعمت اللہ تعالیٰ خاص بندوں کو عطا فرماتے ہیں۔ یہ انبیاء کا ورثہ ہے۔ ﴿2﴾ حکمت و دانائی اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں عطا کرتے ہیں۔ ﴿3﴾ بندے کو کمال صرف حکمت سے حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ کمال نام ہے علمی اور عملی قوت کے کامل ہونے کا۔ علمی قوت تو حق کی معرفت سے اور اس کے مقصود کی معرفت سے کامل ہوتی ہے اور عملی قوت نیکی کرنے اور برائی سے اجتناب کرنے سے مکمل ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں بندہ صحیح قول اور صحیح عمل کا حامل ہو سکتا ہے اور اپنی ذات کے بارے میں نیز دوسروں کے بارے میں ہر حکم کو اس کے صحیح مقام پر رکھ سکتا ہے۔ اس کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی فطرت میں یہ رکھ دیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں، بھلائی سے محبت رکھیں، حق کے طالب ہوں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسول مبعوث فرمائے کہ لوگوں کو ان کی عقل و فطرت میں جڑیں رکھنے والی ان اشیاء کی یاد دہانی کرائیں اور جو تفصیلات لوگوں کو معلوم نہیں وہ بیان فرمائیں۔ پھر لوگ دو قسموں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جنہوں نے انبیاء کی دعوت کو قبول کیا، تو انہیں اپنے فائدے کی باتیں یاد ہو گئیں۔ انہوں نے اس پر عمل کیا اور انہیں اپنے نقصان کی باتیں معلوم ہو گئیں تو وہ ان سے بچ گئے۔ یہ لوگ کامل عقل و فہم کے مالک ہیں۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے انبیاء کی دعوت قبول نہیں کی بلکہ ان کی فطرت میں جو خرابی پیدا ہو گئی تھی اس کے مطابق عمل کیا۔ یہ لوگ عقل والے نہیں ہیں۔ (تفسیر سعدی: 1/321, 320) ﴿4﴾ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ خطبہ میں فرما رہے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ ”جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرے اسے دین کی سمجھ عنایت فرما دیتا ہے۔“ (صحیح بخاری: 71)

سوال 3: ﴿وَمَا يَكْفُرُ الْكُفْرَ الْأُولَىٰ﴾ اور عقل مند ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ عقل مند وہ ہیں جنہوں نے انبیاء پر یقین کیا اور ان کے ذریعے اپنے نفع اور فائدے کی باتیں انہوں نے یاد کر لیں اور ان پر عمل کیا۔ انبیاء کی تعلیمات سے عقل والوں کو نقصان دینے والی باتوں کا علم ہو گیا تو وہ ان سے بچ گئے۔ حقیقت یہ ہے عقل والے ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔ ﴿2﴾ عقل والے ہی واقعات سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ ﴿3﴾ عقل والے ہی غور و فکر کر کے برے انجام سے بچ سکتے ہیں۔ ﴿4﴾ عقل والے ہی دوسروں کے حالات سے اپنے لئے سبق حاصل کرتے ہیں اس لئے وہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ ﴿5﴾ عقل والے بے مقصد اور بے ولعب والی زندگی اختیار نہیں کرتے۔

﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ إِلَّا اللَّهُ يَعْلَمُهَا ۗ وَاللَّظَلِمِينَ مِنْ أَنْصَابٍ﴾ (270)

”اور جو بھی تم خرچ کرو، کوئی خرچ، یا جو بھی نذر مانو، کوئی نذر تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔“ (270)

سوال 1: ﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ﴾ ”اور جو بھی تم خرچ کرو کوئی خرچ“ اس نفقہ ”خرچ“ کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے؟
 جواب: ﴿1﴾ ”اور جو بھی تم خرچ کرو، کوئی خرچ“ اس کا اطلاق عام روزمرہ زندگی میں کیے جانے والے خرچ پر ہوتا ہے۔ ﴿2﴾ اس نفقہ خرچ سے مراد وہ خرچ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، وہ واجب ہو یا مستحب ہر خرچ کا اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرماتے ہیں۔

سوال 2: ﴿أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ﴾ ”یا جو بھی نذر مانو، کوئی نذر“ نذر سے کیا مراد ہے؟
 جواب: ﴿1﴾ نذر وہ چیز ہے جسے عوامی زبان میں ممت ماننا کہتے ہیں، نفقہ میں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ کسی مراد کے پورے ہونے پر اپنے اوپر کوئی ایسی چیز لازم کر لینا ہے جو واجب نہ تھی۔ ﴿2﴾ انسان اپنی کسی مراد کے پورا ہونے کے لیے کسی ایسے خرچ یا خدمت کو اپنے ذمے لازم کر لے جو اس کے لیے فرض نہ ہو۔ ﴿3﴾ آدمی اپنی کسی مراد کے برآنے پر کوئی ایسا نیک کام صدقہ کرنے کا اللہ تعالیٰ سے عہد کرے جو اس کے ذمے فرض نہ ہو۔ (تیسیر القرآن: 220/1)

سوال 3: اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لئے نذر ماننا کیسے شرک ہے؟
 جواب: نذر نماز اور روزے کی طرح عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لئے نذر ماننا اس کی عبادت کرنا ہے جو شرک ہے۔

سوال 4: کون سی نذر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے؟
 جواب: ﴿1﴾ وہ نذر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ ﴿2﴾ جو حلال اور جائز کام کی ہو۔

سوال 5: کون سی نذر منع ہے؟
 جواب: ﴿1﴾ وہ نذر منع ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے ہو (بت یا انسان وغیرہ)۔ ﴿2﴾ جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے راستے میں ہو۔ ﴿3﴾ جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی وجہ سے ہو۔

سوال 6: نذر ماننا کیسا عمل ہے؟
 جواب: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نذر نہ مانا کرو اس لیے کہ نذر تقدیری امور میں کچھ بھی نفع بخش نہیں۔ بس اس سے اتنا ہوتا ہے کہ بخیل کا مال نکل جاتا ہے۔ (صحیح مسلم: 4241)

سوال 7: ﴿فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ﴾ ”تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے“ اس سے کیا مراد ہے؟
 جواب: ﴿1﴾ ”تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے“ اس سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نیتوں کا پورا علم ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ ضمیر کی پوشیدہ خواہشات کو جانتا ہے۔ ﴿3﴾ انسان کی خفیہ حرکات کو بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کس نے خلوص نیت سے عمل کیا ہے اور کس نے

خلوص سے نہیں کیا۔ ﴿5﴾ جو اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کوئی خرچ کرے یا نذر پوری کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو ثواب عطا فرماتا ہے۔

سوال 8: ﴿وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَابٍ﴾ ”اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں“ یہاں ظالم سے کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ یہاں ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جو واجب خرچ نہ کریں یعنی نذر مان کر اسے پورا نہ کریں۔ ﴿2﴾ جو مخلوق کی خوشی کے لیے خرچ کریں یا نذر پوری کریں تو وہ ظالم بن جاتے ہیں۔ ﴿3﴾ جو شخص کسی چیز کو اس کے جائز مقام پر نہیں رکھتا وہ ظالم ہے۔ مخلوق کی خوشی کے لیے عمل کرنے والا اس لیے ظالم بن جاتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی خوشی کے لیے کام کرنا تھا اس نے عمل کو غلط جگہ رکھ دیا۔ ﴿4﴾ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی سخت سزا رکھی ہے کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

﴿إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَبِعَيْنِي ۖ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَُا الْفَقْرَاءَ فَهُوَ حَيْثُ لَكُمْ وَيَكْفُرْ عَنْكُمْ مِنْ سَبَائِكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

حَمِيٓزٌ (271)﴾

”اگر تم صدقات ظاہر کرو تو کیا ہی اچھا ہے اور اگر تم اسے چھپاؤ اور انہیں ضرورت مندوں کو دو تو وہ تمہارے لیے بہت زیادہ بہتر ہے، اور وہ (اللہ تعالیٰ) تمہاری کچھ برائیاں تم سے دور کر دے گا، اور جو بھی تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔“ (271)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟

جواب: سیدنا شعیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تو اپنا آدھا مال رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو کچھ تھا لاکر رکھ دیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو تو چونکہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری کافی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو دیے اور فرمانے لگے: اللہ کی قسم! جس کسی نیکی کے کام کی طرف ہم لپکے ہیں اس میں اے صدیق رضی اللہ عنہ! آپ کو آگے ہی پاتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

سوال 2: ﴿إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَبِعَيْنِي﴾ ”اگر تم صدقات ظاہر کرو تو کیا ہی اچھا ہے“ ظاہر کر کے صدقہ دینا کس صورت میں افضل ہو جاتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ جو صدقہ فرض ہو اس کو اعلانیہ (ظاہر کر کے) دینا افضل ہے۔ ﴿2﴾ ظاہر کر کے صدقہ دینا ایسی صورت میں افضل ہو جاتا ہے جب لوگوں کے لئے صدقہ دینا ترغیب کا باعث بن جائے۔ ایسے مواقع پر اعلانیہ صدقہ فضیلت کا باعث بن جاتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس میں ریا کاری نہ ہو۔

سوال 3: ﴿وَإِنْ تُخِفُوا مَا وَكُنْتُمْ أَهْلًا لَهَا فَقَدْ آءَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ﴾ ” اور اگر تم اسے چھپاؤ اور انہیں ضرورت مندوں کو دو تو وہ تمہارے لیے بہت زیادہ بہتر ہے، چھپا کر ضرورت مندوں کو دینے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: ﴿1﴾ جو صدقہ فرض کے علاوہ ہو اس کا چھپانا زیادہ بہتر ہے، اس طرح انسان ریا کاری سے بچتا ہے۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”خفیہ صدقہ کرنا باری تعالیٰ کے غضب کو بھگادیتا ہے۔“ (طبرانی) ﴿2﴾ ”افضل صدقہ وہ ہے جو پوشیدگی سے کسی حاجت مند کو دے دیا جائے اور مال کی قلت کے باوجود اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔“ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا کہ ایک شخص نے صدقہ کیا اور اسے اس طرح چھپایا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوئی کہ داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اگر تم صدقہ کو ظاہر کر دو تو یہ بھی اچھا ہے اور اگر پوشیدہ طور پر دو اور فقراء کو دو تو یہ بھی تمہارے لیے بہتر ہے اور تمہارے گناہ مٹا دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح خبردار ہے۔“ (صحیح بخاری: باب 13: ﴿3﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”سات قسم کے آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے (عرش کے) سائے میں رکھے گا جس دن اس کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ ان میں سے ایک وہ انسان ہے جو صدقہ کرے اور اسے اس درجہ چھپائے کہ بائیں ہاتھ کو بھی نہ خبر ہو کہ داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔“ (صحیح بخاری: 1423) ﴿4﴾ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو اس نے ہلنا شروع کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اس پر پہاڑ گاڑ دیئے تو وہ ٹھہر گئی۔ فرشتوں نے پہاڑوں کی مضبوطی پر اظہار تعجب کیا اور کہا: ”اے ہمارے رب! کیا تو نے پہاڑوں سے بھی سخت مخلوق پیدا فرمائی ہے؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”ہاں، لوہا، انہوں نے کہا: ”کیا لوہے سے بھی سخت مخلوق پیدا کی ہے؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”آگ“ انہوں نے کہا: ”کیا آگ سے سخت بھی کوئی مخلوق ہے؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”پانی“ انہوں نے کہا: ”کیا پانی سے بھی سخت کوئی مخلوق ہے؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”ہاں، ہوا“ انہوں نے کہا کہ ”کیا ہوا سے سخت بھی کوئی مخلوق ہے؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”آدم کا بیٹا، جب دائیں ہاتھ سے صدقہ کرے اور بائیں ہاتھ سے اسے مخفی رکھے۔“ (ترمذی: 3369) ﴿5﴾ پوشیدہ طور پر صدقہ دینا، ظاہر کر کے دینے سے افضل ہے لیکن آیت میں اشارہ ہے کہ جب صدقات نہ دیے جا رہے ہوں تو اس صورت میں پوشیدہ صدقہ ظاہر کرنے سے افضل نہیں ہے۔ ﴿6﴾ صدقات کو پوشیدہ رکھنے اور ظاہر کرنے کا دار و مدار مصلحت اور فائدے پر ہے۔ اگر ظاہر کرنے سے امید ہو کہ دوسرے لوگ بھی نیک کام کریں گے تو خفیہ صدقے کی نسبت ظاہر کرنا افضل ہے۔ ﴿7﴾ ﴿وَكُنْتُمْ أَهْلًا لَهَا﴾ ” اور انہیں ضرورت مندوں کو دو“ صدقہ ضرورت مندوں کو تلاش کر کے دینا چاہئے۔ زیادہ ضرورت مند کی موجودگی میں کم ضرورت مند کو نہیں دینا چاہئے۔ ﴿8﴾ ﴿فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ﴾ ”تو وہ تمہارے لیے بہت زیادہ بہتر ہے، یعنی صدقہ دینے والے کے لیے صدقہ باعث ثواب ہوگا۔“

سوال 4: ﴿وَيَكْفُرْ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾ ” اور وہ (اللہ تعالیٰ) تمہاری کچھ برائیاں تم سے دور کر دے گا“ صدقہ کیسے برائیوں کو دور کرتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ صدقے کے ذریعے برائیاں دور کر دیتے ہیں اور بندے کو عذاب سے بچا لیتے ہیں۔ ﴿2﴾ صدقہ دینے سے دل کی تنگی دور ہوتی ہے اور مومن بخل سے بچتا ہے۔ ﴿3﴾ صدقہ دینے سے مال کی محبت پر چوٹ پڑتی ہے اس طرح مومن کی حرص میں کمی آتی ہے۔ ﴿4﴾ چھپا کر صدقہ کرنے سے مومن کے نفس کی اصلاح ہوتی ہے اور مومن ریا کاری سے بچتا ہے۔ ﴿5﴾ صدقہ کرنے سے مومن کے نفس کی مسلسل اصلاح ہوتی جاتی ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ اس کے توسط سے اسے گناہوں سے دور کر دیتا ہے۔ ﴿6﴾ رب العزت کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُؤْتِيهِنَّ السَّيِّئَاتِ﴾ بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔ (سورہ: 114) نیکی کا ہر کام برائیوں کو دھو ڈالنے والا ہے۔ ﴿7﴾ نبی ﷺ نے فرمایا: پوشیدگی کا صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو بچھا دیتا ہے۔

سوال 5: ﴿وَاللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الْخَيْرَاتِ﴾ اور جو بھی تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے، کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور جو بھی تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے“ اللہ تعالیٰ نے پوشیدہ صدقے سے اپنے خیر ہونے کا شعور دلایا ہے کہ جس چیز کی باتیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔ ﴿2﴾ تمہارے اعمال اچھے ہوں یا برے، اللہ تعالیٰ ان سے باخبر ہیں۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنے خیر ہونے کا شعور دلا کر پوشیدہ صدقے کی ترغیب دلائی ہے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ کی صفت خیر سے ثابت ہوتا ہے کہ جزا سزا ہوگی۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُنْفِقْهُ إِلَّا جَاهِدًا ۗ

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْتِي الْيَتِيمَ وَأَنْتُمْ لَا تَظْلُمُونَ (272)﴾

”ان کو ہدایت دینا آپ کا ذمہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور خیر میں سے جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ تمہارے ہی لئے ہے اور تم اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب میں خرچ کرتے ہو اور خیر میں سے جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“ (272)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول بتائیں۔

جواب: ﴿1﴾ ابن ابی حاتم میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی ﷺ یہ حکم فرماتے تھے کہ صرف اہل اسلام پر صدقہ کیا جائے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگوں کو ہدایت دینے کی ذمہ داری تمہاری نہیں تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ جس مذہب کے پیروکار تم سے سوال کریں انہیں صدقہ دیا کرو۔ ﴿2﴾ آیت کے شان نزول سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمان غیر مسلم رشتہ داروں پر خرچ کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ بھی صلہ رحمی کرنا اجر کا باعث ہے۔ البتہ زکوٰۃ غیر مسلموں کو نہیں دی جاسکتی۔

سوال 2: ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾ ”ان کو ہدایت دینا آپ کا ذمہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”ان کو ہدایت دینا آپ کا ذمہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے“ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ اے محمد! لوگوں کو ہدایت دینا آپ کا ذمہ نہیں ہے۔ آپ کے ذمے صرف پہنچا دینا ہے۔ دل اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے پاس اختیار نہیں کہ وہ کسی کو ہدایت دے یا گمراہ کر دے۔ ﴿2﴾ ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے جو مخلوق کا خالق ہے۔ وہی دلوں کو موڑ سکتا ہے۔ ﴿3﴾ رسول کا کام پہنچا دینا ہے اس لیے ہدایت کے لیے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کر کے دعائیں کرنی چاہئیں۔ ﴿4﴾ ہدایت اللہ تعالیٰ کا حق ہے لہذا دعوت دینے والے کے پاس کسی انسان سے نفرت کا جواز باقی نہیں رہتا اور نہ ہی کسی کی ضد کی وجہ سے دل تنگ کرنے کا جواز باقی رہتا ہے۔ ﴿5﴾ داعی انتظار کرے گا کہ کب اللہ تعالیٰ دلوں کو اجازت دے اور وہ ہدایت کے راستے پر آئیں اور اپنے رب کو پہچان لیں۔

سوال 3: ﴿وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُفْسِدْكُمْ﴾ ”اور خیر میں سے جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ تمہارے ہی لئے ہے“ کی وضاحت کریں؟
جواب: تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے کم ہو یا زیادہ چاہے یہ مال تم مسلمانوں پر خرچ کرو یا کافروں پر وہ تمہارے ہی لیے ہے یعنی تمہیں اس کا پورا اجر دیا جائے گا۔

سوال 4: انسان جو انفاق کرتا ہے وہ کیسے اس کے کام آتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ دنیا میں انسان بخل، دل کی تنگی اور حرص جیسی بری عادتوں سے بچ جاتا ہے۔ ﴿2﴾ آخرت میں اس کا کئی گنا اجر پاتا ہے۔
سوال 5: ﴿وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ﴾ ”اور تم اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب میں خرچ کرتے ہو“ کون مال کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر خرچ کرتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر وہ مال خرچ کرتا ہے جو دنیا میں بدلہ نہیں پانا چاہتا۔ ﴿2﴾ جو ایسی مدت میں خرچ کرتا ہے جہاں سے واپسی کی امید نہیں ہوتی۔ ﴿3﴾ مومن کے خرچ کی بنیاد ایمان ہوتی ہے۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشی کے لیے خرچ کرتا ہے۔ ﴿4﴾ ایمان لہو و لعلب کے کاموں میں خرچ کرنے سے روکتا ہے۔

سوال 6: ﴿وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْتِكُمْ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ﴾ ”اور خیر میں سے جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور خیر میں سے جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا“ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ تمہارا ہر صدقہ قبول ہے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہیں پورا پورا اجر دے گا۔ ﴿2﴾ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ رضائے الہی کی خاطر تم جو بھی خرچ کرو گے اس سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمہارا مقام بلند ہوگا۔ حتیٰ کہ وہ لقمہ جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے۔ (صحیح بخاری: 2742) ﴿3﴾ ﴿وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ﴾ ”اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا“ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا یعنی

تمہارے گناہوں میں اضافہ نہیں کیا جائے گا اور نیک اعمال میں کمی نہیں کی جائے گی۔

سوال 7: اسلام نے بلا امتیاز مذہب معاشی تعاون اور امداد کے دروازے کھول کر کیسی فضا قائم کی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ایک ایسی فضاء جس میں مذہبی آزادیوں کا اصول متعین ہے۔ ﴿2﴾ اور جہاں جبر و تشدد کا قلع قمع کیا گیا ہے۔ ﴿3﴾ ایک ایسی فضاء جس میں مذہبی رواداری ہے۔ ایک ایسی فضاء جہاں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے غیر مسلموں پر کیے جانے والے خرچ پر بھی اجر کا وعدہ ہے۔ ﴿4﴾ یوں انسانی ہمدردی کی فضا پروان چڑھتی ہے۔

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ صَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعْفُفِ تَعْرِفُهُمْ

بِسَبَائِهِمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِحْقَاقًا وَمَا لِيْكَافِرُوا مِنْ خَيْرِ قَانَ اللَّهُ بِهِ عَلَيْهِمْ (273)﴾

”صدقات ان فقراء کے لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں روکے گئے ہوں، وہ زمین میں سفر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے، ناواقف آدمی سوال سے بچنے کی وجہ سے انہیں مال دار سمجھ بیٹھتا ہے، آپ انہیں ان کے چہرے ہی سے پہچان جائیں گے، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے، اور جو مال میں سے بھی خرچ کرو گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے۔“ (273)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے مال والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنا مال ان فقیروں اور محتاجوں پر خرچ کریں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے، یاد ان رات اس کی بندگی اور حصول علم کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہاں مراد اصحاب صفہ ہیں۔ (تیسیر الرحمن: 156) ﴿2﴾ حافظ ابن کثیر نے کہا: ان سے مراد وہ تمام مہاجرین ہیں جو مدینہ منورہ میں آ کر اقامت پذیر ہو گئے تھے اور تجارت اور حصول مال کے اسباب و ذرائع ان سے منقطع ہو چکے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر: 1/369)

سوال 2: ﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ صَرْبًا فِي الْأَرْضِ﴾ ”صدقات ان فقراء کے لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں روکے گئے ہوں، وہ زمین میں سفر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے“ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی مدت میں سے بڑی مدد کون سی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمایا ہے کہ تمہارے خرچ کے کون لوگ زیادہ مستحق ہیں۔ ان کی چھ صفات بیان فرمائی ہیں۔ ﴿2﴾ ﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ”صدقات ان فقراء کے لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں روکے گئے ہوں“ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی مدت میں سے بڑی مددین کے ان خادموں کی مالی مدد کرنا ہے جو دین کی حفاظت کے کاموں میں مکمل مصروف رہنے کی وجہ سے بے معاش ہو گئے ہوں۔ ﴿3﴾ ﴿لَا يَسْتَطِيعُونَ صَرْبًا فِي الْأَرْضِ﴾ ”وہ زمین میں سفر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے“ جو رزق کی تلاش کے

لیے سفر کے قابل نہ ہوں۔ ﴿4﴾ جیسے ایک کامیاب تاجر کے پاس اپنے بزنس کے علاوہ وقت نہیں ہوتا ایسے ہی ایک کامیاب داعی کے لیے دین کے علاوہ وقت نہیں ہوتا۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ صاحب معاش ان لوگوں کے لیے حصہ نکالیں جو دینی مصروفیات کی وجہ سے اپنی معاشیات فراہم نہ کر سکیں۔

سوال 3: دین کے خادموں کی خدمت کرنا ایک خاموش تقسیم کار ہے، اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ دین کا خادم خود کو اللہ تعالیٰ کے لیے یک سو کرتا ہے۔ نہ وہ کسی انسان سے مانگتا ہے، نہ پانے کا امیدوار ہوتا ہے۔ ﴿2﴾ صاحب معاش یہ سوچتا ہے کہ میرے پاس معاشی وسائل اس قیمت پر آئے ہیں کہ میں دین کی خدمت نہیں کر سکا تو اس کی تلافی ہونی چاہئے اور وہ ایسے کہ میں اپنے مال میں ان بھائیوں کا حصہ لگاؤں جو میری کمی کی تلافی اللہ تعالیٰ کے ہاں کر رہے ہوں۔

سوال 4: دین کے خادموں کے لیے اپنا مال لگانا انسان کو اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا زیادہ مستحق کب بناتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ جب دین کی جدوجہد اس مرحلے میں ہو کہ دین کے نام پر معاشی عہدے نہ ملتے ہوں۔ ﴿2﴾ جب دین کی راہ میں لگنے والا بے روزگار ہو جائے۔ ﴿3﴾ جب دین کے نام پر کیے جانے والے خرچ کی وجہ سے سزا کا ڈر ہو۔ ﴿4﴾ جب دین کے خادموں کو مال دینا ایک غیر اہم طبقے سے رشتہ جوڑنا ہو۔ ﴿5﴾ جب دین کے کاموں پر خرچ کرنا مجلسوں میں قابل تذکرہ نہ ہو اور انسان کی حیثیت اور ناموری میں اضافہ نہ کرتا ہو۔ ﴿6﴾ ایسا خرچ چونکہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہے اس لیے ایسا خرچ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

سوال 5: ﴿يَصْطَلِبُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعْفُفِ﴾ ”ناواقف آدمی سوال سے بچنے کی وجہ سے انہیں مال دار سمجھ بیٹھتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”ناواقف آدمی سوال سے بچنے کی وجہ سے انہیں مال دار سمجھ بیٹھتا ہے“ یعنی ان کی غیرت و خودداری گوارا نہیں کرتی کہ وہ لوگوں سے سوال کریں۔ ناواقفوں کو اس سے گمان یہ گزرتا ہے کہ یہ لوگ خوش حال ہیں، محتاج و مستحق امداد نہیں۔ ﴿2﴾ ﴿التَّعْفُفِ﴾ سے مراد ہے سوال نہ کرنا، سوال کرنے سے بچنا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”مسکین وہ نہیں ہے جسے ایک یاد و کھجور، ایک یاد و لقمے در بدر لیے پھریں بلکہ مسکین وہ ہے جو مانگنے سے بچتا رہے اور اگر تم دلیل چاہو تو (قرآن سے) اس آیت کو پڑھ لو کہ ”وہ لوگوں سے چٹ کر نہیں مانگتے۔“ (صحیح بخاری: 4539)

سوال 6: ﴿تَعْرِفُهُمْ بِسِيَاهُمْ﴾ ”آپ انہیں ان کے چہرے ہی سے پہچان جائیں گے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”آپ انہیں ان کے چہرے ہی سے پہچان جائیں گے“ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہر وقت رہتا تھا، میں خمیری روٹی نہ کھاتا اور نہ عمدہ لباس پہنتا تھا (یعنی میرا وقت علم کے سوا کسی دوسری چیز کے حاصل کرنے میں نہ جاتا) اور نہ میری خدمت کے لیے کوئی فلاں یا فلانی تھی بلکہ میں بھوک کی شدت کی وجہ سے اپنے پیٹ سے پتھر باندھ لیا کرتا۔ بعض وقت میں کسی کو کوئی آیت

اس لیے پڑھ کر اس کا مطلب پوچھتا تھا کہ وہ اپنے گھر لے جا کر مجھے کھانا کھلا دے، حالانکہ مجھے اس آیت کا مطلب معلوم ہوتا تھا۔ مسکینوں کے ساتھ سب سے بہتر سلوک کرنے والے سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔ ہمیں اپنے گھر لے جاتے اور جو کچھ بھی گھر میں موجود ہوتا وہ ہم کو کھلاتے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوتا کہ صرف شہد یا گھی کی کچی ہی نکال کر لاتے اور اسے ہم پھاڑ کر جو کچھ اس میں ہوتا اسے ہی چاٹ لیتے۔ (صحیح بخاری: 3708)

سوال 7: ﴿لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ اِنْفَاكًا﴾ ”وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے“ ﴿1﴾ جو شخص سوال کرے اور اس کے پاس چالیس درہم ہوں تو اس نے الحاف کیا۔ ﴿2﴾ جو شخص لوگوں سے سوال کرتا ہو حالانکہ اس کے پاس پانچ اوقیہ برابر مال موجود ہو تو گویا اس نے اصرار کر کے سوال کیا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”مسکین وہ نہیں ہے جسے ایک یاد بھجور، ایک یاد لقمے در بدر لیے پھریں بلکہ مسکین وہ ہے جو مانگنے سے بچتا رہے اور اگر تم دلیل چاہو تو (قرآن سے) اس آیت کو پڑھ لو کہ ”وہ لوگوں سے چمٹ کر نہیں مانگتے۔“ (صحیح بخاری: 4539)

سوال 8: ﴿وَمَا تَشْفُقُوا مِنْ حَبِيرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾ ”اور جو خیر میں سے بھی تم خرچ کرو گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور جو خیر میں سے بھی تم خرچ کرو گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے“ اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کے لئے اپنے علم ہونے کا شعور دلایا ہے کہ جو تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوگا اور اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع کرنے والا نہیں اس لئے خرچ کرو۔

رکوع نمبر 6

﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ اَمْوَالَهُمْ بِالطَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اُجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ﴾

يَحْزَنُونَ (274)﴾

”جو لوگ اپنے مال رات اور دن، چھپے اور کھلے خرچ کرتے ہیں تو ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔“ (274)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ بغوی نے سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو برداء رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول ان لوگوں کے حق میں ہوا جو جہاد کے لیے گھوڑے پالتے تھے۔ گھوڑوں کو رات دن پوشیدہ اور علانیہ چارہ دیا جاتا تھا۔ (تفسیر الوسيط: 392/1) ﴿2﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ یہ آیت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ ان کے پاس چار درہم تھے۔ انہوں نے اس میں سے ایک رات کو اور ایک دن کے وقت اور ایک پوشیدہ طور پر اور ایک ظاہر کر کے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیے تھے اور ابن منذر رضی اللہ عنہ نے ابن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت

کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ سیدنا عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اور سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی ہے، ان حضرات نے سامان جہاد فراہم کیا تھا۔ (الدر المنثور: 642/1)

سوال 2: ﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً﴾ ”جو لوگ اپنے مال رات اور دن، چھپے اور کھلے خرچ کرتے ہیں“ اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ یہ نیک لوگ دن رات، ہر وقت، کھلے چھپے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے صدقہ کرتے ہیں۔ (تفسیر المیزان: 61/1)

﴿2﴾ نیک لوگ حرام یا مکروہ کاموں میں یا اپنی خواہشات پوری کرنے یا دل کی مرضی کے لیے خرچ نہیں کرتے۔

سوال 3: ﴿سِرًّا﴾ ”چھپے“ چھپا کر نیکیاں کرنے کے انسان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ چھپا کر نیکیاں کرنے سے انسان کے نفس کی مسلسل اصلاح ہوتی ہے۔ ﴿2﴾ بری صفات (حرص، بخل اور ریاکاری) مٹ جاتی ہیں۔ ﴿3﴾ اچھے اخلاق نشوونما پاتے ہیں۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ کے ہاں انسان مقبول ہوتا ہے۔

سوال 4: ﴿فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ”تو ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: یعنی رب رحیم کے پاس دن رات، کھلے چھپے خرچ کرنے والوں کا اجر ہے۔

سوال 5: اس سے کون سا اجر مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ دنیا میں لمبی عمر۔ ﴿2﴾ آخرت میں اچھا انجام۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کی رضامندی۔

سوال 6: اجر کا شعور انسان سے کیا کروالیتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے رات اور دن اور کھلے چھپے خرچ کرنے کے لئے یہ شعور دلایا ہے کہ اس کام کا اجر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جو ضائع ہونے والا نہیں، یقینی طور پر ملنے والا ہے۔ یہ اجر کا شعور انسان سے ہر حال میں مال خرچ کروالیتا ہے۔ ﴿2﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے اور اس کے وعدہ کو سچا سمجھتے ہوئے کوئی گھوڑا راہ خدا میں کام آنے کے لیے پرورش کرتا ہے تو گھوڑے کا کھانا، پینا، لید، پیشاب (سب کچھ) قیامت کے دن اس کی میزان میں رکھا جائے گا (اور نیکیوں کی تول میں آئے گا)۔ (بخاری)

سوال 7: ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ ”اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: جب اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرنے والے غم میں مبتلا ہوں گے تو وہ لوگ جو اپنے مال رات اور دن، چھپے اور کھلے خرچ کرتے ہیں تو ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہوگا اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔ وہ اپنا اصل مقصد حاصل کرنے

میں اس وقت کامیاب ہو جائیں گے اور ہر قسم کے شر سے محفوظ رہیں گے جب حد سے بڑھنے والے غم میں مبتلا ہوں گے۔

﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقْوَمُ الَّذِينَ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا ۗ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۗ فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ ۗ وَأَمْرٌ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۗ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (275)﴾

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر دیوانہ بنا دیا ہو، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے کہا کہ تجارت بھی تو سود کی طرح ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے، چنانچہ جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت آجائے، سودہ باز آجائے تو جو پہلے گزر چکا وہ اس کے لیے ہے، اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے، اور جو دوبارہ سود کھائیں تو وہی لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔“ (275)

سوال 1: ﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقْوَمُ الَّذِينَ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ﴾ ”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر دیوانہ بنا دیا ہو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سود خوروں کا برا انجام بیان کیا ہے۔ وہ قیامت کے دن اپنی قبروں سے ایسے اٹھیں گے گویا شیطان نے انہیں دیوانہ بنا دیا ہو۔ اس وقت انہیں سخت سزا ملنے کا یقین ہوگا۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے سود خور کو مجبوظ الحواس شخص سے تشبیہ دی ہے۔ سود خور روپے کے پیچھے پاگل ہے اور اپنے اس پاگل پن میں عقل سے بعید حرکات کرتا ہے۔ سود خور کا پاگل پن خود غرضی کا ہے۔ اسے کچھ پرواہ نہیں ہوتی کہ اس سے کس طرح انسانی محبت اور ہمدردی کی جڑیں کٹ رہی ہیں؟ معاشرتی فلاح و بہبود پر کتنے برے اثرات پڑ رہے ہیں؟ کتنے لوگوں کی بد حالی سے وہ اپنی خوش حالی کا سامان کر رہا ہے؟ اکثر مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ سود خور قیامت کے دن ایک دیوانے اور مجبوظ الحواس شخص کی حالت میں اٹھے گا۔ سید قطب لکھتے ہیں کہ زمین پر ہماری زندگی میں بھی یہ خوفناک تصویر عملاً موجود ہوتی ہے۔ اقتصادی نظام میں ایک سود خور دیوانہ وار کوششوں میں مصروف ہے جس طرح شیطان کا چھو ہوا شخص دیوانہ ہوتا ہے۔ ﴿3﴾ لفظ ”المس“ کے معنی جنون کے ہیں جسے دیوانگی بھی کہتے ہیں۔ فراء نے یہی تفسیر کی ہے۔ مس کا معنی جنون کا چھونا۔ (بخاری کتاب التفسیر) سود خور آخرت میں ایسے شخص کی طرح اٹھے گا جسے شیطان نے چھو کر دیوانہ بنا دیا ہو۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں سود خور آخرت میں مجنون اٹھے گا۔ (بخاری کتاب التفسیر) ﴿4﴾ سود خور کا پاگل پن خود غرضی ہے۔ اسے صرف اپنی ذات کی فکر ہے۔ اسے کوئی ہوش نہیں کہ میرے جیسا دل، میرے جیسی ضروریات کسی اور کی بھی ہیں، میرے جیسے مسائل کسی اور کے بھی ہو سکتے ہیں، ان کے اندر بھی زندگی ہے، سود خور کو کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی، وہ پتھر دل، سنگ دل، تنگ دل اور خود غرض انسان ہے۔ اسے کوئی پرواہ نہیں کہ انسانی محبت کی جڑیں کٹ رہی ہیں۔ اس کے اس رویے کی وجہ سے انسانیت کن تکلیفوں میں مبتلا ہے۔ اسے کوئی پرواہ نہیں اسے کوئی فکر نہیں ہوتی کہ معاشرے کی فلاح و بہبود کے کام ہونے چاہئیں۔ وہ کبھی

نہیں سوچتا کہ کتنے لوگ بد حال ہوتے ہیں اور میں خوش حال ہوتا ہوں؟ میں کتنے گھروں کو دکھ میں مبتلا کرتا ہوں؟ وہ لوگوں سے زندگی چھین کر انہیں موت کی مجبوریوں تک پہنچا کر بھی اپنی خوش حالی چاہتا ہے۔

سوال 2: اہل جاہلیت کیسے سود وصول کرتے تھے؟

جواب: امام رازی کی تحقیق میں اہل جاہلیت کا یہ دستور تھا کہ وہ ایک شخص کو ایک معین مدت کے لیے روپیہ دیتے اور اس سے ماہ بہ ماہ ایک مقرر رقم سود کے طور پر وصول کرتے رہتے۔ جب وہ مدت ختم ہو جاتی تو مدیون سے راس المال کا مطالبہ کیا جاتا۔ اگر وہ ادا نہ کر سکتا تو پھر ایک مزید مدت کے لیے مہلت دی جاتی اور سود میں اضافہ کر دیا جاتا۔ (تفسیر کبیر: 2: 351)

سوال 3: سود کب حرام ہوا؟

جواب: ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ جب سود کے سلسلے میں سورہ بقرہ کی آخری آیتیں نازل ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں پڑھ کر لوگوں کو سنایا اور اس کے بعد شراب کی تجارت بھی حرام قرار پائی۔ (صحیح بخاری: 4540)

سوال 4: سود کس درجے کا گناہ ہے؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سات ہلاکت میں ڈالنے والی چیزوں سے بچو۔ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ وہ سات ہلاکت میں ڈال دینے والی چیزیں کون سی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور جادو کرنا اور کسی نفس کا قتل کرنا جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا سوائے حق کے اور یتیم کا مال کھانا، سود کھانا، جہاد میں دشمن کے مقابلہ سے بھاگنا اور پاک دامن عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگانا۔ ﴿2﴾ (صحیح مسلم: 262) سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خواب والی طویل حدیث میں بیان فرمایا: پھر ہم ایک نہر پر آئے وہ خون کی طرح سرخ تھی اور اس نہر میں ایک آدمی تیر رہا تھا نہر کے کنارے پر بھی ایک آدمی تھا جس نے اپنے پاس بہت سے پتھر جمع کر رکھے تھے۔ یہ تیرنے والا شخص تیرتا رہتا، اور جب اس شخص کے پاس آتا جس نے اپنے پاس پتھر جمع کر رکھے تھے تو وہ اس کے منہ کو کھولتا اور اس میں ایک پتھر داخل کر دیتا۔ پھر اس کی تعبیر میں آپ ﷺ نے فرمایا اس سے مراد سود کھانے والا ہے۔ (صحیح بخاری: 7047) ﴿3﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سود کے ستر درجے ہیں ان میں سے کم درجے کا گناہ اس قدر ہے جیسے کوئی اپنی ماں سے نکاح (یعنی زنا) کرے۔ (ابن ماجہ: 2274) ﴿4﴾ سود کا لین دین بہت ہی بڑا گناہ ہے اس لیے سود سے متعلق ہر شخص پر لعنت کی گئی ہے۔ ابو جحیفہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے گودنے والی اور گدوانے والی سود کھانے والے اور سود دینے والے اور مصور پر لعنت فرمائی ہے۔ (صحیح بخاری: 2238) ﴿5﴾ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے سود دینے والے، سود خرید کرنے والے اور سودی لین دین کے گواہوں پر لعنت کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: (گناہ میں) سب برابر ہیں۔ (صحیح مسلم: 4093)

سوال 5: سود خور کی بھیانک تصویر کا انسانی زندگی پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ سود خور کی بھیانک تصویر کا انسانی زندگی پر گہرا اثر ہوتا ہے، اس سے انسان میں خوف پیدا ہوتا ہے۔ ﴿2﴾ سرمایہ کاری کرنے والے سود خوروں کے انسانی جذبات جاگ سکتے ہیں، متحرک ہو سکتے ہیں۔ ﴿3﴾ اس آیت کے ذریعے انہیں جھوٹا اجارہ ہے اور مردہ سودی نظام سے نکلنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ﴿4﴾ یہ آیت لالچ اور خود غرضی کی فضا سے نکلنے کے لیے انتہائی مؤثر ہے۔

سوال 6: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الْوَبُوْءِ﴾ ”یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے کہا کہ تجارت بھی تو سود کی طرح ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: یہ بات کہ تجارت بھی تو سود کی طرح ہے کوئی دیوانہ ہی کہہ سکتا ہے یا ایسا شخص جو دین کا دشمن ہو یا جس کی عقل اوندھی ہوگی۔ اسی وجہ سے ان کو بدلہ بھی ان کے عمل کی طرح ملے گا یعنی قیامت کے دن وہ پاگلوں کی طرح اٹھیں گے۔

سوال 7: کیا تجارت سود کی طرح ہے؟

جواب: ﴿1﴾ تجارت سود کی طرح نہیں ہے: (i) تجارت میں نقد رقم کا تبادلہ ہوتا ہے جب کہ سود میں نہیں۔ (ii) تجارت میں نفع اور نقصان کا امکان رہتا ہے جب کہ سود میں ایک کو یقینی نفع ہوتا ہے اور دوسرے فریق کے نفع و نقصان کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ (iii) تجارت کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام اس لئے دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں حرمت سود کے عقلی دلائل لکھے ہیں۔ انہوں نے پہلے نمبر پر یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ سود کی رقم آخر کس چیز کا معاوضہ ہوتی ہے؟ بجز مفت خوری کی بدترین شکل کے اور یہ ہے کیا؟ (تفسیر ماجدی: 505/1) ﴿2﴾ سیدنا ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں مدینہ منورہ میں حاضر ہوا۔ سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی انہوں نے فرمایا کہ تم ایسی سر زمین میں رہتے ہو جہاں سود کا لین دین رواج پائے ہوئے ہے۔ جب کسی پر کچھ قرض ہو پھر وہ تمہیں بھوسہ کا ایک گٹھڑ یا جو کی گٹھڑی یاری میں بندھی ہوئی سبزی بھی دینا چاہے تو اس کو مت لینا کیونکہ وہ سود ہے۔ (بخاری) ﴿3﴾ جو لوگ سودی کاغذات لکھتے ہیں اس کی فائلیں بنا کر رکھتے ہیں وہ سودی لین دین کی فرموں، کمپنیوں اور بینکوں میں کام کرتے ہیں اور جو سود لیتے ہیں اور جو سود دیتے ہیں وہ اپنے بارے میں غور کر لیں کہ لعنت کے کام میں مشغول ہیں۔ گناہ کی مدد بھی حرام ہے اور جس نوکری میں گناہ پڑے وہ بھی حرام ہے اس کی تنخواہ بھی حرام ہے۔ سود کا لین دین کرنے والوں اور زیادہ آمدنی کی خواہش رکھنے والوں کو مفتیوں کی بات ناگوار تو لگتی ہے مگر حق تو کہنا ہی پڑتا ہے۔ (انوار البیان

(419/1:

سوال 8: سود خوروں کے نظریے کی خرابی یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ”تجارت بھی تو آخر سود جیسی چیز ہے“ وضاحت کریں؟

سود خوروں کا موقف

جواب:

سود

تجارت

﴿1﴾ تجارت میں لگے ہوئے روپے کا منافع

جائز ہے۔

﴿2﴾ ایک شخص اپنے روپے کو تجارت میں لگا

کر اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

﴿2﴾ قرض پر دیئے ہوئے روپے کا منافع بھی جائز ہونا چاہیے۔

﴿2﴾ ایک شخص روپے سے خود فائدہ اٹھانے کی بجائے

قرض دیتا ہے اور دوسرا شخص فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس

فائدے میں سے قرض دینے والے کو ادا کرنا چاہئے۔

سوال 9: ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الزُّبْحَا﴾ ”حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے“ اسلام کا موقف یہ

ہے کہ سود حرام ہے اور تجارت حلال ہے، وضاحت کریں؟

جواب: ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ﴾ ”حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے“ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے کہ اس میں سب کے لیے نفع

ہے چونکہ سب کو تجارت کی ضرورت ہے اس لیے اسے حرام قرار دینے میں نقصان ہے۔ تجارت حصول رزق کی ایک عظیم بنیاد ہے اس لیے اللہ

تعالیٰ نے اسے حلال قرار دیا ہے۔ ﴿2﴾ ”وَحَرَّمَ الزُّبْحَا“ اور سود کو حرام کیا ہے“ سود ظلم پر مبنی ہے اس کا انجام ہلاکت ہے اس لیے اللہ

تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ ﴿3﴾ تجارت اور سود کے بارے میں:

اسلام کا موقف

تجارت

﴿1﴾ ہر تجارت خواہ وہ سرمائے سے ہو یا محنت اور

سرمائے سے اس میں نقصان کا خطرہ ہوتا ہے۔

﴿2﴾ تجارت میں وقت، محنت، قابلیت اور سرمایہ لگا

کر بھی مقرر منافع کی ضمانت نہیں ہوتی۔

سود

﴿1﴾ سود میں قرض دینے والے سرمایہ دار کو نقصان کا

خطرہ نہیں ہوتا۔

﴿2﴾ سود میں قرض خواہ نہ وقت لگاتا ہے، نہ محنت اور نہ

قابلیت، صرف سرمایہ لگا کر مقررہ منافع کی ضمانت

ہوتی ہے۔ اس کا مال محفوظ ہوتا ہے اور دوسرے کا مال

غیر محفوظ ہوتا ہے۔

﴿3﴾ سودی لین دین میں منافع کا تبادلہ برابری کے

ساتھ نہیں۔

سود لینے والا مال کی مقررہ مقدار لیتا ہے منافع یقینی ہے۔

سود دینے والا صرف مہلت لیتا ہے جس کا منافع بخش

﴿3﴾ تجارت میں خریدار اور فروخت کرنے والے

کے درمیان منافع کا تبادلہ مساویانہ ہوتا ہے۔

(فروخت کرنے والا محنت، ذہانت اور وقت

کی اجرت لیتا ہے جو وہ چیز کو مہیا کرنے کے

لیے لگاتا ہے)۔

﴿4﴾ تجارت کا معاملہ نفع اور نقصان میں شراکت کا ہے۔

﴿5﴾ تجارت میں منافع خواہ کتنا ہی زائد ہو ایک بار ہوتا ہے۔

﴿6﴾ تجارت میں شے اور اس کی قیمت کے تبادلے پر معاملہ ختم ہو جاتا ہے، مکان یا زمین یا سامان کے کرائے میں اصل شے (جس کے استعمال کا معاوضہ دیا جاتا ہے) ختم نہیں ہوتی برقرار رہتی ہے اور مالک کو واپس کر دی جاتی ہے۔

﴿7﴾ تجارت، صنعت اور زراعت میں انسان محنت، ذہانت اور وقت کا فائدہ لیتا ہے۔

﴿8﴾ تجارت میں نفع و نقصان کی شراکت نفع کے تناسب اور نقصان کے تناسب سے ہوتی ہے۔

﴿9﴾ تجارت انسانی تمدن کی تعمیر کرنے والی

ہونا یقینی نہیں۔ (اگر سرمایہ ذاتی ضروریات کے لیے لیا ہے تو مہلت نفع مند نہیں ہے)۔

﴿4﴾ سود کا معاملہ ایک فریق کے فائدے اور دوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے۔

﴿5﴾ سود کے معاملے میں مال دینے والا مال پر مسلسل منافع وصول کرتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ منافع بڑھتا چلا جاتا ہے چاہے قرض لینے والے کے تن کے کپڑے اور گھر کے برتن تک بک جائیں۔

﴿6﴾ سود کے معاملے میں قرض دار سرمایہ لیتا ہے اسے صرف کر لیتا ہے۔ پھر صرف شدہ مال دوبارہ پیدا کرتا ہے۔ اضافے کے ساتھ واپس کرتا ہے۔

﴿7﴾ سودی کاروبار میں نہ محنت، نہ ذہانت، نہ وقت، محض ضرورت سے زیادہ مال دے کر بغیر کسی محنت کے دوسرے کی کمائی کے زیادہ حصے میں شریک بن جاتا ہے۔

﴿8﴾ سود پر قرض دینے والا نفع و نقصان میں نہیں بلکہ صرف نفع میں ہی شریک ہوتا ہے۔ نقصان ہوتے ہی اس کا منافع fix ہے۔ پھر منافع میں بھی بلا لحاظ تناسب طے شدہ منافع لیتا ہے۔

﴿9﴾ سود انسانی تمدن کی خرابی کا باعث بنتا ہے۔

توت بن جاتی ہے۔ لوگوں کی صلاحیتیں لگتی ہیں، معاشرہ ترقی کرتا ہے۔

﴿10﴾ تجارت امداد باہمی اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرتی ہے۔

﴿11﴾ تجارت کا فائدہ عوام الناس کو ہوتا ہے۔

﴿12﴾ تجارتی سرگرمیاں انسانیت کے لیے مفید ہیں۔

﴿13﴾ تجارت حلال ہے۔

ذہانت بھی قومی سرمایہ ہے جو سود کی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔

﴿10﴾ سود افراد میں بخل، خود غرضی، شقاوت، بے رحمی اور زر پرستی جیسی صفات پیدا کرتا ہے۔

﴿11﴾ سود کا فائدہ چند سرمایہ کاروں کا گروہ اٹھاتا ہے۔

﴿12﴾ سودی لین دین اصلاً انسانیت کے لیے تباہ کن ہے۔

﴿13﴾ سود حرام ہے۔

سوال 10: ﴿فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانْتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ﴾ ”چنانچہ جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت آجائے جس سے وہ باز آجائے تو جو پہلے گزر چکا وہ اس کے لیے ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ جس کو اللہ تعالیٰ نے نصیحت حاصل کرنے کی توفیق دی اس کے لیے رحمت ہے۔ ﴿2﴾ سعید بن جبیر نے اس آیت کے متعلق کہا: یعنی قرآن کا سود کی حرمت کے بارے میں بیان آجائے تو وہ اس سے رک جائے۔ اس نے ربا کی حرمت سے پہلے جو کھا لیا وہ اس کے لیے ہے۔ (ابن ابی حاتم: 545/2) ﴿3﴾ ﴿فَانْتَهَىٰ﴾ ”چنانچہ وہ باز آجائے“ جو سود کے لین دین سے توبہ کر لے اس کے لیے قانونی رعایت ہے یعنی جو پہلے کھا چکا اسے واپس کرنے کا قانونی مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

سوال 11: سود خور کو قانونی رعایت دینے کے بعد فرمایا ﴿وَأْمُرُوا إِلَى اللَّهِ﴾ ”اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے“ اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن توبہ کرنے والے کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ جو چاہے گا فیصلہ کرے گا۔ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور مشیت پر ہے یعنی اخلاقی حیثیت سے اس مال کی نجاست برقرار ہے۔ ﴿2﴾ اس سے ایک خطا کار مسلمان کے دل میں ہمیشہ یہ خوف رہتا ہے کہ اس نے جو کیا بہر حال غلط تھا۔ ایک تو وہ توبہ واستغفار کرتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سابقہ گناہوں کو معاف کر دیں گے۔ دوسرے یہ کہ وہ آئندہ اس سرمائے میں اضافہ نہیں چاہے گا۔ ﴿3﴾ اب اسے سزا دینا اور مستقبل میں اس کے عمل کو دیکھنا اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔

سوال 12: ﴿وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ ”اور جو دوبارہ سود کھائیں تو وہی لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں“ یہ انسان کی تربیت کا قرآنی انداز ہے، وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَمَنْ عَادَ﴾ ”اور جو دوبارہ سود کھائیں“ جس نے دوبارہ سود لیا اس نے سود پر اصرار کیا۔ ﴿2﴾ ﴿فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ

﴿فِيهَا خُلدُونَ﴾ ”تو وہی لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں“ قرآن حکیم انسان کے اندر آخرت کا خوف پیدا کر کے انسان کی اصلاح کرتا ہے۔ انسانوں میں سے کچھ انسان آخرت کا علم تو رکھتے ہیں لیکن یقین نہیں رکھتے۔ اس لیے قرآن آگاہ کرتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کو نہ مانے وہ گناہ گار ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے گناہ گاروں سے، کافروں سے نفرت کرتے ہیں۔

﴿يَسْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَالرِّبَا وَالصَّدَقَاتُ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ (276)

”اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے، گناہ گار کو پسند نہیں کرتا۔“ (276)

سوال 1: ﴿يَسْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا﴾ ”اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے“ اللہ تعالیٰ سود کو کیسے مٹاتا ہے، وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ لفظ ﴿يَسْحَقُ﴾، بمعنی ﴿يَذْهَبُ﴾ کے ہے یعنی مٹا دیتا ہے اور دور کر دیتا ہے۔ (بخاری: کتاب انشیر) ﴿2﴾ ﴿يَسْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا﴾ ”اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے“ یعنی اس کی برکت لے جاتا ہے اور جس میں شامل ہوتا ہے اس مال کو ہلاک کر دیتا ہے۔ (تفسیر البیضاوی: 575/1) ﴿3﴾ عباد بن منصور نے حسن سے اس آیت ﴿يَسْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَالرِّبَا وَالصَّدَقَاتُ﴾ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: وہ قیامت کا دن ہوگا جب اللہ تعالیٰ سود کو مٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا۔ (ابن ابی حاتم: 547/2) ﴿4﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نہ ان سے صدقہ قبول کرے گا، نہ حج نہ، جہاد اور نہ صلہ رحمی۔ (تفسیر خازن: 211/1) ﴿5﴾ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص حرام مال کما کر صدقہ کرے گا تو وہ قبول نہ ہوگا اور جو کچھ اس میں سے خرچ کرے گا اس میں برکت نہ ہوگی اور اپنے پیچھے چھوڑ کر جائے گا تو اس کے لیے دوزخ کی آگ میں لے جانے والا توشہ بنے گا۔ (مشکوٰۃ: 242) ﴿6﴾ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو گوشت حرام سے بڑھا ہو جنت میں داخل نہ ہوگا اور جو گوشت حرام سے بڑھا دوزخ کی آگ کی زیادہ مستحق ہوگی۔ (احمد داری) ﴿7﴾ اس آیت کا ایک سیدھا سادا مفہوم تو یہ ہے کہ سود میں برکت نہیں ہوتی یعنی سود خور کا مال بالآخر برباد ہو جاتا ہے۔ ﴿8﴾ دوسرا مفہوم ذرا زیادہ دقیق ہے اور وہ یہ ہے کہ سود سے اصل سرمایہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور قوم کے لئے یہ خسران مبین کا باعث ہوتا ہے۔ اقتصادیات کا یہ اصول ہے کہ دولت میں اس وقت اضافہ ہوتا ہے جب اسے زیادہ سے زیادہ پھیلا یا جائے اور سود سے روپیہ بجائے پھیلنے کے چند ہاتھوں میں سمٹ کے رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کی تمدنی ترقی رک جاتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر تعاونی جذبات کی ترقی ہو۔ روپیہ محدود ہاتھوں میں نہ رہے اور پھیلتا رہے تو قوم کے سرمایہ میں اضافہ ہوگا۔ (سراج البیان: 109/1) ﴿9﴾ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ سود اگرچہ بہت ہو جائے اس کا انجام کمی کی طرف ہو جائے گا۔ (مشکوٰۃ: 246) ﴿10﴾ یعنی سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر انجام کار نتیجہ اس کا قلت ہے۔ سود آفات کا باعث بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اور اس کی برکت کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر اس کمائی کو سود خور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے تو اسے اجر نہیں ملے گا بلکہ اسے یہ جہنم میں لے جائے گا۔

سوال 2: ﴿وَيُزِي الصَّدَقَاتِ﴾ ”اور صدقات کو بڑھاتا ہے“ اللہ تعالیٰ صدقات کو کیسے نشوونما دیتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَيُزِي الصَّدَقَاتِ﴾ ”اور صدقات کو بڑھاتا ہے“ یعنی جس مال سے صدقہ دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں برکت نازل کرتا ہے اور اس کے ثواب کو بڑھاتا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ صدقات کا ثواب بڑھا دیتا ہے اور جس مال سے صدقہ نکلتا ہے اس میں برکت دیتا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ”جو شخص حلال کمائی سے ایک کھجور کے برابر صدقہ کرے اور اللہ تعالیٰ صرف حلال کمائی کے صدقہ کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کرتا ہے، پھر صدقہ کرنے والے کے فائدے کے لیے اس کو بڑھاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کوئی اپنے جانور کے بچے کو کھلا پلا کر بڑھاتا ہے یہاں تک کہ اس کا صدقہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔“ (صحیح بخاری: 1410)

سوال 3: صدقات اور سود کے معاشرے پر کیسے اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ صدقات کو بڑھاتا اور سود کو مٹاتا ہے۔

باہمی تعلقات

سود	صدقات
﴿1﴾ سود کھانے والے خود غرضی کا معاملہ کرتے ہیں۔ ایک شخص دوسرے کی ضرورت کو اپنے لیے نفع حاصل کرنے کا موقع سمجھ کر پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔	﴿1﴾ جس معاشرے کے لوگ صدقات دیتے ہیں وہ ذاتی غرض اور ذاتی فائدے کے بغیر ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔
﴿2﴾ سود کی وجہ سے مال دار طبقوں کا مفاد عوام الناس کے مفاد کی ضد ہوتا ہے۔	﴿2﴾ صدقات کی وجہ سے مال دار طبقوں کا مفاد عوام الناس کے مفاد کے مطابق ہوتا ہے۔
﴿3﴾ سود کی وجہ سے سوسائٹی مستحکم نہیں ہوتی۔	﴿3﴾ صدقات کی وجہ سے سوسائٹی مضبوط ہوتی ہے۔
﴿4﴾ جہاں سود لیا اور دیا جاتا ہے اس معاشرے کے افراد کے درمیان باہمی بغض، حسد، بے دردی اور بے تعلقی نشوونما پاتی ہے۔	﴿4﴾ جس معاشرے میں صدقات دیے جاتے ہیں وہاں افراد معاشرہ کے درمیان باہمی ہمدردی، غم خواری، دکھ درد میں شرکت، باہمی تعاون، ایثار، باہم احسان، باہم رضامندی جیسی صفات پروان چڑھتی ہیں۔
سوسائٹی کا اجتماعی نظام:	

﴿1﴾ سودی معاشرے میں ذاتی غرض اور ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آنا، اپنے مال میں اضافے کی ہوس پر اجتماعی نظام استوار ہوتا ہے۔	﴿1﴾ صدقات والے معاشرے میں اجتماعی تعاون اور باہمی کفالت پر استوار ہوتا ہے۔
﴿2﴾ سودی معاشرے میں ہر فرد کی تگ و دو اپنی ذاتی خوشی تک محدود ہوتی ہے۔	﴿2﴾ صدقات والے معاشرے میں ہر فرد کی تگ و دو اس لیے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرے۔
﴿3﴾ سودی معاشرے میں ساری تگ و دو کا مقصد مال کا حصول ہے۔	﴿3﴾ صدقات والے معاشرے میں ہر فرد کی تگ و دو اس لیے ہوتی ہے کہ وہ اجر کا مستحق بن جائے۔
﴿4﴾ سودی معاشرے میں ہر وقت بے اطمینانی، روحانی قلق اور پریشانی رہتی ہے۔	﴿4﴾ صدقات والے معاشرے میں ہر وقت اطمینان رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مددگار ہے وہ صدقہ اور احسان کا اجر کئی گنا دے گا۔
﴿5﴾ سودی معاشرے میں ذہنی اور اعصابی کشمکش کی وجہ سے مال، عمر، صحت میں برکت نہیں ہوتی۔	﴿5﴾ صدقات والے معاشرے کے افراد پر برکتیں نازل ہوتی ہیں، مال، رزق، عمر، صحت، قوت میں برکت ہوتی ہے۔
﴿6﴾ سودی معاشرے میں دل مطمئن نہیں ہوتے۔	﴿6﴾ صدقات والے معاشرے میں دل اطمینان سے سرشار ہوتے ہیں۔

معاشی اعتبار سے

ذاتی ضروریات کے لیے قرض	ایک دوسرے کے ساتھ تعاون زکوٰۃ کی مد میں حصہ ہے۔ صدقات کے ذریعے سے باہمی ہمدردی، تعاون اور باہمی احسان کی فضا پروان چڑھتی ہے۔ کوئی احسان جتلا نا اور دکھ دینا نہیں ہے۔ قرض کی واپسی نہ ہو سکے تو مہلت پر مزید اجر کی توقع ہے۔ معاف کرنا پڑے تو اللہ تعالیٰ کی خاطر معاف کر دینا آسان ہے۔
سود کی وجہ سے قرض ادا کرنا مشکل ہو جاتا ہے اصل سے کئی گنا ادا کرنے کے باوجود اصل رقم برقرار رہتی ہے۔ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے بھی روپیہ نہیں چٹا دل لگا کر محنت نہیں کر سکتے۔ چند افراد لاکھوں انسانوں کا خون چوس لیتے ہیں۔ مال دار طبقے کے خلاف نفرت، غصہ جب پھٹتا ہے تو بسا اوقات جان اور عزت تک سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔	

کاروبار کے لیے قرض

1- شراکت کے تحت فریقین کی دل چسپی، محنت، وقت اور سرمائے کی وجہ سے کاروبار پھلتا پھولتا ہے۔	1- شرح سود جو رائج ہے اس کے مطابق اگر کوئی بزنس نفع نہ دے سکے تو وہ بزنس نہیں کیے جاتے چاہے ملک و ملت کو اس کی ضرورت ہو۔
2- ہر طرح کے کاروبار میں سرمایہ لگتا ہے۔	2- مخصوص بزنس جو 5 یا 6٪ سالانہ شرح سود نکال سکتے ہیں (منافع کے علاوہ) وہ پروان چڑھتے ہیں۔
3- بزنس کی بھلائی برائی سے دو طرفہ دل چسپی۔	3- سرمایہ دار کو بزنس کی بھلائی برائی سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔
4- تجارت اور صنعت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔	4- تجارت اور صنعت ایک خاص سطح پر جا کر نقصان کا شکار ہو جاتی ہیں۔

سوال 4: سود کا کاروبار کرنے والا اور صدقہ کرنے والا، شراکت پر کاروبار کرنے والا اپنے اندر کیسا انسان تیار کرتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ سود کا کاروبار کرنے والا اپنے اندر خود غرض اور دنیا پرست انسان تیار کرتا ہے۔ ﴿2﴾ صدقہ کرنے والا، شراکت پر کاروبار کرنے والا اپنے اندر دوسروں کے لیے خیر خواہ، ذات سے بلند ہو کر سوچنے والا انسان تیار کرتا ہے۔

سوال 5: صدقہ اور سود کی روح کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ صدقہ کی روح حاجت مند کو اپنا مال اللہ تعالیٰ کے لیے دینا ہے۔ ﴿2﴾ سود کی روح ضرورت مند کو اپنا مال اس کے استعمال کے لیے دینا ہے۔

سوال 6: صدقہ اور سود کس چیز کی علامت ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ صدقہ اس چیز کی علامت ہے کہ انسان آخرت میں اپنے لیے نعمتوں کے ڈھیر دیکھنا چاہتا ہے۔ ﴿2﴾ سود اس بات کی علامت ہے کہ انسان دنیا میں اپنے لیے مال کے ڈھیر لگانے کا خواہش مند ہے۔

سوال 7: اللہ تعالیٰ کے یہاں سود خور اور صدقہ دینے والے کا انجام یکساں نہیں، وضاحت کریں؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے یہاں سود خور اور صدقہ دینے والے کا انجام یکساں نہیں ہے۔ دو الگ خصوصیات رکھنے والے انسانوں کا انجام ایک سا نہیں ہو سکتا۔ جس نے دنیا کے لیے محنت کی اسے دنیا ملے گی۔ جس نے آخرت کے لیے آج اپنے مال کو قربان کیا اسے آخرت ملے گی۔

سوال 8: سود کی حرمت پر ایک حدیث لکھیں۔

جواب: سیدنا عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود لکھنے والے اور اس کی گواہی دینے والوں پر لعنت

فرمائی اور ارشاد فرمایا: ”یہ سب (گناہ میں) برابر (شریک) ہیں۔“ (مسلم: 4093)

سوال 9: ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِمٍ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے، گناہ گار کو پسند نہیں کرتا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے، گناہ گار کو پسند نہیں کرتا، ﴿کفّارٍ اَثِمٍ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو جواز سود کے قائل ہیں۔ ﴿2﴾ جو ﴿اَثِمٍ﴾ سے مراد بڑے گناہ گار، یعنی سود خوری جیسی شدید معصیت میں مبتلا لوگ ہیں۔ ﴿3﴾ اس میں دونوں قسم کے نافرمان آگئے، وہ جو سودی کاروبار کرتے ہیں اور وہ جو اپنے عمل کے ساتھ ساتھ حرمت سود کے عقیدہ بھی منکر ہیں۔ ﴿4﴾ جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب کردہ زکوٰۃ اور صدقات ادا نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کے بندے اس کے شر سے محفوظ نہیں رہے۔ (تفسیر سعدی: 326/1)

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوْا الزّٰكٰتَ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا نُعَذِّبُهُمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾

﴿يَحْزَنُونَ﴾ (277)

”یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی، ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ (277)

سوال 1: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوْا الزّٰكٰتَ﴾ ”یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے

اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی، ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”یقیناً جو لوگ ایمان لائے“ اصل مومن وہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر، اس کے رسولوں پر اور جو اس نے نازل کیا اس پر ایمان رکھتا ہے، نیک عمل کرتا ہے، نماز قائم کرتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے، سخاوت کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کہ مجھ سے ہر ایک کو فائدہ حاصل ہو جائے۔ ﴿2﴾ جو دن رات خرچ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہے کہ وہ مجھے بڑھا چڑھا کر دے گا تاکہ لوگوں کو اور دوں اور دیتا ہی جاؤں۔

سوال 2: ﴿لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا نُعَذِّبُهُمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ ”ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ

کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے“ ان کے لیے ان کا کامل ثواب جنت میں ہوگا۔ ﴿2﴾ ”ان پر نہ کوئی خوف

ہوگا“ اس سے مراد یہ ہے کہ اس دن کی گھبراہٹوں میں ان پر کوئی خوف نہ ہوگا۔ ﴿3﴾ ”اور نہ وہ غمگین ہوں گے“ یعنی جو دنیا میں ان سے چھوٹ جائے گا اس پر غم نہیں کریں گے۔ (صفوۃ التفسیر: 158/1)

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذُرُوْا مَآبِقِيَ مِنَ الرَّبِّوَانِ لَكُمْ مِّنْهُ مُوَسِّئٰتٌ﴾ (278)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ تعالیٰ سے ڈرجاؤ اور جو سود میں سے باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو۔“ (278)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ یہ آیت قبیلہ ثقیف میں سے بنی عمرو بن عوف اور بنی مغیرہ کے بارے میں اتری ہے۔ ﴿2﴾ بنی مغیرہ ثقیف کو سود پر مال دیا کرتے تھے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے مکہ مکرمہ فتح کر دیا اور اس دن تمام سودی کاروباروں کا خاتمہ کر دیا گیا تو بنی عمرو اور بنی مغیرہ عتاب بن اسید کے پاس آئے بنی مغیرہ نے آکر کہا کہ اس سود کی وجہ سے ہم تمام لوگوں سے بدتر ہو گئے اور ہمارے علاوہ اور لوگوں نے سود کا خاتمہ کر دیا تو بنی عمرو بولے کہ آپس میں ہم اس شرط پر صلح کر لیں کہ ہمارے لیے ہمارا سود ہے ان کی یہ بات عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لکھ کر روانہ کی تو اس پر یہ آیت اور اس سے بعد والی آیت نازل ہوئی اور ابن جریر نے عکرمہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت قبیلہ ثقیف میں سے مسعود حبیب ربیعہ اور عبد یلیل، بنو عمر اور بنو عمیر کے متعلق اتری ہے۔ (تفسیر ابن عباس: 166/1) ﴿3﴾ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: ”جاہلیت کے زمانے کا سود پامال کر دیا گیا ہے اور میں اپنے سود میں سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن مطلب رضی اللہ عنہ کا سود معاف کرتا ہوں۔“ (مسلم: 2950)

سوال 2: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ﴾ ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ تعالیٰ سے ڈرجاؤ“ سود چھوڑنے کے لیے تقویٰ کا مطالبہ کیوں کیا گیا؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کا خوف انسان سے دنیا میں وہ کام کروا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہیں لیکن انسان کو وہ کام انتہائی مشکل محسوس ہوتے ہیں۔ ﴿2﴾ تقویٰ کا شعور وہ ضمانت ہے جس کی وجہ سے اسلام اپنے قوانین نافذ کرتا ہے۔ ﴿3﴾ تقویٰ انسان کے اندر ضمیر کا چوکی دار ہے، خدا خونی اور رضائے الہی کا نگران ہے۔ ﴿4﴾ وہ اندرونی گارنٹی جو اسلام پیدا کرتا ہے بیرونی دباؤ کی وجہ سے نافذ کرنے والے قوانین کے مقابلے میں انتہائی مؤثر ہے۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم دیا ہے جس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جس کے ذمے موجودہ لین دین میں سود ہے اسے چھوڑ دیں۔ جہاں تک پہلے سود کا معاملہ ہے اگر آئندہ سود نہ لیا تو پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

سوال 3: ﴿وَذُرُوا مَا فِيهَا مِنَ الرِّبَا إِنَّ كُنْتُمْ مُمْسِكِينَ﴾ ”اور جو سود میں سے باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ ایمان کا مقتضی سارے ہی احکام قرآن پر عمل کرنا ہے۔ محققین نے اس نکتے سے یہ استدلال کیا ہے کہ شریعت کے کسی ایک جزء سے بھی انکار کرنا ساری شریعت سے انکار ہے۔ (تفسیر ماجدی) ﴿2﴾ ”اور جو سود میں سے باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو“ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی رسول سے یہ قول منقول ہے کہ سود کو بھی چھوڑ دو اور اس کے

مشابہ چیزوں کو بھی۔ (تفسیر ماجدی: 508/1) ﴿3﴾ آپ ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جب ہر کوئی سود کھانے والا ہوگا سود نہ کھائے تو بھی اس کا بخارا اور ایک دوسری روایت کے مطابق اس کا غبار اسے ضرور پہنچ کے رہے گا۔ (تیسیر القرآن: 229/1)

﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾ (279)

”پھر اگر تم نے (ایسا) نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑی جنگ کا اعلان سن لو، اور اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہیں، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔“ (279)

سوال 1: ﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ ”پھر اگر تم نے (ایسا) نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑی جنگ کا اعلان سن لو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”پھر اگر تم نے (ایسا) نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑی جنگ کا اعلان سن لو“ جس نے اللہ تعالیٰ کی نصیحت قبول نہ کی اور سود سے باز نہ آیا وہ اللہ تعالیٰ سے جنگ کرنے والا ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ ایک کمزور انسان اپنے رب سے جنگ کر سکے جو کہ غالب اور حکمت والا ہے۔ ﴿2﴾ اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرے جو سودی اقتصادیات کو جاری رکھنے پر بضد ہیں اگرچہ یہ لوگ اعلان کریں کہ ہم مسلمان ہیں۔ نبی ﷺ نے حاکم مکہ کو حکم دیا کہ وہ مکہ کے آل مغیرہ سے جنگ کریں کیونکہ وہ ان آیات کے نزول کے بعد بھی سودی کاروبار سے باز نہیں آئے۔ ﴿3﴾ یہ اعلان جنگ ہر اس معاشرے کے خلاف ہے جو اپنے اقتصادی نظام کی بنیاد سود پر رکھتا ہو۔ یہ اعصاب کی جنگ ہے۔ یہ خیر و برکت اور خوش حالی کے خلاف سود کی جنگ ہے۔ ﴿4﴾ مقاتل بن حیان نے اس آیت ﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ کے بارے میں کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو لکھا، اگر وہ سود چھوڑنے کے لیے تیار ہوں تو ان کے لیے ان کے اصل اموال ہیں اور اگر ایسا نہ کریں تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑی جنگ کا اعلان سن لیں۔ (ابن ابی حاتم: 549/2) ﴿5﴾ یعنی سود خوروں سے باغیوں اور مرتدوں کی طرح جہاد کیا جائے گا۔

سوال 2: ﴿وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ﴾ ”اور اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اگر تم توبہ کرو“ یہاں توبہ کا مطلب ہے کہ انسان سود جیسے حرام کام سے رجوع کر لے۔ ﴿2﴾ ”تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہیں“ یعنی اصل مال وصول کر لو۔

سوال 3: ﴿لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾ ”نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر اصل زر سے زیادہ وصول کرو گے تو وہ سود تمہاری طرف سے ظلم ہوگا اور اگر تمہیں اصل زر نہ دیا جائے تو یہ تم پر ظلم ہوگا لہذا نہ ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ ﴿2﴾ سعید بن جبیر نے ﴿لَا تَظْلِمُونَ﴾ کے بارے میں کہا کہ ان کے اعمال میں ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا، نہ ان کی نیکیوں میں کمی کی جائے گی، اور نہ ان کی برائیوں میں اضافہ کیا جائے گا۔ (الدر المنثور: 653/1) ﴿3﴾ اصل مال کی

واپسی میں قرض خواہ اور قرض دار دونوں کا نقصان نہیں۔

﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۗ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (280)

”اور اگر کوئی تنگ دست ہو تو آسانی تک (اسے) مہلت دینا ہے اور تمہارا صدقہ کرنا ہی تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانتے

ہو۔“ (280)

سوال 1: ﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ﴾ ”اور اگر کوئی تنگ دست ہو تو آسانی تک (اسے) مہلت دینا ہے“ اسلام کے اس اصول کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور اگر کوئی تنگ دست ہو تو آسانی تک (اسے) مہلت دینا ہے“ ﴿1﴾ اسلام تنگ دست کا تعاقب کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ﴿2﴾ نہ قرض خواہ تعاقب کرے گا نہ قانون اور عدالتوں کو یہ اختیار ہوگا۔ ﴿3﴾ تنگ دست کو حالات کی بہتری تک مہلت دی جائے گی۔ (i) قرض خواہ سے مطالبہ ہے یا تو وہ معاف کر دے۔ (ii) یا زکوٰۃ کی مد میں سے قرض کی ادائیگی کے لیے کوشش کی جائے۔ ﴿4﴾ اسلامی نظام کا یہ اصول انسانیت کے لیے گھنی چھاؤں ہے اس میں خود غرضی، لالچ، بخل اور مفاد پرستی نہیں۔ انسانیت یہاں سکون کا سانس لیتی ہے۔ قرض دار کے لیے رحمت ہے۔ قرض خواہ کے لیے بھی اس لیے کہ نہ اس کا اصل زر مارا جاتا ہے نہ اجر۔

سوال 2: ﴿وَإِنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ ”اور تمہارا صدقہ کرنا ہی تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ سعید بن جبیر نے اس قول ﴿وَإِنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ ”اور تمہارا صدقہ کرنا ہی تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے“ کے بارے میں فرمایا: جو کسی تنگ دست پر صدقہ کرے گا تو وہ اس کے لیے بڑے اجر کا ذریعہ ہوگا۔ (ابن ابی حاتم: 553/2) ﴿2﴾ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی مر گیا اور جنت میں داخل ہوا تو اسے کہا گیا: تو کیا عمل کیا کرتا تھا؟ اسے یاد آیا یاد کرایا گیا۔ تو اس نے کہا: میں لوگوں کو مال فروخت کرتا تھا اور میں تنگ دست کو مہلت دیتا اور سکون کے پر کھنے یا نقد میں درگزر کرتا تھا۔ تو اس کی مغفرت کر دی گئی۔ سیدنا ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے بھی یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ (صحیح مسلم: 3995) ﴿3﴾ سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کو اس بات کی خوشی ہو کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی بے چینیبوں سے نجات دے تو تنگ دست (قرض دار) کو مہلت دے دے یا معاف کر دے۔ (مسلم: 18/2) ﴿4﴾ سیدنا ابوالیسر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی تنگ دست کو قرض کی ادائیگی میں مہلت دے یا (قرضہ) معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اپنے سایہ میں جگہ دے گا۔ (صحیح مسلم: 7512) ﴿5﴾ سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد کی طرف نکلے اور آپ مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرما رہے تھے۔ ابو عبد الرحمن نے اپنے ہاتھ کے ساتھ زمین کی طرف اشارہ کیا ”جو تنگ دست کو مہلت

دے یا اسے معاف کر دے اللہ تعالیٰ اسے دوزخ کی تیز لو سے بچائے گا۔“ (مسند احمد 1/327) ﴿6﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک تاجر لوگوں سے قرضوں کا لین دین کیا کرتا تھا۔ قرضے وصول کرنے پر جو غلام اس نے مقرر کر رکھے تھے ان سے کہتا تھا کہ جب کسی تنگ دست کے پاس پہنچو تو اس سے درگزر کر دینا امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بھی درگزر فرمائے گا۔ چنانچہ موت کے بعد جب وہ بارگاہ الہی میں حاضر ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے درگزر فرما دیا۔ (بخاری: 1/279، مسلم: 2/18) ﴿7﴾ سیدنا عبد اللہ بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (میرے باپ) کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن ابی حدرد سے مسجد نبوی میں اپنے قرض کا تقاضا کیا۔ دونوں چلانے لگے۔ آپ ﷺ اپنے حجرہ میں تھے ان دونوں کی آوازیں سنیں تو آپ ﷺ حجرے کا پردہ اٹھا کر برآمد ہوئے اور کعب کو پکارا۔ کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: حاضر یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ نے اشارہ سے فرمایا: آدھا قرض چھوڑ دو۔ کعب کہنے لگے: یا رسول اللہ ﷺ! میں نے چھوڑ دیا۔ آپ ﷺ نے ابو حدرد سے فرمایا: اور اس کا قرض ادا کرو۔ (تیسیر القرآن: 1/234)

سوال 3: اگر مال سود پر قرض نہ دیا جائے تو دولت میں اضافہ کیسے کیا جائے؟

جواب: ﴿1﴾ اگر مال سود پر قرض نہ دیا جائے تو دولت میں اضافہ کے لیے افراد ذاتی جدوجہد کریں۔ ﴿2﴾ تجارت میں شراکت کر کے دولت میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ ﴿3﴾ اقتصادی ترقی، بڑی کمپنیوں کے shares سے جو براہ راست بازار میں حصص فروخت کرتے ہیں، ان کے توسط سے دولت میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ ﴿4﴾ ایسی رقومات سے جو امانتاً بینکوں میں جمع ہوں گی، بینک انہیں کاروبار میں لگا کر جو نفع حاصل کرے اور اپنا ایک مقرر منافع رکھنے کے بعد انہیں تقسیم کر کے دولت میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا بِمَائِمْزَجُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ لَمْ تَكُنْ لَكُمْ نَفْسٌ مَّا كَسَبْتُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (281)

”اور اس دن سے ڈرو جس میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا جائے گا پھر ہر نفس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم

نہیں کیا جائے گا۔“ (281)

سوال 1: یہ آیت آخری وحی ہے، اس کی کیا دلیل ہے؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا یہ آخری آیت تھی جس کے ساتھ سیدنا جبریل علیہ السلام نازل ہوئے پھر آپ ﷺ نے اسے البقرہ میں دو سو اسی آیات میں رکھوایا۔ (بخاری: 4544) ﴿2﴾ رسول اللہ ﷺ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد اکیس دن زندہ رہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اٹھارہ دن زندہ رہے۔ (دلائل النبوة: 7/137) ﴿3﴾ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، سعید بن جبیر، عطیہ اور مقاتل نے کہا قرآن میں یہ آیت سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ ﴿4﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رسول اللہ ﷺ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد اسی دن زندہ رہے۔ ﴿5﴾ ابن جریج نے کہا: رسول اللہ ﷺ اس کے بعد نو دن زندہ رہے۔ مقاتل نے کہا: اس کے بعد سات دن زندہ رہے۔ (زاد المسیر: 1/289)

سوال 2: ﴿وَأَتَقُوا يَوْمَ مَا تَرَجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَلَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ ”اور اس دن سے ڈرو جس میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا جائے گا پھر ہر نفس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا تصور دلایا گیا ہے جس کی وجہ سے انسان کانپ اٹھتا ہے۔ ﴿2﴾ اس دن انسان سے اس کے اعمال کا بدلہ لیا جائے گا۔ ﴿3﴾ ﴿ثُمَّ تُوَلَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ ”پھر ہر نفس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا“ سعید بن جبیر نے کہا ﴿مَا كَسَبَتْ﴾ یعنی: جو انہوں نے خیر یا شر میں سے کوئی عمل کیا۔ (ابن ابی حاتم: 554/2)؛ ﴿4﴾ اس دن کو جو مصیبت والا ہوگا، مشکل ہوگا، بندہ مؤمن کے دل میں اس کا خوف اجاگر کیا گیا ہے۔ ﴿5﴾ اس دن انسان سے اس کے اعمال کا بدلہ لیا جائے گا۔ ﴿6﴾ اسلام مؤمن کے دل میں ایک چوکیدار بٹھا دیتا ہے تاکہ اس کے لیے فرار کا کوئی راستہ نہ رہے۔ ﴿7﴾ یہ آیت مبارکہ قرآن مجید کی ان آیات میں شامل ہے جو سب سے آخر میں نازل ہوئیں۔ اس پر احکام اور امر و نواہی کو ختم کیا گیا کیونکہ اس میں نیکی پر جزا کا وعدہ ہے، برائی پر سزا کی وعید ہے اور یہ بیان ہے کہ جس شخص کو یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس جانے والا ہے، جو اسے ہر چھوٹے بڑے، ظاہر اور پوشیدہ عمل کی جزا دے گا، اور وہ اس پر ذرا برابر ظلم نہیں کرے گا، اس یقین کے نتیجے میں اس کے دل میں رغبت و رہبت (شوق اور خوف) کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب تک دل میں یہ یقین جاگزیں نہ ہو، یہ چیز کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی۔ (تفسیر سعدی: 327/1)

رکوع نمبر 7

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَوَلَّيْتُمْ يَدِّينَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوا ۚ وَلْيَكْتُب بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِينَ عَلَّمُوا الْقُرْآنَ وَيَلْتَمِ الْأُحْقَىٰ ۚ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا بَيِّنَةٌ لَهُ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنَ الَّذِينَ عَدَىٰ الْأُحْقَىٰ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلْيِهِ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رَجَالِكُمْ ۚ فَإِنْ لَمْ يَكُنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتْنِ وَامْرَأَتُهُ ۚ وَتَرَضَوْنَ مِنَ اللَّهِ ۚ فَإِنْ تَضَلَّ أَحَدُهُمَا فَتَدْبُرْ أَحَدُهُمَا إِلَىٰ خُرَىٰ ۚ وَلَا يَأْبَ اللَّهُ إِعْرَاضًا مَادَعُوا ۚ وَلَا تَسْمُونَ أَنْ تَكْتُبُوا صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلٍ ۚ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمٌ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا ۚ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۚ وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِنْ تَفَعَّلُوا فَإِنَّهُ فَسُوقٌ بِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَيَعْلَمُ اللَّهُ ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (282)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم کسی مقررہ مدت تک باہم قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والے پر لازم ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کے ساتھ لکھے اور کسی لکھنے والے کو لکھنے سے انکار بھی نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے (لکھنا) سکھایا پس لازم ہے کہ

وہ لکھے اور لازم ہے کہ وہ شخص لکھوائے جس کے ذمے حق (قرض) ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈر جائے جو اس کا رب ہے اور اس میں سے کچھ نہ کم کرے پھر جس شخص کے ذمے حق (قرض) ہو اگر وہ نا سمجھ یا کمزور ہو یا خود لکھوانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس کے مختار پر لازم ہے کہ انصاف کے ساتھ لکھوائے اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنا لو پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جنہیں تم گواہوں میں سے پسند کرتے ہو تا کہ ان دونوں (عورتوں) میں سے ایک بھول جائے تو ان میں سے ایک کو دوسری یاد کرادے اور گواہ انکار نہ کریں جب بھی انہیں گواہی کے لیے بلایا جائے اور تم اس سے نہ اکتاؤ کہ تم اسے لکھو، معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی مقررہ مدت تک۔ یہ کام اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ انصاف والا ہے اور گواہی کو زیادہ قائم رکھنے والا ہے اور زیادہ قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو مگر یہ کہ تجارت نقد جو جس کا لین دین کرتے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہ ہوگا کہ تم اس کو نہ لکھو، اور جب تم آپس میں سودا کرو تو گواہ بنا لیا کرو اور کسی کا تب کو اور کسی گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے اور اگر تم ایسا کرو گے تو یقیناً وہ تمہاری بڑی نافرمانی ہوگی اور اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ اور اللہ تعالیٰ تمہیں تعلیم دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“ (282)

سوال 1: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَاوَيْتُمْ بِدِينٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾ ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم کسی مقررہ مدت تک باہم قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ یہ آیت قرض کے مسائل سے متعلق ہے اور آیت الدین کے نام سے جانی جاتی ہے۔ سیدنا سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت آیت الدین ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: 378/1) ﴿2﴾ قرض سے مراد دو آدمیوں کے درمیان ادھار کا معاملہ ہے۔ قرض کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب دو آدمیوں کے درمیان نقد معاملہ نہ ہو سکے اور جب لین دین کا معاملہ اسی وقت طے نہ ہو سکے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو قرض کے معاملے میں حکم دیا ہے کہ میعاد مقرر کر کے قرض کے معاملے کو ضبط تحریر میں لائیں تاکہ اس کی رقم اور میعاد پر گواہی رہے۔ ﴿4﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ میعاد مقرر کر کے قرض کے لین دین کی اجازت اس آیت سے بخوبی ثابت ہوتی ہے۔ (ابن کثیر: 378/1) ﴿5﴾ اس آیت سے قرض کی تمام صورتوں کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ ﴿6﴾ قرض کے معاملات کی مشروعیت میں حکمت ہے کہ لوگوں کو اس کی سخت ضرورت ہے اور نہ لکھنے کی صورت میں غلطی، بھول، اختلاف اور جھگڑا واقع ہونے کا اندیشہ ہے۔ (تفسیر سعدی: 329/1) ﴿7﴾ قرض کا معاملہ نقد معاملے کی بہ نسبت مختلف ہے کیونکہ نقد معاملہ لین دین ہو کر اسی وقت ختم ہو جاتا ہے اور ساری بات زبانی ہو تو ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ قرض کے معاملے میں ہر فریق معاملے کو اپنے مفاد کے مطابق واضح کرتا ہے۔ قرض کے معاملے میں کوئی قطعی بنیاد نہیں ہوتی جس پر فیصلہ ہو سکے اسی وجہ سے قرض کے معاملے میں ادائیگی کے وقت شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ﴿8﴾ ﴿إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ ”کسی مقررہ مدت تک“ مفسرین نے اس سے یہ اشارہ سمجھا ہے کہ قرضہ کے معاملات میں مدت بالکل صاف اور متعین ہونی چاہئے گول اور مجمل نہ رہے ”جاڑوں کے زمانہ میں“ ”برسات کے موسم میں“ ”ربیع کی فصل میں“ ان مبہم مدتوں کے بجائے تعین و صراحت ہونی چاہئے کہ فلاں سنہ کے فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ۔ (تفسیر ماجدی: 510/1) ﴿9﴾

﴿كَاتِبُونَ﴾ ”تو اسے لکھ لیا کرو“ ابن جریج فرماتے ہیں: جو ادھار دے وہ لکھ لے اور جو بیچے وہ گواہ کر لے۔ (جامع البیان: 3/124)

سوال 2: قرض لینے اور دینے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا کیا قانون ہے؟

جواب: قرض لینے اور دینے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ ﴿1﴾ اگر قرض کی مدت مقرر ہے تو لین دین کا تحریر میں آنا ضروری ہے۔ ﴿2﴾ قرض کی تحریری دستاویز ایک تیسرا شخص تیار کرے گا، فریقین میں سے نہیں ہوگا۔ ﴿3﴾ املاء قرض دار کروائے گا۔ ﴿4﴾ اگر قرض دار ضعیف ہو یا کم سن تو اس کا ولی املاء کروائے گا۔ ﴿5﴾ قرض کے معاہدے پر دو افراد کو گواہ کر لیا جائے جن کی گواہی مقبول ہو۔

سوال 3: ﴿وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبًا بِالْعَدْلِ﴾ ”اور لکھنے والے پر لازم ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کے ساتھ لکھے“ سے کیا

مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور لکھنے والے پر لازم ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کے ساتھ لکھے“ سے مراد یہ ہے کہ کاتب تحریر میں کمی بیشی نہ کرے اور وہی بات لکھے جس میں دونوں کا اتفاق ہو۔ ﴿2﴾ کاتب کو حکم ہے کہ وہ لکھے۔ اسے عادل ہونا چاہیے تاکہ اس کی تحریر پر اعتماد کیا جاسکے۔ ﴿3﴾ کاتب پر فرض ہے کہ فریقین کے درمیان انصاف سے کام لے۔ وہ رشتہ داری اور دوستی کی وجہ سے کسی ایک فریق کی طرف مائل نہ ہو۔ ﴿4﴾ کاتب کا ایسی تحریریں لکھنے کے طریق کار سے اور فریقین کے لیے جو چیز واجب ہے اور جس چیز سے تحریر قابل اعتماد بنتی ہے، ان سب امور سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ ﴿5﴾ جب کوئی ایسی تحریر موجود ہو، جس کی کتابت معروف عادل (قابل اعتماد) آدمی کے ہاتھ کی ہو تو اس پر عمل کیا جائے گا۔ اگرچہ لکھنے والا اور گواہ فوت ہو چکے ہوں۔ (تفسیر سعدی: 1/329)

سوال 4: ﴿وَلَا يَأْتِ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلَْيَكْتُبْ﴾ ”اور کسی لکھنے والے کو لکھنے سے انکار بھی نہیں کرنا چاہئے، جیسا کہ

اللہ تعالیٰ نے اسے (لکھنا) سکھایا پس لازم ہے کہ وہ لکھے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ جب کاتب سے لکھنے کو کہا جائے تو وہ لکھے جس طرح اسے لکھنا نہیں آتا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا تو وہ ان کے لیے لکھے جو لکھنا نہیں جانتے۔ ﴿2﴾ ابن جریج اور مجاہد کہتے ہیں کہ کاتب پر واجب ہے کہ وہ لکھے، انکار نہ کرے۔ ﴿3﴾ لکھنے کا حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرض ہے۔ اس کا معاوضہ اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ ﴿4﴾ لکھنے کا کام کاتب کی جانب سے اللہ تعالیٰ کے ہاں نعمت کا شکر ہے۔ ﴿5﴾ لکھنے والا عدل و انصاف سے لکھے گا۔

سوال 5: ﴿وَيُضِلُّ الَّذِينَ عَلَيْهِمُ الْحَقُّ﴾ ”اور لازم ہے کہ وہ شخص لکھوائے جس کے ذمے حق (قرض) ہے“ قرض دار کے املا کروانے

میں کیا حکمت ہے؟

جواب: ﴿1﴾ کاتب کو حکم دیا گیا ہے کہ صرف وہی چیز لکھے جس کو وہ شخص لکھوائے جس کے ذمے حق ہے۔ ﴿2﴾ فریقین میں سے لکھوانے کی ذمہ داری اس کی ہے جس کے ذمے قرض ہے۔ ﴿3﴾ اسے حکم ہے کہ پورا حق بیان کرے اس میں سے کچھ نہ چھپائے۔ (تفسیر

سعدی: (329/1) ﴿4﴾ تحریر لکھوانا قرض دار کی طرف سے قرضے کا اعتراف ہے۔ یہ اقرار زیادہ قوی اور مضبوط ہے۔ ﴿5﴾ جب قرض دار خود تحریری دستاویز لکھوائے گا تو زیادتی سے بچے گا۔ ﴿6﴾ قرض دار کمزور پوزیشن میں ہوتا ہے اگر وہ خود تحریر نہ کروائے تو ہو سکتا ہے کہ قرض دینے والے کی مخالفت کی وہ جرأت نہ کر سکے۔ ﴿7﴾ انسان کا اپنے بارے میں اقرار شرعی طور پر معتبر ہے۔ ﴿8﴾ جس کے ذمے حق ہے اس پر حرام ہے کہ وہ ظاہری اچھائی، مقدار یا مدت میں کمی کرے۔

سوال 6: قرض دار دستاویز میں کیا تحریر کروائے گا؟

جواب: ﴿1﴾ قرض کا اعتراف کرے گا۔ ﴿2﴾ قرض کی مقدار لکھوائے گا۔ ﴿3﴾ قرض کی طے شدہ شرائط لکھوائے گا۔ ﴿4﴾ قرض کی مدت لکھوائے گا۔

سوال 7: ﴿وَلْيَتَّقِ اللَّهَ تَابَهُ وَلَا يَبْحَسْ مِنْهُ شَيْئًا﴾ ”اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈر جائے جو اس کا رب ہے اور اس میں سے کچھ نہ کم کرے“ قرض دار کے لیے رب کی جانب سے کیا نصیحت ہے؟

جواب: قرض دار کے لیے رب کی جانب سے نصیحت ہے کہ وہ دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف رکھے، گھٹائے بڑھائے نہیں اور نہ کوئی بات چھپائے۔

سوال 8: اگر قرض دینے والا تحریر لکھوائے تو کیا زیادتیاں سامنے آ سکتی ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ وہ قرض کی شرائط میں اضافہ کر سکتا ہے۔ ﴿2﴾ وہ قرض میں اضافہ کر سکتا ہے۔ ﴿3﴾ مدت مقررہ میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ ﴿4﴾ اپنی مصلحت اور مفادات کے تحت کچھ شرائط لکھ سکتا ہے۔ ﴿5﴾ قرض دینے والے کی پوزیشن مضبوط ہوتی ہے اور قرض دار چونکہ ہر صورت میں سودا کرنا چاہتا ہے اپنی سخت ضرورت کی وجہ سے اس صورت میں قرض دینے والے کی جانب سے زیادتی ہو سکتی ہے۔

سوال 9: ﴿فَإِنْ كَانَ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ حَقِّ سَفِينًا أَوْ صَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَفِيحُ أَنْ يُبَيِّنَ لَهُ فَلَئِنَّ لَهُ بِالْعَدْلِ﴾ ”پھر جس شخص کے ذمے حق (قرض) ہو اگر وہ نا سمجھ یا کمزور ہو یا خود لکھوانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس کے مختار پر لازم ہے کہ انصاف کے ساتھ لکھوائے“ قرض دار خود کب المانہ کروائے؟

جواب: ﴿1﴾ قرض دار خود المانہ نہ کروائے جب قرض دار نادان ہو یعنی کم سن ہو، کم عقل ہو، ضعیف ہو، گونا گوا ہو یا بہت بوڑھا ہو یا احمق ہو مضمون لکھوانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی عدل کے ساتھ لکھوائے۔ ﴿2﴾ قرض دار کی سفاہت سے مراد ہے اپنے معاملات اچھی طرح طے نہ کر سکتا، ان پڑھ اور جاہل ہونا اور اچھے طریقے سے مالی تصرف نہ کر سکتا۔ ﴿3﴾ قرض دار کے ضعیف ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ عمر میں کم ہو، عقل میں کمزور ہو یا عمر بہت بڑی ہو یا زبان میں لکنت ہو۔ ﴿4﴾ جو عدل قرض دار پر واجب ہے وہ اس کے سرپرست پر بھی واجب

ہے۔ ﴿5﴾ عدل شرط ہے کیونکہ فاسق عدل سے نہیں لکھوا سکتا۔ ﴿6﴾ اس سے مالی معاملات میں سرپرستی کا ثبوت ملتا ہے۔ ﴿7﴾ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سرپرست کے ذمے حق واجب نہیں ہوتا۔ بچے، کم عقل، مجنون اور کمزور کے ذمے واجب ہوتا ہے۔

سوال 10: ﴿وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رَجَالِكُمْ﴾ اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنا لو، کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے تحریر کے ساتھ دو عادل مردوں کو گواہ بنانے کا حکم دیا۔ تین شخص ہیں جو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں لیکن قبول نہیں کی جاتی ایک تو وہ کہ جس کے گھر بد اخلاق عورت ہو اور وہ اسے طلاق نہ دے دوسرا وہ شخص جو کسی یتیم کا مال اس کی بلوغت سے پہلے اسے سونپ دے، تیسرا وہ شخص جو کسی کو مال قرض دے اور گواہ نہ رکھے۔ (تفسیر ابن کثیر: 381/1) ﴿2﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: دو عادل مردوں کو گواہ بنانے سے مراد ہے فضل اور دین والے۔ (زاد المسیر: 291/1) ﴿3﴾ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لیں دین کے معاملات میں گواہ بنانا مشروع ہے۔ یہ مشروعیت مندوب ہے۔ ﴿4﴾ اگر تصرف کرنے والا یتیم کا سرپرست ہو یا کسی وقف کا نگران ہو یا ایسا معاملہ ہو جس کی حفاظت واجب ہو تو حق کو محفوظ رکھنے والی گواہی واجب ہو جائے گی۔ (تفسیر سعدی: 330/1) ﴿5﴾ بالغ غلام کی گواہی بھی مقبول ہے۔ ﴿6﴾ غیر مسلم مردوں یا عورت ان کی گواہی مقبول نہیں کیونکہ گواہی کے لیے عدل (نیک، قابل اعتماد) کی شرط ہے اور غیر مسلم ”عدل“ نہیں۔

سوال 11: ﴿فَإِنْ لَمْ يَكُنَا جُحَلِينَ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتْنِ مِنَ الشَّاهِدَاتِ﴾ پھر اگر دوسرے ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جنہیں تم گواہوں میں سے پسند کرتے ہو، کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿فَإِنْ لَمْ يَكُنَا جُحَلِينَ﴾ یعنی دو مرد گواہی کے لئے اگر میسر نہ آئیں ﴿فَرَجُلٌ﴾ تو ایک مرد ﴿وَامْرَأَتْنِ﴾ اور دو عورتیں۔ ﴿2﴾ ایک مرد کو دو عورتوں کے مقابلے میں رکھا گیا کیونکہ مرد کا حافظہ مضبوط ہوتا ہے۔ ﴿3﴾ یہودی قانون میں گواہی صرف مردوں کی معتبر ہے اور عورت کی شہادت سرے سے قابل تسلیم نہیں، اسلام نے اسے یہ حق تو دیا ہے لیکن ساتھ ہی اپنے علم کامل اور تحقیق مطلق کی بنا پر عورت کی گواہی کا مرتبہ مرد کے مقابلہ میں نصف مانا ہے۔ (تفسیر ماجدی: 513/1) ﴿4﴾ حدیث سے ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ کرنا ثابت ہے۔ ﴿5﴾ دو عورتیں جب ایک مرد گواہ کے برابر ہیں تو دو عورتوں اور قسم کے ساتھ فیصلہ کرنا جائز ہوگا۔ (فتح القدیر) ﴿6﴾ اس آیت سے عورت کی گواہی کے بارے میں یہ پتہ چلتا ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ ﴿7﴾ مرد کے بغیر صرف اکیلی عورت کی گواہی جائز نہیں سوائے ان معاملات کے جن کے بارے میں عورت کے علاوہ دوسرے نہیں جان سکتے۔

سوال 12: اسلام نے عورت پر گواہی کی ذمہ داری کیوں نہیں ڈالی؟

جواب: عورت مرد کے مقابلے میں زودورنچ، زود مشتعل اور جلد بازی میں جذباتی فیصلہ کرنے والی ہے، نیز عقل اور دورانہدیشی میں کمزور ہے۔ علمائے نفسیات و طبیعات بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ فرید وجدی لکھتے ہیں: ”عورت کی جسمانی ساخت بچوں کی جسمانی ترکیب سے قریب تر ہوتی ہے، اس لیے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ وہ بچوں ہی کی طرح جلد متاثر اور منفعل ہو جاتی ہے۔ فرحت

و کلفت، خوف و مسرت کے احساسات جلد ہی اس پر طاری ہو جاتے ہیں اور چونکہ اس میں عقلیت اور غور و فکر کی قوت کو زیادہ دخل نہیں ہوتا اس لیے جلد ہی یہ تاثرات اس سے زائل بھی ہو جاتے ہیں اور اکثر دیر پا ثابت نہیں ہوتے۔ اس بنا پر عورت متلون اور غیر مستقل مزاج ہوتی ہے، اور اشتراکی فلسفی کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں: ”عورت کا وجدان مرد کے وجدان سے کمزور ہوتا ہے جتنی کہ اس کی عقل مرد کی عقل سے کم ہوتی ہے اس کے اخلاقی پیمانے بھی مرد سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے بالکل ضروری نہیں کہ جس کو وہ اچھا یا برا بتائے واقعی وہ اچھا یا برا ہو۔“ (دائرة المعارف (عربی) فرید وجدی 596/8 بحوالہ ”معاشرتی مسائل دین فطرت کی روشنی میں“ مؤلفہ مولانا برہان الدین) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اے عورتوں کے گروہ! صدقہ کرتی رہا کرو اور کثرت سے استغفار کرتی رہا کرو کیونکہ میں نے دوزخ والوں میں سے زیادہ تر عورتوں کو دیکھا ہے۔“ ان عورتوں میں سے ایک عقل مند عورت نے عرض کیا کہ ہمارے کثرت سے دوزخ میں جانے کی وجہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم لعنت بہت کثرت سے کرتی ہو اور اپنے خاندان کی ناشکری کرتی ہو۔ میں نے تم عورتوں سے بڑھ کر عقل اور دین میں کمزور اور سمجھ دار مردوں کی عقلوں پر غالب آنے والی نہیں دیکھیں، اس عقل مند عورت نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! عقل اور دین کا نقصان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”عقل کی کمی تو یہ ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے اور دین کی کمی یہ ہے کہ ماہواراری کے دنوں میں نہ تم نماز پڑھ سکتی ہو اور نہ ہی روزہ رکھ سکتی۔“ (صحیح مسلم: 241)

سوال 13: گواہی دینا حق ہے یا ذمہ داری؟

جواب: اسلام نے عورت پر گواہی کی ذمہ داری نہیں ڈالی کیونکہ گواہی دینا نہایت اہمیت کی حامل ذمہ داری ہے۔ اسی لئے گواہ کا عاقل و بالغ ہونا، عادل ہونا لوگوں کے درمیان قابل اعتبار ہونا اس کی لازمی شرائط میں سے ہے۔ ذمہ داریوں کی تقسیم ہمیشہ دائرہ کار کے اعتبار سے ہوتی ہے اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں تو اکیلی عورت کی گواہی بھی معتبر ہے اور کہیں دو عورتوں کی گواہی ناگزیر قرار دی گئی۔ ﴿1﴾ وہ معاملات جو عورتوں سے متعلق ہیں مثلاً ولادت، بکارت یعنی کنوارہ پن، بالغ یا نابالغ، لیڈی ڈاکٹر کی شہادت پر رخصت، بچہ زندہ پیدا ہوا یا مردہ، حمل کی مدت کا تعین، زندہ پیدا ہونے والے کی صورت میں نماز جنازہ وغیرہ جیسے معاملات میں تنہا عورت کی گواہی قابل قبول ہے۔ فتح القدر اور تفسیر روح المعانی میں اسی کی وضاحت کی گئی ہے۔ امام زہری کہتے ہیں: سنت یہ رہی ہے کہ تنہا عورتوں کی گواہی ان معاملات میں جائز ہے جن سے عورتوں کے ماسوا کوئی واقف نہیں ہوتا یعنی پیدائش اور ان کے عیوب ان معاملات میں مرد کی گواہی کی تائید کی ضرورت نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ایسے معاملات میں جن پر مرد مطلع نہیں ہو پاتے، تنہا عورتوں کی گواہی کے قبول کرنے پر سب کا اتفاق ہے جس طرح حیض، ولادت اور استحاضہ عورتوں کے عیوب ہیں۔ (فتح الباری: 328/5) ﴿2﴾ قرض کا لین دین، کاروبار اور خرید و فروخت کے معاملات وغیرہ معاشی امور مرد کی ذمہ داریوں سے متعلق ہیں۔ اس بارے میں اسلام کا مؤقف یہ ہے کہ اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنا لیا کرو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ (صحیح بخاری: 2658) نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

عورت کی گواہی مرد کے مقابلے میں آدھی ہے۔ (صحیح بخاری: کتاب الحیض) ﴿3﴾ حدود و قصاص سے متعلق معاملات مثلاً قتل، زنا، چوری، تہمت تراشی، ڈکیتی وغیرہ کے لئے عینی گواہ چاہئیں۔ اس کے لئے اسلامی مؤقف یہ ہے اگر مرد نہ ہوں تو دو عورتوں کا متبادل انتظام کیا جائے۔ لیکن دو مرد موجود ہیں تو عورت کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت کا اصل دائرہ کار گھر ہے۔ عورت پڑھی لکھی بھی ہو، کچھری جانے سے گھبراتی ہے۔ چلی جائے تو جرح میں بسا اوقات بھول جاتی ہے یا غلط بات کہہ بیٹھتی ہے اور پھر حیض، نفاس، حمل، زچگی، رضاعت وغیرہ کے معاملات میں جو اس کی ذمہ داریاں ہیں اس کے اندر چڑچڑاپن اور جذباتی پن پیدا کر دیتے ہیں جب کہ گواہی کے لئے سوچ بچار، ٹھنڈے دل و دماغ سے حقائق کو بلا کم و کاست بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔ عورت کی فطری ذمہ داریاں اس کے اندر جذباتی تلاطم پیدا کرتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے گواہی کا عمل متاثر ہوتا ہے۔ ﴿4﴾ روایت حدیث کے حوالے سے تمام علماء اور فقہاء نے عورت کی گواہی پر اعتماد کیا ہے۔ بعض احادیث کی سندوں میں کئی کئی خواتین موجود ہیں۔ امام بخاری، امام مسلم اور امام ترمذی نے یہ روایات قبول کی ہیں جو عورت پر اعتماد کی دلیل ہیں۔ پھر حدیث کی روایت کو قبول یا رد کرنے کے معاملے میں عورتوں کی حدیث کے راویوں پر جرح کو قبول کیا ہے اور اس پر کسی راوی سے حدیث کی روایت کو قبول کرنے یا رد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ﴿5﴾ عورت کی آدھی گواہی عین انصاف ہے۔ عورت اور مرد کا مزاج، فطرت اور دائرہ کار الگ الگ ہیں۔ عورت اپنے دائرہ کار کے اندر ہونے والے واقعات کا تو جزئیات سے مشاہدہ کر سکتی ہے لیکن جو معاملات مرد کے دائرہ کار سے متعلق ہیں یعنی گھر کے باہر کے معاملات اس میں اس کی عدم دلچسپی کی وجہ سے جزوی معاملات کو درست انداز میں نہ تو حافظے میں محفوظ رکھ سکتی ہے نہ اسے صحیح انداز میں بیان کر سکتی ہے۔ ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر ہارڈنگ اپنی کتاب The Way of All Women میں یہ وضاحت کرتا ہے کہ عورت تفصیلی جزئیات یاد نہیں رکھ سکتی اور یاد رکھ لے تو صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتی۔ قرآن حکیم اس بارے میں کہتا ہے: ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ﴾ اور وہ جھگڑے میں بات واضح کرنے والی نہیں ہے۔ (الزخرف: 18) عورت کی اس کمزوری کی وجہ سے عدالت میں گواہی خراب ہوتی ہے۔ اسی سے دو عورتوں کی شہادت کی حکمت پتہ چلتی ہے۔ عورت کے مزاج، اس کی طبیعت اور اس کے فطری کاموں کے حوالے سے اس کو گواہی جیسی اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ کرنے کا یہ اسلامی مؤقف انصاف ہے کہ اپنے معاملات میں گواہی دے لو۔ پوری گواہی ہے۔ مرد نہ ملیں تو دوسرے معاملات میں بھی گواہی دے سکتی ہے۔ اجازت ہے لیکن بوجھ نہیں ڈالا گیا۔ (اسوہ رسول ﷺ اور عورت کے بارے میں غلط فہمیاں) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: مردوں کی نسبت عورتوں کا کمزور ہونا ایسے عام مشاہدے کی بات ہے جو کسی خاص دلیل کی محتاج نہیں۔ (فتح الباری، الجنازہ: 233/3)

سوال 14: گواہی کا کام مردوں کے سپرد کیوں کیا گیا ہے؟

جواب: اسلامی معاشرے میں معاشی جدوجہد کی ذمہ داری عورت پر نہیں ہے اور عام طور پر خواتین حصول معاش میں مصروف نہیں ہوتیں۔ اسلامی معاشرے میں عورت کی ذمہ داریوں کی نوعیت مختلف ہے۔

سوال 15: اسلامی معاشرے میں عورت کی ذمہ داری کیا ہے؟

جواب: انسانیت کے سب سے بڑے سرمائے یعنی بچوں کی تربیت اور پرورش کرنا۔ بچے مستقبل کے نمائندے ہوتے ہیں۔

سوال 16: ﴿مَنْ تَرَضَّوْنَ مِنَ اللّٰهِ هَآءِ﴾ ”ان لوگوں میں سے جنہیں تم گواہوں میں سے پسند کرتے ہو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس سے مراد فضیلت والے اور دین والے ہیں۔ ﴿2﴾ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شہادت درست نہیں خائن مرد کی، نہ خائن عورت کی، نہ اس شخص کی جس کو کوڑے مارے گئے ہوں، نہ کسی دشمن کی اپنے (دشمن) بھائی کے خلاف، نہ قانع کی اپنے گھر والوں کے لیے، نہ اس شخص کی جس پر ولادت یا قرابت کا گمان کیا گیا ہو (یعنی باپ کی بیٹی کے لیے یا بیٹی کی باپ کے لیے یا کسی رشتہ دار کی رشتہ دار کے لیے)۔ (ترمذی)

سوال 17: گواہی کے لیے گواہ کے اندر کون سی خصوصیات ہونی لازمی ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ عدل۔ ﴿2﴾ افراد معاشرہ میں اس کی گواہی قابل قبول ہو۔ ﴿3﴾ قرض کے دونوں فریق گواہوں پر راضی ہوں۔

سوال 18: ﴿اَنْ تَحْمِلَ اِحْلٰهُمَا فَاَنْتَا كَمَنْ اِحْلٰهُمَا الْاُخْرٰى﴾ ”تا کہ ان دونوں (عورتوں) میں سے ایک بھول جائے تو ان میں سے ایک کو دوسری یاد کرادے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے: ﴿1﴾ امام رازی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں: ”مطلب یہ ہے کہ نسیان عورتوں کی طبیعتوں پر غالب ہے ان کے مزاج میں ٹھنڈک اور رطوبت کی کثرت کی وجہ سے اور دو عورتوں کا نسیان پر جمع ہونا عقلاً ایک عورت سے نسیان کے صدور سے زیادہ بعید ہے۔ اس لیے دو عورتوں کو ایک مرد کے قائم مقام کیا گیا ہے تاکہ ایک عورت اگر بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرادے۔ آیت کا مقصود یہی ہے۔“ (تفسیر کبیر: 113/7) ﴿2﴾ علامہ جمال الدین قاسمی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں: ”جب ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی کو ضروری قرار دے دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی علت یہ بیان فرمائی کہ ان عورتوں میں ضبط کی کمی ہے۔ (اور عورت کے بھولنے کا امکان ہے) اس لیے فرمایا کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد کرادے۔“ (تفسیر قاسمی: 382) ﴿3﴾ امام شافعی رضی اللہ عنہ کی والدہ گواہی دینے کے لئے عدالت میں آئیں۔ قاضی نے ان سے گواہی لینے کے بعد دوسری عورت سے کہا کہ اب تم بتاؤ تو انہوں نے کہا رک جائیے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ ایک بھولے تو دوسری یاد دلائے۔ جب میں بھولی ہی نہیں تو دوسری کیوں یاد دلائے۔ اسی سے پتہ لگتا ہے استثناء کی صورت حال ہو سکتی ہے۔ (اسوۃ رسول ﷺ اور عورت کے بارے میں غلط فہمیاں)

سوال 19: عورت بھولتی کیوں ہے؟

جواب: ﴿1﴾ عورت کو معاہدوں کا زیادہ تجربہ نہیں ہوتا اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ معاہدے کے حالات اور شرائط اس کے ذہن میں پوری طرح نہ بیٹھیں اور گواہی اچھی طرح نہ دے سکے۔ ﴿2﴾ عورت دباؤ قبول کرتی ہے، زیادہ حساس اور زیادہ جذباتی ہوتی ہے۔

سوال 20: ﴿وَلَا يَأْتِ اللَّهُمَّ آخِراً إِذَا مَا دُعُوا﴾ ”اور گواہ انکار نہ کریں جب بھی انہیں گواہی کے لیے بلا یا جائے“ کی وضاحت کریں؟
جواب: گواہوں کو جب گواہی کے لیے بلا یا جائے تو وہ انکار نہ کریں، گواہی کو قبول کریں۔ سیدنا زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”کیا میں تمہیں بہترین گواہوں کی خبر نہ دوں؟ یہ وہ ہیں جو گواہی کے طلب کرنے سے پہلے ہی گواہی دے دیں۔“ (صحیح مسلم: 4494)

سوال 21: گواہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا پابندیاں ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ گواہی دینا فریضہ ہے حق کو واضح کرنے اور عدل کو قائم کرنے کے لیے۔ اس لیے گواہ دل کی خوشی اور شعور کی آمادگی کے ساتھ گواہی دیں۔ ﴿2﴾ گواہ نقصان کا احساس کیے بغیر بلا ہچکچاہٹ گواہی دیں۔ ﴿3﴾ مقدمے کے فریقین میں سے کسی پر احسان نہ کریں چاہے وہ ایک فریق کی طرف سے بلائے جائیں یا دونوں کی طرف سے۔

سوال 22: ﴿وَلَا تَسْمُوا أَنْ كُنْتُمْ ذَا صَبْرٍ أَوْ كُنْتُمْ إِلَىٰ آجِلٍ﴾ ”اور تم اس سے نہ اکتاؤ کہ تم اسے لکھو، معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی مقررہ مدت تک“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور تم اس سے نہ اکتاؤ کہ تم اسے لکھو، معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی مقررہ مدت تک“ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرض چھوٹے ہوں یا بڑے سب لکھنے چاہئیں۔ قرض کی مدت، اس کی شرائط اور قیود لکھنا ضروری ہے۔ ﴿2﴾ ﴿وَلَا تَسْمُوا﴾ اور تم اس سے نہ اکتاؤ کیونکہ اکتاہٹ کا اظہار کرنے سے اللہ تعالیٰ نے روک دیا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کا حکم انصاف پر مبنی ہے اس لیے لکھنے کی تاکید ہے کیونکہ تحریر سے گواہی مضبوط ہو جاتی ہے، انصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور گواہی درست رہتی ہے۔ ﴿4﴾ گواہ کے فوت ہونے یا غائب ہونے کی صورت میں تحریر کام آتی ہے اور دونوں فریق شک و شبہ سے محفوظ رہتے ہیں۔ ﴿5﴾ انسان سستی تب کرتا ہے جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ کسی کام کے لیے کی جانے والی محنت اس کی قدر و قیمت سے زیادہ ہے تو اس وقت انسان وہ کام کرنے سے کتراتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سستی سے بچانے کے لیے تحریر کے فوائد اور حکمتیں واضح کی ہیں تاکہ چھوٹے بڑے قرض کے معاملے میں دل کی خوشی اور آمادگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق انسان تحریر کا اہتمام کرے۔

سوال 23: ﴿ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَا تَرْتَابُوا﴾ ”یہ کام اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ انصاف والا ہے اور گواہی کو زیادہ قائم رکھنے والا ہے اور زیادہ فریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ﴾ ”یہ کام اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ انصاف والا ہے“ قرض کی دستاویز بنانا زیادہ انصاف والا معاملہ ہے۔ کسی معاملے میں زبانی گواہی کے مقابلے میں تحریری گواہی کے ساتھ انصاف زیادہ سہولت سے کیا جاسکتا ہے۔ ﴿2﴾ ﴿وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ﴾ ”اور گواہی کو زیادہ قائم رکھنے والا ہے“ اللہ تعالیٰ کا لکھنے کا حکم زیادہ انصاف پر مبنی ہے جو گواہی کو مضبوط کر دیتا ہے۔ تحریری شہادت

سے گواہی مضبوط ہو جاتی ہے، بھولی ہوئی بات یاد آ جاتی ہے اور شک جاتا رہتا ہے کیونکہ تحریر موجود ہے، گواہ کی وفات ہو سکتی ہے، وہ بھول سکتا ہے، وہ غائب ہو سکتا ہے جب کہ تحریری شہادت موجود ہونے کی وجہ سے جھگڑے سے بچا جاسکتا ہے۔ ﴿3﴾ ﴿وَأَذِّنْ لِلْقَائِمِينَ﴾ اور زیادہ قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو، قرض کے معاملے میں انسان کو شک لاحق ہو سکتے ہیں کبھی معاہدے میں شامل بیانات پر۔ کبھی دل کے اندر شک ابھرتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے دلوں میں شکوک آ جاتے ہیں۔ کسی بھی معاملے میں شک ہو سکتا ہے۔ ﴿4﴾ اس سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ جسے گواہی میں شک ہو جائے اسے گواہی دینے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اس کے لیے یقین ضروری ہے۔ (تفسیر سعدی: 331/1) ﴿5﴾ زبانی گواہی کا دار و مدار حافظے پر ہوتا ہے اور تحریری گواہی میں چونکہ موقع پر فریقین کی رضامندی پر گواہوں کی تصدیق کا ریکارڈ ہوتا ہے اس لیے شک کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔

سوال 24: ﴿إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً لِذَيْرِزْوَنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُمُوهَا وَأَشْهَدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ﴾ ”مگر یہ کہ تجارت نقد ہو جس کا لین دین کرتے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہ ہوگا کہ تم اس کو نہ لکھو اور جب تم آپس میں سودا کرو تو گواہ بنا لیا کرو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ معاملہ اگر نقد ہو تو اسے لکھنے کی ضرورت نہیں یعنی نہ لکھنے کی اجازت ہے۔ ﴿2﴾ روزمرہ کے تجارتی لین دین کے لیے قانون میں رخصت ہے کیونکہ ہر کام میں تحریر کو لازم کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تجارتی اور کاروباری سرگرمیوں میں رکاوٹیں پیدا ہو جائیں اس لیے کہ روزمرہ کی تجارتی سرگرمیاں تیزی سے ہوتی ہیں اور مختصر وقت میں ہوتی ہیں۔ ﴿3﴾ اسلام قانون زندگی کی بہتری کے لیے بناتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے تمام حالات کے مطابق قانون بناتا ہے۔ یہ قانون عملی ہے اس میں کوئی پیچیدگی نہیں، اس کی وجہ سے زندگی کے کاموں کی رفتار میں کمی نہیں آتی۔ ﴿4﴾ ﴿وَأَشْهَدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ﴾ اور جب تم آپس میں سودا کرو تو گواہ بنا لیا کرو، نقد لین دین میں تحریر نہ کرنا تو جائز ہے تاہم اس میں گواہ بنانا مشروع ہے۔ (تفسیر سعدی: 331/1) ﴿5﴾ اس سے مراد ہے کہ جب تم میں سے کوئی ایک کوئی گھریا باغ یا جانور خریدے تو اس تجارت پر گواہ کر لیا کرے۔ (ایر تقاویہ: 151) ﴿6﴾ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب آپ تجارت کرو تو اس پر گواہ کر لیا کرو خواہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ (جامع البیان: 314/1)

سوال 25: ﴿وَلَا يُضَآرُّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ﴾ ”اور کسی کاتب کو اور کسی گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَلَا يُضَآرُّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ﴾ ”اور کسی کاتب کو اور کسی گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے“ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ کسی کاتب اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اس سے جھوٹی بات نہ لکھوائی جائے۔ گواہ کو جھوٹی گواہی کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ ﴿2﴾ گواہ کو نقصان پہنچانے سے مراد ہے کہ انہیں دور کے علاقے سے بلوایا جائے جس سے ان کی تجارت اور مصروفیات میں حرج ہو یا گواہ کو جھوٹی گواہی پر مجبور کیا جائے۔ ﴿3﴾ کاتب اور گواہ کو مکمل تحفظ اسلامی ریاست کی جانب سے حاصل ہوتا ہے۔

سوال 26: گواہی کا چھپانا کیسا نفل ہے؟

جواب: ﴿1﴾ گواہی چھپا کر انسان کے اندر مجرمانہ ذہنیت پر وان چڑھتی ہے۔ ﴿2﴾ انسان جب گواہی چھپاتا ہے تو معاملات میں انصاف کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ ﴿3﴾ انسان کا ضمیر یہ چاہتا ہے کہ حق کا اعتراف کرے اور ناحق کا اعلان کرے۔ جو شخص مصلحتاً اپنی زبان بند رکھتا ہے وہ اپنے جرم پر خود گواہ بن جاتا ہے۔

سوال 27: ﴿وَأَنْتُمْ لَكُمْ مَسْئُورَةٌ﴾ اور اگر تم ایسا کرو گے تو یقیناً وہ تمہاری بڑی نافرمانی ہوگی کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اور اگر تم ایسا کرو گے تو یقیناً وہ تمہاری بڑی نافرمانی ہوگی، فسق کسی بھی انسان میں کم یا زیادہ موجود ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم فاسق ہو بلکہ یہ فرمایا کہ تمہارے اندر نافرمانی ہے۔ ﴿2﴾ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گواہ کا عادل یا فاسق ہونا معلوم نہ ہو تو اس کی گواہی بھی قبول نہیں حتیٰ کہ اس کے نیک ہونے کی تصدیق ہو جائے۔ (تفسیر سعدی: 1/332)

سوال 28: فسوق سے کیا مراد ہے؟

جواب: سیدنا انس رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم کو سب سے بڑے گناہ نہ بتا دوں، شرک اور والدین کی نافرمانی۔ نبی اقدس ﷺ اس وقت تکلیف کا سہارا لگائے ہوئے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا سن لو اور جھوٹ بولنا، سن لو اور جھوٹی شہادت دینا، نبی ﷺ ان الفاظ کو بار بار فرماتے رہے یہاں تک کہ ہم نے (دل میں) کہا کہ کاش نبی ﷺ خاموش ہو جاتے۔ (تفسیر مظہری: 2/93)

سوال 29: ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈراؤ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈراؤ، اللہ تعالیٰ سے اس کے احکامات کے بارے میں ڈراؤ۔ اس کے اوامر کو پورا کرو۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھ کر اس کی اطاعت کرو۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کے نواہی سے اجتناب کرو۔ (ایرا التفاسیر)

سوال 30: ﴿وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمہیں تعلیم دیتا ہے کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تعلیم دی ہے تمہارے لیے واضح کیا ہے اس لیے اس کے حکم پر عمل کرو۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے قانون کی اطاعت کے لیے احساس دلایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تعلیم ہے، یہ اس کا فضل ہے اس لیے اس پر بھروسہ رکھو۔

سوال 31: ﴿وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ہونے سے مومن کے ضمیر کو جگایا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے قانون کی اطاعت کے لیے احساس دلایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تعلیم ہے، اس کا فضل ہے اس لیے اس پر بھروسہ رکھو کہ وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ ہی ایسا قانون دے سکتا ہے جو سب کے لیے مفید ہو۔

سوال 32: ﴿عَلَيْكُمْ﴾ ”خوب جاننے والا“ اللہ تعالیٰ نے اپنے علیم ہونے کا شعور کس مقصد کے تحت دلایا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے قرض کے معاملے میں دی جانے والی ہدایات کو قبول کرنے کے لیے یہ شعور دلایا ہے کہ قانون تمہیں ایک علیم ہستی کی طرف سے سکھائے جا رہے ہیں اس لیے ان کو قبول کر لو۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنا خوف پیدا کرنے کے لیے اپنے علیم ہونے کا شعور دلایا ہے تاکہ اس خوف کی وجہ سے اس کی ہدایت قبول کر لیں۔

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنَ مَقْبُوضَةً ۖ فَإِنْ أَقْرَبْتُمْ بَعْضُكُمْ بِعَضَا فَلَئِمَّا الَّذِي أَوْثَقْتُمْ بِأَمَانَتِهِ وَلِيَتَّقِيَ اللَّهُ رَبَّهُ ۗ وَلَا تَكُونُوا الشَّاهِدَةَ ۗ وَمَنْ يَكْتُم بِالْإِيمَانِ فَلَمَّا قِيلَ لَهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿283﴾﴾

”اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو قبضے میں دیا گیا رہن لازم ہے پھر اگر تم میں سے کوئی کسی پر اعتبار کرے تو جس پر اعتماد کیا گیا اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی امانت ادا کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو اس کو چھپائے گا تو یقیناً اس کا دل گناہ گار ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے۔“ (283)

سوال 1: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنَ مَقْبُوضَةً﴾ ”اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو قبضے میں دیا گیا رہن لازم ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ“ اگر تم سفر میں ہو اور کتاب نہ پاؤ تو تحریر کی بجائے قرض دینے والے کے پاس کوئی چیز گروی رکھ کر اس کے قبضے میں دے دو۔ اگر تمہیں کتاب نہ ملے جو تحریر لکھ دے جس سے بات قابل اعتماد ہو جائے۔ ﴿2﴾ ﴿فَرِهْنَ مَقْبُوضَةً﴾ ”تو رہن قبضے میں رکھ لیا کرو۔ قرض دینے والا اسے قبضے میں رکھے گا۔ یہ اس کے پاس ضمانت ہے کہ قرض واپس مل جائے گا۔ رہن کے ساتھ قبضے کی شرط ہے۔ بلا قبضہ کوئی رہن نہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ نبی ﷺ نے ایک یہودی سے کچھ غلہ ایک مدت مقرر کر کے ادھار خریدا اور اپنے لوہے کی ایک زرہ اس کے پاس گروی رکھی۔ (بخاری: 2068) ﴿3﴾ اگر رہن رکھی ہوئی چیز پر قرض دینے والے کا قبضہ نہ ہو تو ضمانت نہیں ملتی۔ ﴿4﴾ اگر رہن رکھی ہوئی چیز کی مقدار کے بارے میں اختلاف ہو جائے تو رہن رکھ کر قرض دینے والے کے قول کو قبول کیا جائے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے رہن کو تحریر کے قائم مقام بنایا ہے۔ ﴿5﴾ رہن کا مقصد اعتماد اور اعتبار ہے۔ اس لیے سفر اور حضر دونوں میں جائز ہے۔ اس آیت میں سفر کا ذکر اس لیے ہے کہ سفر میں ہو سکتا ہے کہ کتاب نہ ملے۔ ﴿6﴾ رہن رکھنے کا حکم اس موقع کے لیے ہے جب قرض دینے والے کو تسلی نہ ہو۔

سوال 2: رہن رکھی ہوئی چیز کا کیا حکم ہے؟

جواب: رہن رکھی ہوئی چیز سے قرض خواہ کو خود فائدہ اٹھانے کا حق نہیں۔ رہن لیے ہوئے گھر میں خود رہنا یا اسے کرائے پر دینا سود کھانا ہے۔ اگر جانور رہن ہے تو فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ وہ چارے کا معاوضہ ہوگا۔

سوال 3: ﴿قُلْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا قُلُوبُهُمْ وَاللَّهُ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ أَمَانَةً وَيُؤْتِي اللَّهُ مَن يَشَاءُ رِزْقًا مِّنْ حَيْثُ يَشَاءُ وَلَا يَحِصُّهُ سَائِرُ النَّاسِ﴾ ”پھر اگر تم میں سے کوئی کسی پر اعتبار کرے تو جس

پر اعتماد کیا گیا اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی امانت ادا کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے“ کی وضاحت کریں؟
جواب: ﴿1﴾ ”پھر اگر تم میں سے کوئی کسی پر اعتبار کرے تو جس پر اعتماد کیا گیا اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی امانت ادا کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے“ اگر کوئی کسی کو امانت دار سمجھتا ہو اور اس کی امانت کا اعتبار ہو تو کتابت نہ کروانے اور گواہ نہ بنانے میں کوئی حرج نہیں۔ جس پر اعتماد کیا گیا ہو اسے اللہ تعالیٰ سے ڈر کر پوری امانت ادا کرنی چاہیے۔ قرض دینے والے کو اگر تسلی ہو تو وہ بغیر رہن کے معاملہ کر سکتا ہے، یعنی اگر تمہیں اعتبار ہے تو جس پر اعتبار ہے، امانت ادا کرے۔ ﴿2﴾ قرض لینے والے کو پورا قرض ادا کرنا چاہیے۔ ﴿3﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رب ہونے کا شعور دلا کر اپنی ذات سے ڈرایا ہے تاکہ قرض لینے والا احسن طریقے سے قرض ادا کر دیاور نیکی کا احسن بدلہ دے۔

سوال 4: رہن بالقرض Mortgage کا مقصد کیا ہے؟

جواب: قرض دینے والے کو اپنے قرض کی واپسی کا اطمینان ہو جائے۔

سوال 5: ﴿وَلَا تَكْتُمُوا لِلْهَادِثَةِ لَوْ مَن يَكْتُمُهَا فَإِنَّهُ أَوْمٌ قَلْبُهُ﴾ ”اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو اس کو چھپائے گا تو یقیناً اس کا دل گناہ

گار ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَلَا تَكْتُمُوا لِلْهَادِثَةِ﴾ ”اور گواہی کو نہ چھپاؤ“ شہادت نہ چھپاؤ یعنی امانت میں خیانت نہ کرو۔ گواہی چھپانا کبیرہ گناہ ہے۔ اس پر قرآن وحدیث میں سخت وعید آئی ہے۔ صحیح گواہی دینے کی بڑی فضیلت ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: سب سے بہتر وہ گواہ ہے جو گواہی طلب کرنے سے پہلے ہی خود گواہی کے لئے پیش ہو جائے۔ (صحیح مسلم، کتاب الاقضية) ﴿2﴾ گواہی چھپانے سے اس لیے روکا گیا کہ گواہی چھپانے والے کا دل گناہ گار ہوتا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے یہاں دل کے گناہ گار ہونے کا خصوصی ذکر اس لیے کیا ہے کہ ”کتمان“ گواہی کو چھپانا دل کا فعل ہے۔ اور دل تمام اعضاء کا سردار ہے باقی اعضاء اسی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ دل درست رہے تو سارا جسم درست رہتا ہے اور اگر یہ خراب ہو جائے تو سارا جسم فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔ ﴿4﴾ سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے سنا گیا، وہ کہتے تھے میں نے نبی ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے: سن لو! بدن میں گوشت کا ایک ٹوٹھڑا ہے، جب وہ درست ہوگا تو سارا بدن درست ہوگا اور جہاں وہ بگڑا، سارا بدن بگڑ گیا۔ سن لو! وہ ٹکڑا آدمی کا دل ہے۔“ (صحیح بخاری: 52)

سوال 6: ﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ﴾ ”اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے دل کی گناہ گاری کو دور کرنے کے لیے اپنے علیم ہونے کا شعور دلایا ہے کہ وہ تمہارے دلوں کے حال کو جانتا ہے اگر دل گواہی چھپائے گا تو کسی اور کے علم میں تو نہیں آسکتا لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور اللہ تعالیٰ سخت حساب لینے والا ہے لہذا اپنے

ہر عمل کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ۔

سوال 7: ﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ﴾ ”اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے“ یہ کہہ کر کس طرف توجہ دلانی جا رہی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے“ یہ کہہ کر توجہ دلانی گئی ہے کہ اپنے معاملات کی اصلاح کر لو۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ اپنے علم کے مطابق چھپے ہوئے دل کے حالات پر بھی جزا سزا دے سکتا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ہونے کا شعور دلایا ہے کہ وہ تمہارے دلوں کے حال کو جانتا ہے۔ اگر دل گواہی چھپائے گا تو کسی اور کے علم میں تو نہیں آسکتا لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور اللہ تعالیٰ سخت حساب لینے والا ہے لہذا اپنے ہر عمل کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ۔

رکوع نمبر 8

﴿لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحٰسِبْكُمْ بِهٖ ۗ وَاللَّهُ ۗ فَيُغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ ۗ﴾

﴿يَّشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (284)

”جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ تعالیٰ کا ہے اور جو تمہارے دلوں میں ہے اگر تم وہ ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ، اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے گا، پھر وہ جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے۔“ (284)

سوال 1: ﴿لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ﴾ ”جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ تعالیٰ کا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ تعالیٰ کا ہے“ اسی نے تخلیق کیا اور اسی کی ملکیت ہے۔ (تفسیر بیضاوی 583/1: ہر چیز اس کے قانون کی پابند ہے۔ ﴿2﴾ آسمانوں اور زمین کی ہر چھوٹی بڑی، کثیر اور قلیل چیز کا وہی مالک ہے اور انسان ہر وقت اپنے مالک کی نظر میں ہے اس کا ہر چھوٹا بڑا کام اس کے اندر ہو یا باہر اس کی نگرانی میں ہے۔ (جامع البیان: 3/153) ﴿3﴾ ہر چیز کی تدبیر وہی کرتا ہے، اس کو گھمانے پھرانے اور استعمال کے اختیارات اسی کے ہیں، اس سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں، کیونکہ وہ ہر چیز کا مدبر، مالک اور منتظم ہے۔ انسان کو بھی کائنات کی طرح پابند زندگی گزارنی ہے لیکن اپنے اختیار سے کیونکہ مالک نے ہر پوشیدہ اور ظاہری عمل کا حساب لینا ہے۔

سوال 2: ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحٰسِبْكُمْ بِهٖ ۗ وَاللَّهُ ۗ﴾ ”اور جو تمہارے دلوں میں ہے اگر تم وہ ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ، اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے گا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو تخلیق کیا، وہی رزق دیتا ہے۔ ہر طرح کے انتظامات وہی کرتا ہے۔ سب اس کی ملکیت میں ہیں اس کے غلام ہیں۔ سب اپنی ذات کے لیے نہ نفع کا اختیار رکھتے ہیں نہ نقصان کا، نہ موت کا نہ زندگی کا، نہ موت کے بعد جی اٹھنے کا۔ اللہ تعالیٰ سب کا رب ہے وہ اپنی حکمت سے جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ اس نے کچھ کام کرنے کا حکم دیا کچھ سے روکا ہے اس لیے وہ پوشیدہ اور ظاہر سب کا حساب لے گا۔ ﴿2﴾ ﴿وَأَنْ تُبَدَّوْا مَا لَكُمْ أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفَوْنَ﴾ اور جو تمہارے دلوں میں ہے اگر تم وہ ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ، مجاہد نے کہا: یقین اور شک میں سے ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ، اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے گا۔ (الدر المنثور: 1/663) ﴿3﴾ جو چیز بھی دل میں قرار پکڑے اور اعمال سے ظاہر ہو مثلاً کینہ حسد وغیرہ، اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لے گا۔ ﴿4﴾ ﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ﴾ اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور اسے جو سینے چھپاتے ہیں۔ (غافر: 19) ﴿5﴾ وہ خالق و مالک سب کچھ جانتا ہے، اسے کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا ہر وقت علم ہے، اسے ظاہر و باطن کی ہر وقت خبر ہے یہاں تک کہ انسان کے دل میں جو وسوسے آتے ہیں ان کو بھی وہ خوب جانتا ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعَلْنَاهُ مَأْثُورًا وَسَوَّيْنَاهُ نَفْسَهُ وَعَضْنَاهُ الرِّبَّيْنَ وَيَسْمَعُ الْكَلِمَ الْغَوِيَّةَ﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم ان کو جانتے ہیں جن کا وسوسہ اس کا نفس ڈالتا ہے اور ہم رگ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ (ق: 16) ﴿6﴾ اس کی رحمت ہے کہ صرف ان وسوسوں اور ارادوں پر وہ مؤاخذہ کرتا ہے جن کو دل میں پختہ کر لیا جائے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿لَا يَأْخُذُكُمْ بِاللَّغْوِ فَإِنِّي أَنَا نَكَمٌ وَلَئِن لَّمْ يَؤْمُرْكُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ قُلُوبُكُمْ وَأَلَّوْا بِغَفْوَةٍ لَّخَالِفِينَ﴾ اللہ تعالیٰ تمہاری لغو قسموں پر تمہیں نہیں پکڑتا، وہ اس کی وجہ سے تمہیں پکڑتا ہے جو تمہارے دلوں نے کمایا اور اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا، نہایت بردبار ہے۔ (البقرہ: 225) ﴿7﴾ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے میری امت سے دل میں آنے والی باتوں کو معاف کر دیا ہے البتہ ان پر گرفت ہوگی جن پر عمل کیا جائے یا جن کا اظہار زبان سے کیا جائے۔“ (صحیح بخاری) ﴿8﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ کسی برائی کا ارادہ کرے تو اسے نہ لکھو اور اگر اس برائی کو وہ میرے خوف سے چھوڑ دے تو اس کے حق میں ایک نیکی لکھو اور اگر بندہ کوئی نیکی کرنا چاہے تو اس کے لئے ارادہ پر ہی ایک نیکی لکھو اور اگر وہ اس نیکی کو کر لے تو اس جیسی دس نیکیاں اس کے لیے لکھو۔ (صحیح بخاری: 7501) ﴿9﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کچھ لوگ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہ ﷺ! کبھی کبھی تو ہمارے دل میں ایسے وسوسے اٹھتے ہیں کہ زبان سے ان کا بیان کرنا بھی ہم پر گراں گزرتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا واقعی تم اسی طرح پاتے ہو (یعنی گناہ سمجھتے ہو)؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ صریح ایمان ہے۔“ (صحیح مسلم: 340) ﴿10﴾ برائی کا پختہ ارادہ کرنا گناہ ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: جب دو مسلمان تلواروں کے ساتھ ملتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: قاتل کا جہنمی ہونا تو ٹھیک ہے لیکن مقتول کیوں جہنمی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ”وہ بھی اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا خواہش مند تھا۔“ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دل کا پختہ ارادہ قابل گرفت ہے۔

سوال 3: اس آیت کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کیا طرز عمل تھا؟

جواب: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت (یعنی اگر تم نے اپنے دل کی باتوں کو ظاہر کیا اسے پوشیدہ رکھا سب پر مواخذہ ہوگا) نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے یہ چیز سخت حیرانی اور پریشانی کا باعث ہوئی۔ چنانچہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر گھٹنوں کے بل گر گئے اور عرض کیا آپ ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی ہے اور ہم اس حکم کی کہاں طاقت رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اسی طرح کہنا چاہتے ہو جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے تم سے پہلے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی، بلکہ یہ کہو ہم نے سنا اور اطاعت کی پروردگار ہم آپ سے اپنے گناہوں کی معافی کے طلب گار ہیں اور آپ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ چنانچہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ جملہ دہرایا اور اس سے ان کی زبانیں تر ہو گئیں تو حق تعالیٰ نے اس کے بعد ﴿اصْحٰنَ السُّوۡلِ﴾ آیت نازل فرمائی۔ جب اس پر سب نے گواہی دے دی تو اللہ تعالیٰ نے پہلے حکم کو منسوخ کر کے یہ آیت ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلٰدُسْعَهَا﴾ نازل فرمائی، یعنی اللہ تعالیٰ ہر ایک انسان کو اس کی طاقت کے بقدر مکلف بناتا ہے۔ امام مسلم وغیرہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ (باب العقول فی اسباب النزول از علامہ سیوطی)

سوال 4: اللہ تعالیٰ نے آخرت کے محاسبے کا خوف دلایا ہے، اس کا مقصد کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ محاسبے کا مقصد اصلاح ہے۔ آج کے کاموں کا حساب لیں تاکہ اس کی تیاری ہو۔ ﴿2﴾ انسان کی اصلاح اس تصور سے ہی ممکن ہے کہ جو میں چھپاؤں جو میں ظاہر کر دوں سب کا حساب اللہ تعالیٰ نے لینا ہے۔ ﴿3﴾ اگر انسان محاسبے کا تصور چھوڑ دے تو اس کے لیے گناہ کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔ ﴿4﴾ محاسبے کی روح اخلاص ہے۔ ﴿5﴾ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محاسبے کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کسی باغ کی طرف گزرتے اور چڑیوں کو چھماتے ہوئے دیکھتے تو سرد آہ کھینچ کر فرماتے: ”پرندو! تمہیں مبارک ہو جہاں چاہتے ہو چرتے چگتے ہو، جس درخت کے سائے میں چاہتے ہو بیٹھ رہتے ہو اور قیامت میں تم سے کوئی حساب کتاب نہ ہوگا، کاش ابو بکر بھی تمہاری ہی طرح ہوتا۔“ ﴿6﴾ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ حسرت سے آہ بھرتے اور کہتے کہ کاش میں پرندہ ہوتا اور آخرت کے حساب سے بچ جاتا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو محاسبے کا اتنا خوف تھا کہ ایک بار کہنے لگے: ”علی رضی اللہ عنہ! میں تو صرف اتنا ہی چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن مجھے نہ میری نیکیوں کا اجر ملے اور نہ گناہوں کے عوض میری پکڑ ہو، میرے لیے یہی بڑی کامیابی ہے۔“ ﴿7﴾ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اندیشہ آخرت کا یہ حال تھا کہ فرماتے: ”اگر مجھے دوزخ و جنت کے متعلق اختیار دے دیا جائے کہ ان میں سے اپنے لیے جس کو چاہوں پسند کر لو، یا راکھ ہو جاؤ تو میں راکھ ہو جانا پسند کروں گا تاکہ مجھ سے میرے اعمال کے متعلق کچھ جواب و سوال نہ ہو۔“ آخرت کے خوف سے اکثر کہا کرتے تھے: ”کاش ہم گھاس ہوتے۔“

سوال 5: ﴿فَیَنْفِرُ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاءُ﴾ ”پھر وہ جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا“ کی

وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿فَيَغْفِر لِمَن يَشَاءُ﴾ ”پھر وہ جس کو چاہے گا بخش دے گا“ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جو کچھ وہ چاہتا ہے اس میں رحمت اور عدل ہے۔ اس کے عدل میں سے ہے کہ وہ نیکیاں کرنے والوں کو ان کے اعمال کے مطابق جزا دے۔ وہ اپنے فضل سے ایک نیکی کا بدلہ دس گنا دیتا ہے۔ ﴿2﴾ ﴿وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ﴾ ”اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا“ اللہ تعالیٰ کے عدل میں سے ہے کہ وہ گناہ گار کو اس کے گناہ کے مطابق جزا دیتا ہے اور اس کے گناہ کا بدلہ نہیں بڑھاتا۔ ﴿3﴾ ﴿فَيَغْفِر لِمَن يَشَاءُ﴾ ”پھر وہ جس کو چاہے گا بخش دے گا“ جن کے پاس مغفرت کے اسباب موجود ہوں گے اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے گا۔ ﴿4﴾ ﴿وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ﴾ ”اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا“ انسان کو ان گناہوں پر اللہ تعالیٰ عذاب دیں گے جن کی مغفرت کے اسباب اسے حاصل نہیں ہوں گے۔ ﴿5﴾ سیدنا صفوان بن محرز رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا: ”آپ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے سرگوشی کے متعلق کیا سنا ہے؟“ انہوں نے کہا: میں نے آپ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ”قیامت کے دن ایک مومن اپنے رب کے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت کا پردہ ڈال دے گا۔ پھر اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کروایا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو (گناہوں کو) جانتا ہے؟ وہ عرض کرے گا: اے رب! میں جانتا ہوں (اقرار کرتا ہوں) اللہ تعالیٰ فرمائے گا: دنیا میں بھی میں نے تیرے ان گناہوں کی پردہ پوشی کی اور اب آج کے دن بھی میں ان تمام گناہوں کو معاف فرمادیتا ہوں۔ پھر اسے اس کی نیکیوں کا اعمال نامہ دیا جائے گا اور کفار و منافقین کو علی الاعلان لوگوں کے سامنے بلایا جائے گا اور پکارا جائے گا کہ یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا۔“ (صحیح مسلم: 7015)

سوال 6: ﴿وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے“ اللہ تعالیٰ نے قانون سازی کے اختتام پر اپنی ملکیت اور قادر مطلق ہونے کا کیسے احساس دلایا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین پر اپنی ملکیت سے اپنے قدر ہونے کا شعور دلایا ہے کہ جو مالک ہے اختیار اسی کا، فیصلے اسی کے ہیں۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے دلوں کے معاملات کے چھپانے اور ظاہر کرنے پر اپنی قدرت کا شعور دلایا ہے کہ ظاہر کرو یا چھپاؤ وہ قادر مطلق تم سے حساب لے لے گا۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور عذاب دینے کے اختیار سے اپنے قدر ہونے کا شعور دلایا ہے کہ فیصلے اس کے ہیں جس کو چاہے معاف کر دے جس کو چاہے عذاب دے دے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین پر اپنی ملکیت سے اپنے قدر ہونے کا شعور دلایا ہے کہ کوئی چیز اس کے بس سے باہر نہیں بلکہ تمام مخلوقات اس کے غلبہ، مشیت، تقدیر اور جزا و سزا کے قوانین کے ماتحت ہیں۔ (تفسیر سحری: 1/334)

﴿إِنَّ الرُّسُلَ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْهِمْ مِنَ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَيْكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ

رُسُلِهِمْ وَقَالُوا سَبِّحُوا بِحَمْدِ رَبِّكَ رَبَّنَا وَابْتَغِ الْيَقِينَكَ الْيَوْمَ (285)﴾

”رسول ایمان لایا ہے اس پر جو اس کے رب کی جناب سے اس کی طرف نازل کیا گیا ہے اور مومن بھی، سب ہی اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں، اس کے رسولوں میں سے ہم کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے۔ اور انہوں نے کہا: ”ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اے ہمارے رب اور تیری ہی جانب لوٹ کر جانا ہے۔“ (285)

سوال 1: سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتوں کی کیا فضیلت ہے؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کو (معراج کے لئے) سیر کرائی گئی تو آپ ﷺ کو سورۃ النہل تک لے جایا گیا جو کہ چھٹے آسمان میں واقع ہے۔ زمین سے اوپر چڑھنے والی چیز اور اوپر سے نیچے آنے والی چیز یہاں آ کر رک جاتی ہے۔ پھر اسے لے جایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِذْ يُخَشِى السَّمَاءَ مَا يَخْشَى﴾ جب کہ سدرہ (بیری) کو ڈھانپ رہا تھا وہ جو ڈھانپ رہا تھا۔ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا یعنی سونے کے پتنگے۔ راوی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کو تین چیزیں عطا کی گئیں: (الف) پانچ نمازیں۔ (ب) سورۃ البقرہ کی آخری آیتیں۔ (ج) اور آپ ﷺ کی امت میں ہر ایک ایسے آدمی کو بخش دیا گیا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے اور کبیرہ گناہوں سے بچا رہے۔ (صحیح مسلم: 431) ﴿2﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہمارے درمیان سیدنا جبرائیل علیہ السلام نے نبی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک اوپر سے ایک آواز سنی تو آپ ﷺ نے اپنا سر مبارک اٹھایا۔ سیدنا جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا: ”یہ دروازہ آسمان کا ہے جسے صرف آج کے دن کھولا گیا ہے، اس سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا۔“ پھر اس سے ایک فرشتہ اتر آیا، سیدنا جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا: ”یہ فرشتہ جوزمین کی طرف اتر رہا ہے، یہ آج سے پہلے کبھی نہیں اترتا۔“ اس فرشتے نے سلام کیا اور کہا: ”آپ ﷺ کو ان دونوں کی خوش خبری ہو جو آپ ﷺ کو دیئے گئے اور آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے: ایک سورۃ الفاتحہ اور دوسرے سورۃ البقرہ کی آخری آیات، آپ ﷺ ان میں سے جو حرف بھی پڑھیں گے، آپ ﷺ کو اس کے مطابق دیا جائے گا۔“ (صحیح مسلم

1877: ﴿3﴾ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے سورہ بقرہ کی دو آخری آیتیں رات میں پڑھ لیں وہ اسے ہر آفت سے بچانے کے

لئے کافی ہو جائیں گی۔ (بخاری: 5009) ﴿4﴾ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نہیں جانتا کہ اسلام کے جاننے والوں میں سے کوئی شخص آیت الکرسی اور سورہ بقرہ کی آخری آیتیں پڑھے بغیر سو جائے۔ یہ وہ خزانہ ہے جو تمہارے نبی ﷺ عرشِ تلو کے خزانہ سے دیئے گئے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر: 385/1) ﴿5﴾ ابن مردویہ میں ہے کہ ”ہمیں لوگوں پر تین فضیلتیں دی گئیں ہیں: میں سورہ بقرہ کی یہ آخری آیتیں عرشِ تلو کے خزانوں سے دیا گیا ہوں جو نہ میرے پہلے کسی کو دی گئیں نہ میرے بعد کسی کو دی جائیں گی۔“ (تفسیر ابن کثیر، جلد 1: 385)

سوال 2: ﴿اصْنِ الرَّسُولَ مِمَّا نَزَّلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ﴾ ”رسول ایمان لایا ہے اس پر جو اس کے رب کی جناب سے اس کی طرف نازل کیا گیا ہے اور مومن بھی“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿اِنَّ رَسُوْلًا لَّا يٰٓاْتِيْهِ رِسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّهٖۤ اِلَّا بِالْحَقِّۚ﴾ ”رسول ایمان لایا ہے“ رسول کا ایمان اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے۔ اگرچہ نفس ایمان میں رسول ﷺ اور سب مسلمان شریک ہیں لیکن درجات ایمان کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ایمان، علم، مشاہدہ اور سماع کی بناء پر تھا اور دوسروں کا ایمان غیب پر۔ ﴿2﴾ رسول اللہ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہوا، انہوں نے براہ راست وحی قبول کی۔ اس لیے وہ وحی پر یقین کے جس درجے میں تھے باقی مومن نہیں ہو سکتے۔ ﴿3﴾ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا السُّبُوْحَةَ﴾ ”اس پر جو جو اس کے رب کی جناب سے اس کی طرف نازل کیا گیا ہے“ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی وحی پر ایمان لائے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتے کے ذریعے اسے نازل کیا ہے۔ ﴿4﴾ ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ اور مومن ایمان لائے ہیں۔ رسول کے ایمان اور ایک عام انسان کے ایمان کی حقیقت اور کیفیت میں زمیں آسمان کا فرق ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صفت ایمان میں شریک کر کے اعزاز عطا فرمایا ہے۔

سوال 3: ایمان کسے کہتے ہیں؟

جواب: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی ﷺ لوگوں میں تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھنے لگا مَا الْاِيْمَانُ؟ ایمان سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: الْاِيْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَرُسُوْلِهٖ وَتُؤْمِنَ بِالْبُعْثِ اِيْمَانُ يٰٓهٗ كَمَا تَمَّ اللّٰهُ تَعَالٰى كَمَا وَجُوْدًا وَّرَاسِ كِي وَحَدَانِيَّتٍ پَرَايْمَانُ لَاؤُ، اور اس کے فرشتوں کے وجود پر، اور اس (اللہ تعالیٰ) کی ملاقات کے برحق ہونے پر، اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے پر ایمان لاؤ۔“ (صحیح بخاری: 50)

سوال 4: ﴿كُلُّ اٰمِنٍ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَرُسُوْلِهٖ﴾ ”سب ہی اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہیں اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے اس کی تمام صفات کمال و جمال پر ایمان لانا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں نے بتائی ہیں۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کی صفات کمال و جلال پر اجمالاً اور تفصیلاً ایمان لانا۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات کو تشبیہ، تمثیل، تعطیل اور تمام نقص والی صفات سے پاک ماننا۔ ﴿4﴾ ﴿وَمَلَائِكَتِهٖ﴾ ”اور اس کے فرشتوں پر“ فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نور سے پیدا کیا ہے اور انہیں اپنے احکامات کی مکمل اطاعت اور ان کو نافذ کرنے کی پوری قوت عطا کی ہے اور وہ کبھی اپنے کاموں سے نہیں تھکتے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور نبی ﷺ کی احادیث میں جن فرشتوں کے ناموں اور ان کی جن صفات اور جن افعال کا ذکر کیا ہے ان پر پختہ اعتقاد رکھا جائے۔ (جنت کا راستہ) ﴿5﴾ ﴿وَكُتُبِهٖ﴾ ”اور اس کی کتابوں پر“ اللہ تعالیٰ کی کتابوں سے مراد اس کے احکام اور فرمودات کے وہ مجموعے ہیں جو ہر زمانے کے نبی اور رسول پر نازل ہوئے اور اکٹھا ترتیب پا کر آسمانی کتابوں کے نام سے دنیا میں آتے رہے۔ (ابوبکر الجزائری، عقیدۃ المؤمن: 280) ﴿6﴾ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب ہے کہ اس کی تصدیق کرنا کہ تمام کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری گئی ہیں اور اس بات پر ایمان رکھنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کے ذریعے کلام فرمایا ہے۔ (جنت کا راستہ) اللہ تعالیٰ کی کتابیں انسان کی ہدایت

کے لیے اتاری گئی ہیں۔ ان کتابوں میں موجود تمام خبروں اور احکامات پر ایمان رکھنا بھی اسی میں شامل ہے۔ ﴿7﴾ ﴿وَمَا سَلِمَ﴾ اور اس کے رسولوں پر، رسولوں پر ایمان لانے سے مراد یہ پختہ یقین رکھنا ہے کہ: (الف) اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے کچھ بندوں کو چن لیا۔ کسی نہ کسی کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ (ب) سارے رسولوں کی دعوت کی اصل بنیاد تو حیدتھی۔ سب اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کی دعوت دیتے رہے اور غیر اللہ کی عبادت سے روکتے رہے۔ (ج) سارے رسول سچے، امانت دار، متقی اور ہدایت کا راستہ دکھانے والے تھے۔ (د) رسولوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغامات اپنی امتوں کو پہنچانے میں نہ کچھ چھپایا، نہ اضافہ کیا، نہ کمی کی۔ (و) سارے رسول صراط مستقیم پر چلنے والے تھے۔ (ہ) اللہ تعالیٰ نے رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور بعض کے درجات بلند کئے۔ (جنت کا راستہ)

سوال 5: فرشتوں پر ایمان لانے کے انسانی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ انسان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ رب پر ایمان لانے میں انسان اور فرشتے شریک ہیں۔ ﴿2﴾ فرشتوں پر ایمان کی وجہ سے انسان میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ کائنات میں پھیلے ہوئے بہت سے مومنین ہیں جو نظر نہیں آتے لیکن اس کے دوست ہیں۔ ﴿3﴾ انسان تسکین محسوس کرتا ہے کہ فرشتے اس کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ ﴿4﴾ انسان کو یقین آتا ہے کہ ہر نیکی کے کام میں فرشتے معاون اور مددگار ہیں۔ ﴿5﴾ فرشتوں پر ایمان ایک لطیف اور ہر دم ساتھ رہنے والے ساتھی کا شعور ہے۔ ﴿6﴾ کائنات کے بارے میں انسانی شعور کو وسعت ملتی ہے۔

سوال 6: ﴿لَا تُفَرِّقِي بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ أُمَّسَلِمٍ﴾ ”اس کے رسولوں میں سے ہم کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے“ اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ مقاتل بن حیان اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں کہتے ہیں کہ جو کچھ رسول لے کر آئے ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور نہ ہم انہیں جھٹلاتے ہیں۔ (تفسیر ابن ابی حاتم: 576/2) ﴿2﴾ مومن یہود و نصاریٰ کی طرح یہ نہیں کہتے کہ بعض پر ایمان رکھیں گے اور بعض کا کفر کریں گے۔ (تفسیر شعبی: 557/1)

سوال 7: ﴿وَقَالُوا سُبْحٰنَا وَاطْعٰنَا﴾ ”اور انہوں نے کہا: ”ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور انہوں نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی“ اطاعت سے مراد عملی حواگی ہے۔ ایمان والے اللہ تعالیٰ کی بات سنتے ہیں اور ہر حکم مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے اس کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی اطاعت کرتے ہیں۔ ﴿2﴾ ﴿سُبْحٰنَا﴾ کے بارے میں مقاتل بن حیان کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو حکم قرآن (مجید) میں آیا ہم اس کو سنتے ہیں۔ (تفسیر ابن ابی حاتم: 576/2) ﴿3﴾ انہوں نے کہا ﴿اطْعٰنَا﴾ جو کچھ ہمیں رسول سے پہنچا ہم نے اسے سنا، سمجھا اور اس پر تدبر کیا۔ جو کچھ ہمیں اوامر و نواہی میں سے پہنچا ہم نے اس

کی دل سے اطاعت کی۔ (تفسیر مراغی: 442/1)

سوال 8: ﴿عَفْرَانِكَ رَبِّكَ﴾ ”ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اے ہمارے رب“ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿عَفْرَانِكَ رَبِّكَ﴾ ”ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اے ہمارے رب“ سے مراد ہے ہمارے گناہ اس طرح ڈھانپ دے کہ دنیا میں ہماری رسوائی نہ ہو اور آخرت میں کمال کے مرتبے تک پہنچنے کے راستے کی رکاوٹ نہ ہو۔ (تفسیر مراغی: 442/1) ﴿2﴾ بندے سے اللہ تعالیٰ کے حقوق میں کوتاہی ہو جاتی ہے اس لیے ہمیشہ مغفرت کی ضرورت رہتی ہے۔

سوال 9: انسان کب اللہ تعالیٰ سے معافی کا طلب گار ہوتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ انسان اللہ تعالیٰ سے معافی کا طلب گار تب ہوتا ہے جب وہ یقین رکھتا ہے کہ میرے اندر کوتاہیاں ہیں، مجھ سے غلطیاں ہو جاتی ہیں، مجھ سے اپنے فرائض پورے طور پر ادا نہیں ہوتے اس لیے وہ اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہے کہ وہ اس کی غلطیوں کو معاف کر دے اور اس کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لیں۔ ﴿2﴾ انسان اللہ تعالیٰ سے معافی کا طلب گار تب ہوتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کی بات سنتا ہے اور اطاعت کرتا ہے۔ ﴿3﴾ جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مکمل طور پر سرتسلیم خم کر دیتا ہے۔ ﴿4﴾ جب اسے یہ یقین آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی قوت بچانے والی نہیں۔ ﴿5﴾ جب اسے یہ یقین آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔ ﴿6﴾ جب اسے یقین آجاتا ہے کہ اسے اپنے ہر معاملے کی اللہ تعالیٰ کو جواب دہی کرنی ہے۔ ﴿7﴾ جب اسے یقین آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اٹل ہوگا اور کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔ ﴿8﴾ جب اسے یہ یقین آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے صرف اس کی مغفرت بچا سکتی ہے پھر وہ معافی کا طلب گار ہوتا ہے۔

سوال 10: ﴿وَأَلَيْكَ الْكَلْبُ﴾ ”اور تیری ہی جانب لوٹ کر جانا ہے“ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ”اور تیری ہی جانب لوٹ کر جانا ہے“ سے مراد قیامت کے بعد جی اٹھنے پر یقین ہے۔ ﴿1﴾ اس یقین کے ساتھ بندہ نیکی کے راستے کو تلاش کرتا ہے اور اس پر چلتا ہے۔ ﴿2﴾ وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع فرمان ہو جاتا ہے۔ ﴿3﴾ اس کو دنیا میں مشقت طے یا راحت، اسے فائدہ ہو یا نقصان، وہ کچھ کھور ہا ہو یا پار ہا ہو اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ اصل جزا آخرت کے دن طے گی جہاں وہ امتحان میں کامیاب ہو جائے گا۔ ﴿4﴾ بندے کا عزم بچتہ ہو جاتا ہے۔ وہ حق کے راستے سے نہیں ہٹتا چاہے پوری دنیا مخالف ہو جائے۔

سوال 11: اس آیت میں اسلامی عقیدہ ”بعث بعد الموت“ کی وضاحت ملتی ہے یہ عقیدہ انسان کو کیا دیتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ عقیدہ ”بعث بعد الموت“ انسان کا بحیثیت انسان اعتراف کرواتا ہے۔ (الف) ایک طرف اسے حیوانات سے، جمادات سے مقام بلند دیتا ہے۔ (ب) دوسری طرف فرشتوں اور شیطانوں سے بھی الگ تشخص دیتا ہے۔ ﴿2﴾ عقیدہ ”بعث بعد الموت“ انسان کے مختلف رجحانات، میلانات اور اس کی روح کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ایسے فرائض عائد کرتا ہے جن کو انسان ادا کر سکے۔ ﴿3﴾ عقیدہ ”بعث بعد الموت“ انسان کے فرائض اور اس کی صلاحیتوں اور طاقت کے درمیان بہترین توازن قائم کرتا ہے۔ ﴿4﴾ عقیدہ ”بعث

بعد الموت، انسان کے جسمانی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ﴿5﴾ عقلی تقاضوں کا خیال رکھتا ہے۔ ﴿6﴾ انسان کی روحانی دنیا کو بھی آباد رکھتا ہے۔ ﴿7﴾ عقیدہ ”بعث بعد الموت“ انسان کو آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ جو راستہ چاہے اختیار کر لے۔

﴿لَا يَكْفُلُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا كَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ لُنُسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لِطَائِفَةٍ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاعْفُرْ لَنَا وَارْحَمْنَا إِنَّكَ أَنْتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ (286)

”اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی وسعت کے مطابق، اس کے لیے ہے جو اس نے نیکی کمائی اور اسی پر ہے جو اس نے برائی کمائی، اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہمارا مواخذہ نہ کرنا، اے ہمارے رب! اور ہم پر ویسا ہی بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا تھا، جو ہم سے پہلے تھے، اے ہمارے رب! اور تو ہم سے نہ اٹھو جس کی ہم میں طاقت ہی نہیں، اور ہم سے درگزر فرما اور تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا مولیٰ ہے، چنانچہ کافر لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔“ (286)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟

جواب: سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے آیت (وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ) کے متعلق بتلایا کہ اس آیت کو اس کے بعد کی آیت (لَا يَكْفُلُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا) نے منسوخ کر دیا ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب التفسیر: 4546)

سوال 2: ﴿لَا يَكْفُلُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ ”اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی وسعت کے مطابق“ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ محمد بن لعب القرظی نے ﴿لَا يَكْفُلُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ کے بارے میں کہا: اس سے مراد ہے کہ وہ اس عمل کے مکلف نہیں ہیں جس کی وہ طاقت نہیں رکھتے۔ (تفسیر ابن ابی حاتم: 578/2) ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ سو جتنی تم استطاعت رکھتے ہو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ (التغابن: 16) ﴿3﴾ ﴿وُسْعَهَا﴾ سے مراد اس کی طاقت ہے۔

سوال 3: ”اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی وسعت کے مطابق“ اس کے انسان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی وسعت کے مطابق“ کے اثر سے انسان یہ سوچتا ہے کہ اس کا رب رحیم ہے، اس نے جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں وہ عادلانہ ہیں، جو آزمائشیں ڈالی ہیں وہ بھی میری طاقت کے مطابق ہیں اور قیامت کے دن بھی ٹھیک انصاف ہوگا۔ ﴿2﴾ ”اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا“ اس پر یقین کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فرائض پر تنگی محسوس نہیں کرتا۔ ﴿3﴾ اس یقین کی وجہ سے مومن ذمہ داریوں کو بوجھ نہیں سمجھتا۔ ﴿4﴾ اس یقین کی وجہ سے ایمان والے کا دل اطمینان سے بھر جاتا ہے۔ ﴿5﴾ اس کی وجہ سے مومن یقین رکھتا ہے کہ اگر میرے اندر یہ فرائض ادا کرنے کی طاقت نہ ہوتی تو وہ یہ فرائض عائد ہی نہ

کرتا۔ ﴿6﴾ جب بھی یہ یقین رکھنے والا انسان تھکتا ہے یا کمزوری محسوس کرتا ہے یا فرائض بھاری ہونے لگتے ہیں تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی ذاتی کمزوری ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے زیادہ بوجھ نہیں ہے۔ ﴿7﴾ ایمان والا اس یقین کی وجہ سے اپنے عزم، اپنے ارادے کو نئے سرے سے تازہ کرتا ہے۔ ﴿8﴾ ایمان والا اس یقین کی وجہ سے اپنی کمزوریوں کو دور کرتا ہے اور اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے پختہ ارادہ کر لیتا ہے۔ ﴿9﴾ یہ یقین مومن کی ہمت بندھاتا ہے اور اس کے ارادے میں قوت پیدا کرتا ہے۔

سوال 4: ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا كَسَبَتْ﴾ ”اس کے لیے ہے جو اس نے نیکی کمائی اور اسی پر ہے جو اس نے برائی کمائی“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اس کے لیے ہے جو اس نے نیکی کمائی اور اسی پر ہے جو اس نے برائی کمائی“ ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ میں کسب سے مراد خیر ہے۔ (جامع البیان: 3/163) ﴿2﴾ ﴿وَعَلَيْهَا مَا كَسَبَتْ﴾ میں ”اکتساب“ سے مراد شر ہے۔ یعنی جو اس نے برائی کمائی اسی پر ہے۔ جیسا کہ رب العزت کا ارشاد ہے۔ ﴿وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾ اور کوئی جان نہیں کماتی (گناہ) مگر اسی پر ہے (وبال) اور کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گی، پھر تمہارے رب کی طرف ہی تمہارا لوٹنا ہے، چنانچہ وہ تمہیں اس کے بارے میں بتائے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔ (الانعام: 164) ﴿3﴾ ”اس کے لیے ہے جو اس نے نیکی کمائی اور اسی پر ہے جو اس نے برائی کمائی“ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے کئے کا ذمہ دار ہے۔ ہر شخص کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے کمایا، سزا صرف اس جرم کی ملے گی جو کسی نے خود کیا ہوگا۔ ﴿4﴾ کسی شخص کو وہاں کسی مدد اور سفارش کی امید نہ ہوگی۔ ﴿5﴾ ہر شخص اپنا نامہ اعمال اپنے رب کے سامنے خود لے کر جائے گا۔ ﴿6﴾ ہر شخص بحیثیت ایک فرد کے اپنے رب کے سامنے ہوگا۔

سوال 5: ”ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا“ اس یقین کے مومن کی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہونے پر یقین جب مومن کے دل کے اندر راسخ ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔ کسی دوسرے انسان کی وجہ سے ان حقوق کی ادائیگی میں کمی نہیں کرتا نہ ہی ان کو چھوڑتا ہے۔ ﴿2﴾ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہونے پر یقین کی وجہ سے ایک مومن یہ سوچتا ہے کہ اگر کوئی گمراہ کر دے، دھوکہ دے دے، مجبور کر دے اور میں اللہ تعالیٰ کے حق میں کمی کر دوں تو قیامت کے دن ان سارے انسانوں میں سے کوئی میرے کام نہیں آئے گا نہ مدافعت کر سکیں گے، نہ سفارش کر سکیں گے، نہ میرا بوجھ اتار سکیں گے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کے ہاں جو اب دہی کے یقین کی وجہ سے مومن معاشرے میں اپنی اجتماعی ذمہ داریاں پوری کرنے کے بارے میں پوری طرح سے فکرمند ہوتا ہے۔ ﴿4﴾ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہونے پر یقین کی وجہ سے مومن اپنے مال اور اپنی دولت سے اجتماعی ذمہ داریاں پوری کرتا ہے۔ ﴿5﴾ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہونے پر یقین کی وجہ سے مومن دوسروں کو نواصوا بالحق کرنے کے لیے اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتا ہے۔ ﴿6﴾ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہونے پر یقین کی وجہ سے مومن اجتماعی معاملات کے حوالے سے بھی

اپنی کارکردگیوں اور کوتاہیوں کے بارے میں یہ یقین رکھتا ہے کہ اعمال نامہ میں درج ہوں گی، ان کا حساب کتاب ہوگا، ان پر جزا سزا ملے گی۔ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے: اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہمارا مواخذہ نہ کرنا۔

سوال 6: ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ كُنَّا مُسِيئِينَ وَلَا نُنسِئُكَ﴾ ”اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہمارا مواخذہ نہ کرنا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخلوق کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ یہ کہیں ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ كُنَّا مُسِيئِينَ وَلَا نُنسِئُكَ﴾ اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کریں تو ہمیں نہ پکڑنا۔ (زاد المسیر: 297/1) ﴿2﴾ جب سیدنا جبریل علیہ السلام نبی ﷺ سے یہ کہہ رہے تھے: ”اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کریں تو ہمیں نہ پکڑنا“ تو نبی ﷺ جواب میں کہہ رہے تھے: آمین رب العالمین۔ (الدر المنثور: 668/1) ﴿3﴾ ﴿إِنْ كُنَّا مُسِيئِينَ﴾ سے یہ مراد ہے کہ اگر وہ چیز ہمیں بھول جائے جو ہم پر فرض کی گئی ہو۔ (جامع البیان: 164/3) ﴿4﴾ ﴿أَخْطَاْنَا﴾ سے یہ مراد ہے کہ انسان ایک جائز کام کا ارادہ کرے لیکن اس سے کام اس انداز سے ہو جائے جو جائز نہ ہو۔ ﴿5﴾ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میری امت سے خطا اور نسیان پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا جب تک انہوں نے ایسے کاموں کو برا سمجھا۔“ (طبرانی) ﴿6﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے میری امت سے ان چیزوں کے بارے میں درگزر فرمادیا ہے جو ان کے نفسوں میں آجائیں جب تک کہ ان پر عمل نہ کریں یا زبان سے نہ کہیں۔ (مسلم: 75/1)

سوال 7: نسیان (بھول) اور خطا (غلطی) میں کیا فرق ہے؟

جواب: ﴿1﴾ بھول اور غلطی میں فرق یہ ہے کہ نسیان (بھول) کا مطلب ہوتا ہے مامور کام کا دل سے فراموش ہو جانا اور بھول جانے کی وجہ سے اس عمل کا چھوٹ جانا۔ خطا (غلطی) یہ ہوتی ہے کہ انسان ایک جائز کام کا ارادہ کرے لیکن اس سے کام اس انداز سے واقع ہو جائے جو جائز نہیں۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر رحمت اور احسان فرماتے ہوئے اس سے واقع ہونے والے یہ دونوں طرح کے کام معاف فرمادیئے۔ ﴿3﴾ اس اصول کی روشنی میں کہا جاتا ہے کہ جو شخص چھینے ہوئے یا ناپاک کپڑے پہن کر نماز پڑھے، بدن پر سے نجاست دور کرنا بھول گیا ہو یا نماز کے دوران بھول کر کسی سے بات کر لے یا روزے کے دوران بھول کر کچھ کھالے یا احرام کے دوران بھول کر کوئی ممنوع کام کر لے بشرطیکہ اس میں کسی جان دار کی ہلاکت شامل نہ ہو تو اس کی یہ غلطیاں معاف ہیں۔ ﴿4﴾ اسی طرح اگر ایک کام نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہو پھر بھول کر وہ کام کر لے۔ اس طرح اگر غلطی سے کسی کی جان یا مال کا نقصان کر بیٹھے تو اس کو گناہ نہیں ہوگا۔ نقصان پورا کرنے کے لیے ادائیگی کرنے کا تعلق نقصان کرنے سے ہے (ارادہ یا بھول وغیرہ سے نہیں) اس طرح جن موقعوں پر (بسم اللہ) پڑھنا واجب ہے اگر وہاں (بسم اللہ) پڑھنا بھول جائے تو کام درست سمجھا جائے گا۔ (تفسیر سعدی: 336/1)

سوال 8: غلطی پر مومن کے لیے صحیح طریقہ کار کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ انسان سے بھول چوک، غلطیاں اور خطائیں ہو سکتی ہیں۔ جان بوجھ کر انسان اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی نہ کرے تو معافی کی گنجائش ہے۔ ﴿2﴾ غلطی پر مومن کے لیے صحیح طریقہ کاریہ ہے کہ اپنے رب سے فوراً معافی مانگ لے۔ اللہ تعالیٰ سے توبہ کر کے اس کی طرف رجوع کرنا معافی کی شرائط میں سے ہے۔

سوال 9: ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ ”اے ہمارے رب! اور ہم پر ویسا ہی بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا تھا، جو ہم سے پہلے تھے“ یہ دعا انسان کی زبان پر کب آتی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”اے ہمارے رب! اور ہم پر ویسا ہی بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا تھا، جو ہم سے پہلے تھے“ یہ دعا انسان کی زبان پر تب آتی ہے جب وہ ذمہ دار بن جاتا ہے۔ جب وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ امت مسلمہ پر تمام رسولوں کی رسالت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ جب وہ کچھلی قوموں کے حالات جان لیتا ہے کہ انہوں نے رسولوں کی نافرمانی کی اس کی پاداش میں ان پر کیا کیا بوجھ ڈال دیئے گئے تب وہ یہ دعا کرتا ہے کہ ”اے ہمارے رب! اور ہم پر ویسا ہی بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا تھا، جو ہم سے پہلے تھے۔“ ﴿2﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ إِصْرًا عہد و عہدہ کے معنی میں ہے۔ (بخاری: کتاب النشیر) ﴿3﴾ ابن زید نے کہا ﴿إِصْرًا﴾ ایسا گناہ ہے جس کا نہ کفارہ ہے نہ توبہ۔ (الحر والوجیز: 394/1) ﴿4﴾ ﴿كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ ”جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا تھا، جو ہم سے پہلے تھے“ مقاتل بن حیان نے کہا جیسے یہود و نصاریٰ پر بوجھ ڈالا تو وہ ہلاک ہو گئے۔ (تفسیر ابن ابی حاتم: 580/2) ﴿5﴾ جیسے بنی اسرائیل پر واجب تھا کہ جب ان کے کپڑے پر نجاست لگ جائے تو وہ اسے قطع کر دیں گے۔ (تفسیر مراغی: 445/1) اس سے مشکل احکام مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ درخواست قبول فرمائی اور اس امت پر طہارت اور عبادت کے مسائل میں ایسی نرمی فرمادی جو کسی اور امت پر نہیں فرمائی تھی۔ (تفسیر سعدی: 336/1)

سوال 10: پہلی امتوں پر ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے کیا کیا بوجھ ڈالے گئے تھے؟

جواب: ﴿1﴾ بنی اسرائیل پر بعض قسم کی پاکیزہ غذائیں حرام کر دی گئیں۔ ﴿2﴾ جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر سب ناخن والے جانور حرام کر دیے گئے۔ ﴿3﴾ گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی گئی۔ ﴿4﴾ انہیں بچھڑا پوجنے کی سزا کے طور پر ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم ملا۔ ﴿5﴾ ان پر سبت کے دن شکار کو حرام کیا گیا۔ اسی لیے اہل ایمان کو دعا سکھائی گئی کہ ”اے ہمارے رب! ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالنا جس طرح کا بوجھ تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔“

سوال 11: اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر سے انسان کی غلامی کو کیسے ختم کرنے کی کوشش کی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر سے انسان کی غلامی کو انبیاء کے ذریعے سے ختم کرنے کی کوشش کی ہے اور نبی ﷺ کی بعثت کا مقصد یہی تھا کہ وہ اہل ایمان اور پوری انسانیت سے وہ بوجھ اتار دیں جو انسانیت پر ڈالے گئے تھے۔ ﴿2﴾ رسول اللہ ﷺ کا احسان یہ ہے کہ انہوں نے ساری غلامیوں سے چھڑا کر ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کی

بندگی کے ذریعے پوری انسانیت کے لیے آزادی کا راستہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ﴿4﴾ انسان کو مذہبی پروہتوں، کاہنوں اور پیشواؤں کی غلامی سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہے۔ ﴿5﴾ انسان کو اوہام و خرافات سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہے۔ ﴿6﴾ انسان کو رسم و رواج کے بندھنوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہے۔ ﴿7﴾ انسان کو خواہشات اور مرغوبات کی غلامی سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہے۔ ﴿8﴾ ایسی غلامیاں جنہوں نے انسان کی کمر توڑ کر رکھ دی، جس کی وجہ سے انسان کا سر اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں دوسرے جباروں کے سامنے جھکتا تھا ان ساری غلامیوں سے آزاد کروانے کی کوشش کی ہے۔

سوال 12: ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ ”اے ہمارے رب! اور تو ہم سے نہ اٹھوا جس کی ہم میں طاقت ہی نہیں“ سے کیا

مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَلَا تَحْمِلْنَا﴾ سے مراد سزائیں، آزمائشیں اور مشقت والے احکامات ہیں۔ ابن عباس اور قتادہ نے کہا: طاقت سے مراد وسعت ہے۔ (زاد المسیر: 296/1) ﴿2﴾ اے ہمارے رب! ہمیں آسان احکامات دینا اور ہمیں ایسے احکامات نہ دینا جن کو بجالانا ہمارے بس میں نہ ہو۔ (تفسیر مرغی: 445/1) ﴿3﴾ ”اے ہمارے رب! اور تو ہم سے نہ اٹھوا جس کی ہم میں طاقت ہی نہیں“ اس دعا سے ایمان والوں کے شعور کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو گئے ہیں۔ مومن کو یہ خوف لاحق نظر آتا ہے کہ کہیں اپنی غلطیوں کی وجہ سے دوبارہ اس غلامی میں نہ چلے جائیں اور یہ پتہ چلتا ہے کہ اہل ایمان کے اندر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کا ارادہ نکل گیا ہے۔ ﴿4﴾ اس دعا سے مکمل سپردگی کا اظہار ہوتا ہے۔ ﴿5﴾ اس دعا سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مومن اپنے آپ کو کمزور سمجھ کر مالک کو مہربان سمجھتا ہے۔ ﴿6﴾ اس دعا سے مومن کے پختہ ارادے کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اطاعت کرے گا لیکن احکامات ماننے میں غلطی نہ ہو یہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔

سوال 13: ﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاعْفِرْ لَنَا وَإِنَّا حَسِبْنَا﴾ ”اور ہم سے درگزر فرما اور تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما“ کی وضاحت

کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَاعْفُ عَنَّا﴾ سے مراد ہے کہ ہمارے گناہ مٹا دے۔ (تفسیر بیضاوی: 588/1) ﴿2﴾ راغب نے کہا ”العفو“ سے مراد ہے عقوبت کو ترک کر کے گناہ کا ازالہ کرنا۔ (بحر المحیط: 766/2) ﴿3﴾ ﴿وَاعْفِرْ لَنَا﴾ سے مراد ہے ہمارے عیوب ڈھانپ دے اور مواخذہ کر کے ہمیں رسوا نہ کرنا۔ (تفسیر بیضاوی: 588/1) ﴿4﴾ ﴿وَإِنَّا حَسِبْنَا﴾ سے مراد ہے ہمارے ساتھ نرمی کا معاملہ فرمائیں اور ہم پر فضل فرمائیں۔ (تفسیر بیضاوی: 588/1) ﴿5﴾ بزرگوں کا قول ہے کہ گناہ گار کو تین باتوں کی ضرورت ہے ایک تو اللہ تعالیٰ کی معافی تاکہ عذاب سے نجات پائے، دوسرے پردہ پوشی تاکہ رسوائی سے بچے، تیسرے عصمت کی تاکہ دوسری بار گناہ میں مبتلا نہ ہو، اس پر بھی جناب باری نے قبولیت کا اعلان کیا۔ (تفسیر ابن کثیر: 386/1)

سوال 14: ﴿أَنْتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ ”تو ہی ہمارا مولیٰ ہے چنانچہ کافر لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما“

سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿أَنْتَ مَوْلَانَا﴾ سے مراد ہے آپ ہمارے امور میں ہمارے مددگار ہیں، ہماری حفاظت کرنے والے، ہمارے ولی ہیں۔ (تفسیر خازن: 221/1) ﴿2﴾ سیدنا براء رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ احد کے موقع پر ابوسفیان نے کہا: ”ہبل بلند رہے۔“ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اس کا جواب دو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ کیا جواب دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کہو، اللہ تعالیٰ سب سے بلند اور بزرگ و برتر ہے۔ ابوسفیان نے کہا: ہمارے پاس عزمی (بت) ہے اور تمہارے پاس کوئی عزمی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کا جواب دو“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ”کیا جواب دیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کہو، اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و مددگار ہے اور تمہارا کوئی حامی نہیں۔ (صحیح بخاری: 4043) ﴿3﴾ ایمان والے مولیٰ کا مضبوط سہارا تھا مگر جاہلیت کی ہر علامت، ہر بت، ہر محبت اور ہر رغبت کو توڑ کر ایک اللہ تعالیٰ کے سائے میں جاتے ہیں۔ ﴿4﴾ ﴿أَنْتَ مَوْلَانَا﴾ تو ہی ہمارا مولا ہے۔ ہماری زندگی، ہماری نمازیں، ہماری قربانیاں، ہماری موت سب آپ کے لیے ہے۔ یہ مومن کا اللہ تعالیٰ سے سچا تعلق ہے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ سے ایک مومن کی دعا ہے کہ اے اللہ تیرے دین کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ اس کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں۔ اہل کفر کے ساتھ مقابلہ ہے۔ آپ ہی کے لیے جینا ہے آپ ہی کے لیے مرنا ہے آپ ہماری مدد فرمائیں۔ ﴿5﴾ یعنی تو ہمارا رب، ہمارا بادشاہ اور ہمارا معبود ہے۔ جب سے تو نے ہمیں پیدا فرمایا تیری مدد اور توفیق ہمیں حاصل رہی ہے تیری نعمتیں ہر وقت مسلسل ہمیں مل رہی ہیں پھر تو نے ہم پر ایک عظیم احسان کیا کہ اسلام کی نعمت عطا فرمادی۔ باقی سب نعمتیں اس کے تابع ہیں۔ اس لیے اے ہمارے مالک اور ہمارے مولیٰ ہم تجھ سے اس نعمت کی تکمیل کا سوال کرتے ہیں کہ ان کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما جنہوں نے تیرے ساتھ کفر کیا، تیرے نبیوں کا انکار کیا، تیرا دین ماننے والوں سے مقابلہ کیا، تیرے احکامات کو پس پشت ڈالا۔ لہذا دلیل و برہان اور شمشیر و سناں کے ساتھ ہمارے مدد فرما۔ ہمیں زمین میں شوکت عطا فرما، ان کو ذلیل کر دے۔ ہمیں ایسا ایمان اور ایسے اعمال نصیب فرما، جن کی برکت سے فتح حاصل ہوتی ہے۔ (تفسیر سعوی: 336,337/1)

﴿1﴾ اساتھا ۲۰ ﴿2﴾ سورۃ العن ۸۹ ﴿3﴾ رکوعاھا ۲۰

سوال 1: اس سورۃ کا نام آل عمران کیوں ہے؟

جواب: اس سورۃ میں ایک جگہ پر آل عمران کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی کو سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

سوال 2: سورۃ کی آیات اور رکوعات کی تعداد لکھیں نیز یہ بھی بتائیں کہ سورۃ کئی ہے یا مدنی؟

جواب: اس سورۃ کی 200 آیات ہیں اور یہ 20 رکوعات پر مشتمل مدنی سورت ہے۔

سوال 3: اس سورت کی کیا فضیلت ہے؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا نواس بن سمران کلابی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”قیامت کے دن قرآن مجید اور ان لوگوں کو جو اس پر عمل کرنے والے تھے، لایا جائے گا۔ ان کے آگے سورۃ البقرہ اور آل عمران ہوں گی۔“ رسول اللہ ﷺ نے ان سورتوں کے لیے تین مثالیں ارشاد فرمائی ہیں جنہیں میں اب تک نہیں بھولا، وہ اس طرح سے ہیں جس طرح کے دو بادل ہوں یا دوسیاہ سائبان ہوں اور ان دونوں کے درمیان روشنی ہو یا صاف بندھی ہو، پرندوں کی دو قطاریں ہوں، وہ اپنے پڑھنے والوں کے بارے میں جھگڑا کریں گی۔ (صحیح مسلم: 1876) ﴿2﴾ سیدنا ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قرآن مجید پڑھا کرو کیونکہ یہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لیے سفارشی بن کر آئے گا اور درویش سورتوں کو پڑھا کرو: سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران کیونکہ یہ قیامت کے دن اس طرح آئیں گی جیسے کہ دو بادل ہوں یا دو سائبان ہوں یا دو اڑتے ہوئے پرندوں کی قطاریں ہوں اور اپنے پڑھنے والوں کے بارے میں جھگڑا کریں گے۔ سورۃ البقرہ پڑھا کرو کیونکہ اس کا پڑھنا باعث برکت ہے اور اس کا چھوڑنا باعث حسرت ہے اور جادو گر اس کو حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔“ (صحیح مسلم: 1874)

رکوع نمبر 9



﴿الْم (1)﴾

”ا۔ل۔م“ (1)

سوال: ﴿الْم﴾ ”ا۔ل۔م“ کی وضاحت کریں؟

جواب: یہ حروف مقطعات ہیں یعنی کٹے ہوئے حروف۔ ان کی مراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے۔ ان پر ایمان لانا فرض ہے۔ ان کے معانی کی کھوج میں نہیں پڑنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان حروف کی کوئی تفسیر بیان نہیں کی۔

﴿اللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ (2)﴾

”اللہ تعالیٰ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہمیشہ زندہ ہے، ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے۔“ (2)

سوال 1: ﴿اللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ ”اللہ تعالیٰ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اس جملے میں نفی اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق ہو اور اثبات اس بات کا ہے کہ ہر قسم کی الوہیت اور عبودیت کے حق دار صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ ﴿2﴾ اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی کسی قسم کی عبادت نہ کی جائے۔ اس کے سوا نہ کسی کے لیے قیام ہے، نہ رکوع، نہ سجدہ، نہ قربانی، نہ نذر و نیاز۔ ہر حالت میں صرف اسی سے دعا کی جائے، اس کے سوا کسی سے دعا نہ کی جائے، صرف اسی کے گھر بیت اللہ کا طواف کیا جائے، صرف اسی کی قسم کھائی جائے، صرف اسی کی غیر مشروط حاکمیت تسلیم کی جائے۔ اس کی عبادت میں کوئی اس کا ساجھی، شریک اور مد مقابل نہیں ہے۔ ﴿3﴾ اس سورت کی شروع کی اسی (80) سے زیادہ آیات عیسائیوں سے مباحثہ اور ان کے مذہب کی تردید اور انہیں سچے دین یعنی اسلام کو قبول کرنے کی دعوت پر مشتمل ہیں۔ جس طرح سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات یہود سے مناظرہ پر مشتمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سورت اپنی الوہیت کے اعلان سے شروع کی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ وہی ایسا معبود ہے جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ عبادت صرف اسی کی اور اسی کے لیے ہونی چاہیے۔ لہذا اس کے سوا جس معبود کی بھی پوجا کی جاتی ہے وہ باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سچا معبود ہے جو الوہیت کی تمام صفات سے موصوف ہے جن سب کا تعلق حیات اور قیومیت کی صفات سے ہے۔ (تفسیر سعدی: 1/337,338)

سوال 2: ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ کی کیا فضیلت ہے؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: افضل ذکر لا اله الا الله ہے۔ (سنن نسائی: 10599) ﴿2﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جب کبھی بھی بندہ کبار سے اجتناب کرتے ہوئے اخلاص سے لا اله الا الله کہتا ہے تو اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ (کلمہ توحید) عرش تک پہنچ جاتا ہے۔“ (ترمذی: 3824) ﴿3﴾ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ”جس شخص نے گواہی دی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشبہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دی۔“ (مسلم: 47)

سوال 3: اللہ تعالیٰ کی صفت ﴿الْحَيُّ﴾ ”ہمیشہ زندہ ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی صفت ﴿الْحَيُّ﴾ ”ہمیشہ زندہ ہے“ سے مراد ہے: ﴿1﴾ وہ ذات کہ جس کی زندگی ذاتی اور دائمی ہے یعنی انہیں کسی اور نے زندگی نہیں دی۔ دائمی زندگی سے مراد ہے کہ ان کی زندگی میں تسلسل اور دوام ہے۔ نہ پہلے اور نہ کبھی بعد میں، کبھی زوال نہیں ہے۔ ﴿2﴾ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کہتے ہیں اسم مبارک ﴿الْحَيُّ﴾ تمام صفات کمال کو لازم کر دیتا ہے اور یہی اسم اعظم ہے۔ (مجموع الفتاویٰ: 18/311) ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کو عظیم ترین اور کامل ترین حیات کی صفات حاصل ہیں، جو ان تمام صفات کو مستلزم ہیں جن کے بغیر صفات حیات کی تکمیل نہیں ہوتی مثلاً سمع و بصر، قدرت، قوت، عظمت، بقاء، دوام اور غلبہ۔ (تفسیر سعدی: 1/338)

سوال 4: اللہ تعالیٰ کی صفت ﴿الْقَيُّومُ﴾ ”ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی صفت ﴿الْقَيُّومُ﴾ ”ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے“ سے مراد ہے: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ ساری مخلوقات کی تخلیق، رزق، دیکھ بھال اور حفاظت کرنے والے ہیں۔ ہر چیز کا وجود، بقا اور تدبیر اللہ تعالیٰ ہی کے دست قدرت میں ہے۔ ﴿2﴾ القیوم کا مطلب ہے کہ وہ خود بخود قائم ہے لہذا تمام مخلوقات سے بے پرواہ ہے اور وہ سب کو قائم رکھنے والا ہے۔ اس لیے تمام مخلوقات وجود میں آنے، تیار ہونے اور ترقی کرنے میں اس کی محتاج ہیں۔ وہی تمام مخلوقات کا مدبر اور ان میں تصرف کرنے والا ہے۔ جسموں، روحوں اور دلوں کے تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کی قیومیت اور رحمت کی بنا پر اس نے اپنے رسول محمد ﷺ پر وہ کتاب نازل کی جو سب سے عظیم کتاب ہے۔ (تفسیر سعدی: 338/1) ﴿3﴾ شیخ عبدالرحمن سعدی رضی اللہ عنہ نے لکھا: ”بلاشبہ سب صفات افعال ﴿الْقَيُّومُ﴾ میں داخل ہیں کیونکہ القیوم وہ ہے جو خود بخود قائم ہے اور اپنی تمام مخلوقات سے بے نیاز ہے انہوں نے ساری موجودات کو قائم کیا، انہیں وجود میں لائے انہیں باقی رکھا اور انہیں اپنے وجود کی بقا کے لیے جو کچھ درکار ہے وہ مہیا فرمایا۔“ (تفسیر الکریم الرحمن: 202/1) ﴿4﴾ کائنات کی ہر چیز کا قیام صرف اللہ رب العزت کے ساتھ ہے۔ وہ کمزور کو برقرار رکھتا ہے تو اسے کوئی گرانہیں سکتا اور طاقت ور کو ہٹا اور مٹا دے تو اسے کوئی سہارا نہیں دے سکتا۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ کی صفت القیوم میں کمزور اور ضعیف کے لیے حقیقی اطمینان ہے کہ جب معاملہ رب قیوم کے ساتھ ہے تو ساری کائنات مل کر بھی گرا نہیں سکتی۔ اس میں طاقت ور کے لیے تنبیہ ہے کہ سارا زور اور قوت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے، پھر وہ چاہے تو نشان بھی مٹ جائے۔ ﴿6﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ کہا کرتے تھے: اَعُوذُ بِعِزَّتِكَ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَالْجَنُّ وَالْإِنْسُ يَمُوتُونَ۔ تیری عزت کی پناہ مانگتا ہوں کہ کوئی معبود تیرے سوا نہیں، تیری ایسی ذات ہے جسے موت نہیں اور جن و انس فنا ہو جائیں گے۔ (صحیح بخاری: 7383)

﴿كُذِّبَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَدَّكَ يَدِيهِ وَأَنْزَلَ التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ﴾ (3)

”اس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور اس نے تورات اور انجیل بھی نازل کی۔“ (3)

سوال 1: ﴿كُذِّبَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ﴾ ”اس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے“ کتاب کو حق کے ساتھ نازل کرنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ کتاب کو حق کے ساتھ نازل کرنے سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ اس کو اتارا۔ اس میں کوئی شک نہیں اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے، اس پر فرشتے گواہ ہیں۔ ﴿2﴾ قرآن مجید عظیم کتاب ہے، اس کی خبریں اور

احکامات حق پر مبنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو حق کے ساتھ اس لیے نازل کیا تا کہ بندے اس کتاب کا نفع مند علم حاصل کریں، اس پر عمل کریں اور اپنے رب کی عبادت کریں۔

سوال 2: ﴿مُصِّبًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ ”جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے“ یہ بتا کر اللہ تعالیٰ نے کس حقیقت سے روشناس کروایا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے“ اللہ تعالیٰ نے یہاں اس حقیقت سے روشناس کروایا ہے کہ اگر قرآن مجید کسی انسان کی کوشش کا نتیجہ ہوتا یا کسی اور کی طرف سے نازل ہوتا تو ان آسمانی کتابوں میں ایک جیسے مضامین نہ ہوتے بلکہ یہ کتابیں ایک دوسرے سے ٹکراتیں۔ ﴿2﴾ قرآن مجید چھٹی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔ جس بارے میں یہ کتاب فیصلہ کر دے وہی حق ہے اور مقبول ہے اور جس بارے میں قرآن مجید تردید کر دے وہ ناقابل قبول ہے۔ ﴿3﴾ قرآن مجید ان تمام مسائل کے مطابق ہے جن پر تمام رسولوں کا اتفاق ہے۔ اس سے اس کا سچا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اہل کتاب جب تک قرآن (مجید) پر ایمان نہ رکھیں تب تک اپنی کتابوں کو سچا نہیں مان سکتے کیونکہ قرآن (مجید) کا انکار ان کتابوں پر ایمان کو کالعدم کر دیتا ہے۔ (تفسیر سعدی: 1/338)

سوال 3: ﴿وَ أَنْزَلَ اللَّهُ التَّورَةَ وَالْإِنْجِيلَ﴾ ”اور اس نے تورات اور انجیل بھی نازل کی“ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ”اور اس نے تورات اور انجیل بھی نازل کی“ سے مراد یہ ہے کہ ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات اور عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل کو نازل کیا۔ قرآن مجید تورات اور انجیل میں بتائی گئی سچائیوں اور پیشن گوئیوں کا اعتراف کرتا ہے۔ ﴿2﴾ یعنی پہلی کتابیں قرآن مجید کی سچائی کو تسلیم کرتی ہیں کیونکہ ان میں قرآن مجید کی بشارت اور قرآن مجید میں ان کی صداقت ہے۔

﴿ مِنْ قَبْلِ هُدَىٰ لِلنَّاسِ وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۗ إِنَّ الزَّيْنَةَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ (4)﴾

”اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے۔ اور اسی نے حق اور باطل میں فرق کرنے والا (قرآن) اتارا ہے، یقیناً جن لوگوں نے

اللہ تعالیٰ کی آیات کا کفر کیا، ان کے لیے زبردست عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ سب پر غالب، بدلہ لینے والا ہے۔“ (4)

سوال 1: ﴿ مِنْ قَبْلِ هُدَىٰ لِلنَّاسِ وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ ”اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے اور اسی نے حق اور باطل میں فرق کرنے والا (قرآن) اتارا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿ مِنْ قَبْلِ﴾ اس سے پہلے یعنی قرآن مجید کو نازل کرنے سے پہلے۔ ﴿2﴾ ﴿ هُدَىٰ لِلنَّاسِ﴾ لوگوں کی ہدایت کے لیے یعنی قرآن مجید کو لوگوں کو گمراہی سے بچانے کے لیے راہ نما بنا کر نازل کیا جیسے تورات اور انجیل کو نازل کیا تھا۔ ﴿3﴾ اب جو کوئی قرآن مجید کی ہدایت کو قبول کر لے وہ ہدایت پا گیا اور جو انکار کر دے وہ گمراہ ہو گیا۔ ﴿4﴾ تورات اور انجیل اپنے دور کے لوگوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ

تھیں۔ قرآن مجید نازل ہونے کے بعد اب صرف یہی کتاب ہدایت کا ذریعہ ہے۔

سوال 2: ﴿وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ ”اور اسی نے حق اور باطل میں فرق کرنے والا (قرآن) اتارا ہے“ قرآن حکیم کے فرقان ہونے کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ قرآن مجید میں ایسے دلائل ہیں جن سے حق اور باطل کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ﴿2﴾ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ضرورت کے مطابق تفصیل بیان کی ہے جس سے احکامات واضح ہو جاتے ہیں۔ ﴿3﴾ قرآن حکیم ساری آسمانی کتابوں کی اصل ہدایات اور بدلی گئی باتوں کے درمیان فرق کرتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ اصل کیا ہے اور تبدیلی کیا ہے۔ ﴿4﴾ یہ قرآن مجید ہدایت اور گمراہی میں، حق اور باطل میں، صحیح اور غلط میں اپنی دلیلوں اور واضح بیانات سے فرق کر دیتا ہے۔ جو اس پر ایمان نہیں لاتا اس کے پاس کوئی دلیل نہیں رہنے دیتا۔ اس لیے قرآن حکیم فرقان ہے۔

سوال 3: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ﴾ ”یقیناً جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا کفر کیا، ان کے لیے زبردست عذاب ہے“ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنے والوں کے لیے کیا سزا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کا کفر کرنے والوں کو دھمکی دی ہے کہ جن لوگوں نے معزز رسولوں کی مخالفت کی اور اس کی آیات کو جھٹلایا وہ انہیں انتقام لیے بغیر نہیں چھوڑے گا، ان کے لیے زبردست عذاب ہے کیونکہ اس نے تمام شبہات کو دور فرما دیا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کا کفر کرنے والوں کو دھمکی دی ہے کہ قیامت کے دن ان کی سخت پکڑ ہوگی، اس کے قہر اور عذاب سے کوئی چھڑا نہیں سکے گا، جس کی شدت کا اندازہ کرنا ممکن نہیں۔

سوال 4: ﴿وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ سب پر غالب، بدلہ لینے والا ہے“ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ عزیز ہے، سب پر غالب ہے۔ اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ اس کے سامنے انسان مغلوب ہو جائیں گے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ ذو انتقام ہے، انتقام لینے پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہے، اس کی پکڑ شدید ہے، وہ خوفناک انتقام بھی لے سکتا ہے۔ جو اس کی نافرمانی کرے گا وہ اس سے انتقام لے گا لہذا آیات کا انکار کرنے سے بچ جاؤ۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ﴾ (5)

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس سے کچھ بھی چھپا نہیں رہتا نہ ہی زمین میں اور نہ ہی آسمان میں۔“ (5)

سوال: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ﴾ ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس سے کچھ بھی چھپا نہیں رہتا نہ ہی زمین میں اور نہ ہی آسمان میں“ یہ کہہ کر کس حقیقت کا احساس دلایا جا رہا ہے؟

جواب ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس سے کچھ بھی چھپا نہیں رہتا نہ ہی زمین میں اور نہ ہی آسمان میں“ یہ کہہ کر اس حقیقت کا احساس دلا یا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ظاہر اور پوشیدہ تمام معلومات پر محیط ہے۔ ﴿1﴾ اس کائنات میں اس سے کوئی چیز پوشیدہ رکھی نہیں جاسکتی۔ ﴿2﴾ کسی نیت اور ارادہ کو بھی اللہ تعالیٰ سے چھپایا نہیں جاسکتا۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ ہی آسمان و زمین کے غیب کو جانتا ہے۔ ﴿4﴾ کوئی تدبیر اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں۔ ﴿5﴾ اس لیے کوئی سزا سے بچ جائے اس کا امکان نہیں۔ ﴿6﴾ اللہ تعالیٰ غالب ہے کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں، اس سے کوئی چھپ نہیں سکتا، کوئی بچ نہیں سکتا، اس لیے اس کی آیات کا انکار کرنے سے باز آ جاؤ۔

﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (6)

”وہی ہے جو رحموں میں جیسے چاہتا ہے تمہاری صورتیں بنا دیتا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ سب پر غالب، کمال حکمت والا

ہے۔“ (6)

سوال 1: ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ ”وہی ہے جو رحموں میں جیسے چاہتا ہے تمہاری صورتیں بنا دیتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”وہی ہے جو رحموں میں جیسے چاہتا ہے تمہاری صورتیں بنا دیتا ہے“ ماؤں کے پیٹوں کے بچوں کو کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ باریک بینی سے انہیں سنبھالتا ہے۔ مکمل وجود رکھنے والے اور ناقص بچوں کو بھی وہ پورے طریقے سے سنبھالتا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ جو خود ماں کے پیٹ سے جنم لے وہ اللہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے سلسلے کو خود قائم کیا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر کشی کی جیسے اس نے چاہی لہذا یہ عقیدہ باطل ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام رب ہیں یا اس کے بیٹے۔ ﴿4﴾ جو رب ماں کے پیٹ میں جیسی چاہتا ہے صورتیں بناتا ہے پھر وہ بچے کی چھوٹی بڑی ضرورتیں پوری کرتا ہے، یقیناً وہی راہ نمائی کر سکتا ہے۔

سوال 2: ﴿لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ ”اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ سب پر غالب کمال حکمت والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ سب پر غالب کمال حکمت والا ہے“ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اس سے اس کا معبود ہونا ثابت اور متعین ہوتا ہے یعنی الوہیت اور عبودیت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اس کے ماسوا جس جس کو پوجا جاتا ہے ان کی الوہیت باطل ہے۔ ﴿2﴾ اس سے عیسائیوں کے اس عقیدے کی تردید ہو جاتی ہے جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو معبود سمجھتے ہیں۔ ﴿3﴾ ”اس کے سوا کوئی معبود نہیں“ اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی کسی قسم کی عبادت نہ کی جائے، اس کے سوا نہ کسی کے لیے قیام ہے، نہ رکوع، نہ سجدہ، نہ قربانی، نہ نذر و نیاز۔ ہر حالت میں صرف اسی سے دعا کی جائے، اس کے سوا کسی سے دعا نہ کی جائے، صرف اسی کے گھر

بیت اللہ کا طواف کیا جائے، صرف اسی کی قسم کھائی جائے، صرف اسی کی غیر مشروط حاکمیت تسلیم کی جائے۔ اس کی عبادت میں کوئی اس کا ساجھی شریک اور مد مقابل نہیں ہے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ العزیز ہے وہ حیات اور تصویر سازی پر پوری طرح غلبہ رکھتا ہے۔ وہ ایسی غیر فانی عزت والا ہے جسے کوئی پانہیں سکتا۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ «الْحَكِيمُ» ”کمال حکمت والا ہے“ اس کے تمام احکام حکمتوں پر مبنی ہیں۔ اس کا تخلیقی عمل جو گہری ٹیکنالوجی پر مبنی ہے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی، نہ کوئی دوسرا اس کام میں اس کا شریک ہوتا ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ

فَيُفَكِّرُونَ مِمَّا شَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۗ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ

مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَكْفُرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (7)﴾

”وہی ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری جس میں سے بعض محکم آیات ہیں وہی کتاب کی اصل ہیں اور کچھ دوسری کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں پھر جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس میں سے ان آیات کے پیچھے لگ جاتے ہیں جو کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں، فتنہ کی تلاش کے لئے اور اس کی اصل مراد کی تلاش کے لئے، حالانکہ ان کی اصل مراد کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور علم میں پختگی رکھنے والے لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، سب ہی ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور نصیحت نہیں قبول کرتے مگر جو عقل مند ہیں۔“ (7)

سوال 1: ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ ”وہی ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری جس میں سے بعض محکم آیات ہیں وہی کتاب کی اصل ہیں اور کچھ دوسری کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ﴾ ”وہی ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری“ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ پر کتاب نازل کی ہے۔ ﴿2﴾ ﴿مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ﴾ جس میں سے بعض محکم آیات ہیں۔ قرآن مجید سب کا سب محکم (پختہ، مضبوط) ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقُرْآنُ حُنُوقًا فَذُكِّرُوا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ﴾ اور کون اللہ تعالیٰ سے فیصلہ کرنے میں بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں؟ (المائدہ: 50) (الف) ﴿مُحْكَمَاتٌ﴾ سے مراد وہ آیات ہیں جن کا مفہوم سمجھنے میں کسی کو مشکل پیش نہیں آتی۔ ان کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے اور ہر شخص اسے سمجھ لیتا ہے، اس میں کائناتی نشانیاں شامل ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور آخرت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان میں احکامات، مسائل، تاریخی واقعات، عبرت اور نصیحت کی باتیں محکم ہیں۔ (ب) جن میں اللہ تعالیٰ کی ججیتیں، لوگوں کا بچاؤ اور حق و باطل کے نزاع کے فیصلے ہیں۔ (مختصر ابن کثیر: 200/1) (ج) محکم کی سب سے بہتر تعریف یہ ہے کہ جس کا معنی واضح اور جس کی دلالت ظاہر ہو۔ (تیسیر الرحمن: 165/1) (د) ایسی

آیات میں دنیا کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے، ان آیات میں گمراہیوں کی تردید اور سیدھے راستے کی وضاحت کی گئی ہے، ان آیات میں دین کے بنیادی اصول بتائے گئے ہیں، دنیا کی زندگی کے احکامات ہیں مثلاً عبادات، اخلاق، فرائض اور امر و نہی وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ﴿3﴾ ﴿هُنَّ أُمَّ الْكِتَابِ﴾ ”وہی کتاب کی اصل ہیں“ ﴿أُمَّ﴾ ہر شے کی اصل کو کہتے ہیں۔ مقاتل بن حیان نے کہا: ﴿أُمَّ الْكِتَابِ﴾ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اہل دین میں سے کوئی ایسا نہیں جو ان پر راضی نہ ہو۔ (ابن ابی حاتم: 2/593) ﴿4﴾ ﴿وَأَعْرُؤُكُمْ مُتَشَابِهَةٌ﴾ ”اور کچھ دوسری کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں“ ﴿مُتَشَابِهَةٌ﴾ سے مراد وہ آیات ہیں جن کے معنی سمجھنے میں بعض لوگ شبہ میں پڑ جاتے ہیں۔ جن کا مفہوم ذہن انسانی کی دسترس سے بالا ہوتا ہے۔ (تیسیر القرآن: 1/246) جس کا معنی واضح نہ ہو یا جس کی دلالت ظاہر نہ ہو۔ (تیسیر الرحمن: 1/165) مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات، اللہ تعالیٰ کی صفات، مثلاً ”رحمن عرش پر مستوی ہے“، کسی کو معلوم نہیں یا جنت دوزخ کے حالات، تقدیر کے مسائل اور ملائکہ وغیرہ کے بارے میں ذکر کیا گیا ہو۔ ﴿5﴾ قرآن مجید کی بہت زیادہ آیات محکم ہیں جو آسانی سے ہر شخص کی سمجھ میں آجاتی ہیں ان کی طرف ہر شخص کو رجوع کرنا چاہئے۔ قرآن مجید کی کچھ آیات متشابہ ہیں جو بعض لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ ایسی آیات کو ایسی صورت میں محکم آیات کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے۔ اس طریقے سے آیات ایک دوسرے کی تائید کرتی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں۔

سوال 2: ﴿مُتَشَابِهَةٌ﴾ کس کے دل میں شک پیدا نہیں کرتیں؟

جواب: ﴿مُتَشَابِهَةٌ﴾ اس شخص کے دل میں شک پیدا نہیں کرتیں جس کو یہ یقین آجاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے پھر اس کے اندر خلجان پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ: ﴿1﴾ ایسا شخص سیدھا سادا مفہوم لیتا ہے۔ ﴿2﴾ جہاں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے وہاں کھوج لگانے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے کلام پر ایمان لا کر اپنی توجہ دوسری طرف کر لیتا ہے۔

سوال 3: ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾ ”پھر جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس میں سے ان آیات کے پیچھے لگ جاتے ہیں جو کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں فتنہ کی تلاش کے لئے اور اس کی اصل مراد کی تلاش کے لئے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ“ پھر جن کے دلوں میں کجی ہے، پھر جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے یعنی جو لوگ سیدھے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں۔ جن کے دل ہدایت پر نہیں، جو گمراہ ہیں، جن کے ارادے ٹیڑھے ہیں۔ ﴿زَيْغٌ﴾ ”دل کی کجی“ سے مراد عقل کی کجی ہے یعنی وہ کسی معاملے کو صحیح رخ سے دیکھے، نہ صحیح رائے قائم کر سکے اور اس طرح غلط فہمیوں میں پڑ جائے۔ دل کی کجی سے مراد شہوات، شہوات اور فتنوں کی وجہ سے حق سے ہٹ جانا ہے۔ (ایسر التفاسیر: 157,158) ﴿2﴾ ﴿فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ﴾ ”وہ اس میں سے ان آیات کے پیچھے لگ جاتے ہیں جو کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں“، یعنی دل اور عقل کی کجی والے محکم آیات کو چھوڑ کر متشابہ کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور محکم آیات کو متشابہ کی روشنی میں سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ﴿مُتَشَابِهَةٌ﴾ کے پیچھے وہ لوگ پڑتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے۔ سیدنا ابن

عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: شک کرنے والے ﴿مُتَشَبِّهَاتٌ﴾ کے پیچھے پڑتے ہیں۔ (تفسیر ابن ابی حاتم: 595/2) ﴿3﴾ ﴿اِبْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ﴾ ”فتنہ کی تلاش کے لئے“ یعنی وہ لوگوں کو فتنے میں مبتلا کرتے ہیں۔ متشابہ میں چونکہ اشتباہ موجود ہوتا ہے اس لیے اس کے ذریعے دل اور عقل کی کجی والے فتنہ اٹھاتے ہیں۔ ”فتنہ کی تلاش کے لئے“ لوگ ﴿مُتَشَبِّهَاتٌ﴾ کے پیچھے ایسے پڑتے ہیں جیسے عیسائی پڑے۔ انہوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہی گئی بات ”عبداللہ“ یعنی اللہ تعالیٰ کا بندہ اور ”نبی“ یعنی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کو چھوڑ کر ”کلمۃ اللہ“ اور ”روح اللہ“ کو لے کر اس کی ایسی تاویلیں کیں جس سے ان کے عقائد کی گمراہی کی تائید ہوتی ہے۔ ایسے ہی مسلمانوں میں سے بھی بدعات میں مبتلا ہونے والوں کا حال ہے۔ ﴿4﴾ ﴿وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾ ”اور اس کی اصل مراد کی تلاش کے لئے“ تاویل سے مراد کسی چیز کی اصل حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی آیات کی حقیقی مراد نہیں جانتا۔ دل اور عقل کی کجی والے تاویل کی تلاش میں اس طرح رہتے ہیں کہ آیت کو اپنے خیال کے مطابق لے کر اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں یعنی قرآن کو اپنی رائے کے مطابق بنا دیتے ہیں۔

سوال 4: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ﴾ ”حالانکہ ان کی اصل مراد کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا“ کی وضاحت کریں؟
جواب: ”حالانکہ ان کی اصل مراد کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا“ اس سے مراد یہ ہے کہ ﴿مُتَشَبِّهَاتٌ﴾ کی تاویل یعنی ان کی حقیقی مراد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

سوال 5: ﴿مُتَشَبِّهَاتٌ﴾ کے بارے میں نبی ﷺ نے کیا راہ نمائی فرمائی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”قرآن کریم میں شبہ کر کے جھگڑنا کفر ہے۔“ (سنن ابی داؤد: 4603) ﴿2﴾ آپ ﷺ نے فرمایا: میری امت میں سے ایک قوم ہوگی جو قرآن تو پڑھے گی لیکن اسے اس طرح پھینکے گی جیسے کوئی کھجور کی گھٹلیاں پھینکتا ہو اس کے غلط مطالب بیان کرے گی۔ (تفسیر ابن کثیر: 390/1) ﴿3﴾ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی (هو الذي انزل عليك الكتاب آخر آيت اولوا الباب تک) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جب تم لوگ ایسے لوگوں کو دیکھو جو متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہوں تو یاد رکھو کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے، اس لیے ان سے بچتے رہو۔“ (صحیح بخاری: 4547، جامع ترمذی: 2994) ﴿4﴾ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے آیت (فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ) ”وہ لوگ جن کے دلوں میں کج روی ہے وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں فتنہ تلاش کرتے ہوئے اور اس کی تاویل تلاش کرتے ہوئے“ کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”جب تم انہیں دیکھو گی تو پہچان لو گی۔“ یزید کہتے ہیں: آپ ﷺ نے یہ کلمات دو یا تین بار ارشاد فرمائے۔ (جامع ترمذی: 2993)

سوال 6: ﴿وَالرَّسُخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ ”اور علم میں پختگی رکھنے والے لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، سب ہی ہمارے رب کی طرف سے ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَالرُّسُلُ فِي الْعِلْمِ﴾ ”اور علم میں پختگی رکھنے والے لوگ“ سے مراد علماء ہیں جو محکمات اور منتہیات کو جانتے ہیں۔ ﴿2﴾ نافع بن یزید کہتے ہیں کہ راسخ فی العلم وہ لوگ ہیں جو متواضع ہوں، جو عاجزی کرنے والے ہوں، رب کی رضا سے راضی ہوں، اپنے سے بڑوں سے مرعوب نہ ہوں اور اپنے سے چھوٹے کو حقیر سمجھنے والے نہ ہوں۔ (تفسیر ابن کثیر: 392/1) ﴿3﴾ یعنی جو لوگ مخلص ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ علم و فہم بھی رکھتے ہیں وہ محکمات کو اصل سمجھتے ہیں اور مشابہات کے من عند اللہ ہونے پر ایمان تو رکھتے ہیں لیکن ان کی تفصیلات سمجھنے اور متعین کرنے کے درپے نہیں ہوتے۔ (تفسیر الحواشی: 61/1) ﴿4﴾ ﴿يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ﴾ ”کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے“ پختہ علم والے لوگ علم کی وجہ سے جان لیتے ہیں کہ انسانی عقل و فکر اپنی موجودہ قوت اور موجودہ ذرائع سے مشابہات کے مفہوم کو نہیں پاسکتیں، اس لیے وہ پورے اطمینان سے کہتے ہیں ہم ان پر ایمان لائے۔ ﴿5﴾ ﴿كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ ”سب ہی ہمارے رب کی طرف سے ہے“ پختہ علم والوں کو ان کا ایمان آگے بڑھاتا ہے اور وہ کہتے ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اس لیے حق ہیں۔ ﴿6﴾ جن اشیاء کی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفات کی حقیقت و کیفیت، آخرت میں پیش آنے والے اوصاف کی حقیقت وغیرہ، ان کو اللہ تعالیٰ کے سوا واقعی کوئی نہیں جانتا۔ اس کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا بھی درست نہیں، کیونکہ یہ ایسی چیز کی کوشش ہے جسے جاننا ممکن ہی نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ ﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى﴾ رحمان عرش پر مستوی ہے۔ (طہ: 5) سائل نے کہا: ”کس طرح مستوی ہے؟“ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: استواء (قائم ہونا) معلوم ہے (یعنی واضح لفظ ہے جس کی تشریح کی ضرورت نہیں) اس کی کیفیت نامعلوم ہے۔ اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کے بارے میں یہی طرز عمل اختیار کرنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص ان کی کیفیت دریافت کرے تو امام مالک رحمہ اللہ کی طرح کہہ دیا جائے کہ یہ صفت تو معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت نامعلوم ہے۔ تاہم اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا (کہ یہ صفت کس طرح ہے) بدعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ صفات بتائی ہیں۔ ان کی کیفیت بیان نہیں فرمائی لہذا ہمیں اپنی حد تک آکر رک جانا چاہئے۔ حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ گمراہ لوگ ان مشابہ امور کے بارے میں بے فائدہ بحث کرتے ہیں، اور اس چیز کے حصول کی کوشش کرتے ہیں جنہیں معلوم کرنے کا کوئی طریقہ موجود نہیں، کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پختہ کار اہل علم ان پر ایمان لاتے ہیں، اور ان کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ اس طرح (فرمان الہی کو) تسلیم کر کے (تکلفات اور غلطیوں) سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ (تفسیر سعدی: 341/1)

سوال 7: علم میں پختگی کیسے آتی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ علم میں پختگی اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین سے آتی ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور وعیدوں پر یقین سے آتی ہے۔ ﴿3﴾ تکبر میں مبتلا نہ ہونے سے آتی ہے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہونے سے آتی ہے۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ سے ہدایت پر استقامت کی دعاؤں سے آتی ہے۔ ﴿6﴾ اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے آتی ہے۔ ﴿7﴾ اللہ تعالیٰ کے کلام اور اللہ تعالیٰ کے عہد پر پورا بھروسہ کر کے پختگی آتی

ہے۔ ﴿8﴾ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے صحیح شعور سے پختگی پیدا ہوتی ہے۔ ﴿9﴾ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر پختہ یقین رکھنے سے علم میں پختگی آتی ہے۔ ﴿10﴾ اللہ تعالیٰ کا خوف دل کے اندر موجزن ہونے سے پختگی آتی ہے۔ ﴿11﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی غافل نہ رہنے سے پختگی آتی ہے۔ ﴿12﴾ اپنے روز و شب میں فرائض کی ادائیگی کو نہ بھولنے سے علم میں پختگی آتی ہے۔

سوال 8: ﴿وَمَا يَكْفُرُ الْإِنْسَانُ لَبَابًا﴾ ”اور نصیحت نہیں قبول کرتے مگر جو عقل مند ہیں“ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَمَا يَكْفُرُ الْإِنْسَانُ لَبَابًا﴾ ”اور نصیحت نہیں قبول کرتے مگر جو عقل مند ہیں“ اللہ تعالیٰ کی نصیحت اور اس کی طرف سے آنے والے علم کو قبول کرنے والے صرف وہ لوگ ہیں جو عقل میں کامل ہیں۔ ان کی عقلوں تک نصیحت پہنچتی ہے تو انہیں اپنا فائدہ نظر آتا ہے اور وہ اس پر عمل کر لیتے ہیں اور انہیں اپنے نقصان کی باتیں معلوم ہوتی ہیں تو وہ ان سے بچ جاتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے پاس عقل ہی نہیں جن سے وہ فائدہ اٹھاسکیں۔ ﴿2﴾ نبی ﷺ نے عقل و فہم کی درستگی کے لیے راہ نمائی فرمائی ہے۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم حاصل کرو اسے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لیے حاصل کرنا باعث خشیت ہے، اور اس کی جستجو عبادت ہے، اسے دہرانا تسبیح ہے، اس کی تحقیق جہاد ہے، اسے سکھانا صدقہ ہے، اسے مستحقین کے لیے عام کرنا باعث تقرب ہے کیونکہ یہ حلال و حرام کی نشاندہی کرتا ہے اور اہل جنت کے راستوں کا مینار ہے۔ یہ بے زاری میں باعث الفت اور سفر کا ساتھی ہے، تہائی میں باتیں سنانے والا اور جنگی اور آسانی میں راہ نما ہے، دشمنوں کے خلاف ہتھیار اور دوستوں کے لیے زینت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے کئی لوگوں کو رفعت بخشے گا اور انہیں ایسا بہترین قائد اور پیش رو بنائے گا کہ ان کے قدموں کے نشانات کی پیروی کی جائے گی، ان کی عادات کو اپنایا جائے گا اور ان کی رائے کو صحیح سمجھا جائے گا۔ فرشتے ان سے دوستی کے خواہاں ہوں گے اور اپنے پروں سے ان کی گرد ہٹائیں گے۔ ہر خشک و تران کی مغفرت کی دعا کرے گا یہاں تک کہ سمندر کی مچھلیاں اور آبی جانور، جنگل کے درندے اور خشکی کے چوپائے بھی، کیونکہ علم دلوں کو جہالت (کی موت) سے (بچا کر) زندگی بخشتا ہے اور نگاہوں کو اندھیروں سے نکال کر روشن چراغ کا کام دیتا ہے۔ علم کے ذریعے آدمی اچھے لوگوں کے مرتبے کو جا پہنچتا ہے اور دنیا و آخرت میں بلندیوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ علمی سوچ بچار روزے کے برابر ہے۔ اسے پڑھنا پڑھانا تہجد کے برابر ہے۔ اسی کے ذریعے صلہ رحمی کا سبق ملتا ہے اور اسی کے ذریعے حلال و حرام کا امتیاز ہوتا ہے۔ یہ عمل کا امام ہے اور عمل اس کا مقتدی ہے۔ یہ سعادت مندوں کو نصیب ہوتا ہے اور بد بخت اس سے محروم رہتے ہیں۔ (جامع بیان العلم: 268)

﴿رَبَّنَا لَا تُؤْخَذْ قُلُوبُنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ (8)

”اے ہمارے رب! آپ ہمارے دلوں کو ٹیڑھانہ کر دینا، اس کے بعد کہ جب آپ نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے

رحمت عطا فرمانا، بے شک آپ ہی بے حد عطا کرنے والے ہیں۔“ (8)

سوال 1: ﴿رَبَّنَا لَا تُؤْخَذْ قُلُوبُنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا﴾ ”اے ہمارے رب! آپ ہمارے دلوں کو ٹیڑھانہ کر دینا، اس کے بعد کہ جب آپ

نے ہمیں ہدایت دی، کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿رَأَيْتَ لَاتُؤْمِرُ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا﴾ ”اے ہمارے رب! آپ ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر دینا، اس کے بعد کہ جب آپ نے ہمیں ہدایت دی، اے ہمارے رب ہمیں سیدھے راستے پر چلنے والا بنا، ہدایت پانے والا بنا اور ہدایت دینے والا بنا۔ ہمیں ان برے اعمال سے محفوظ رکھیں جن میں گم راہ لوگ مبتلا ہو چکے ہیں۔ ﴿2﴾ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اکثر اوقات یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔ ”يَا مُقَلِّبُ الْقُلُوبِ ثَبِّثْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ“ ”اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر جمادے“ میں نے عرض کیا: آپ ﷺ یہ دعا بہت زیادہ کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمام دل اللہ رحمان کی دو انگلیوں کی گرفت میں ہیں۔ جب وہ دلوں کو سیدھا کرنا چاہتا ہے سیدھا کر دیتا ہے اور جب وہ ٹیڑھا کرنا چاہے تو ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ (ترمذی: 2140) ﴿3﴾ سیدھے راستے پر آنے کے بعد بھی دل پھر جاتے ہیں۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا دل بھی پھر جاتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں ہر ایک کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہے خواہ وہ اسے ہدایت پر قائم رکھے یا پھیر دے۔“ (ابن حاتم)

سوال 2: اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کے بعد دلوں کو ٹیڑھا کیسے کر دیتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ جب لوگ جہالت یا عناد کی وجہ سے حق سے روگردانی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ دلوں کو ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ ﴿2﴾ دل متشابہ آیات کی وجہ سے ٹیڑھے ہو جاتے ہیں۔ دل دنیا کی محبت اور غیر اللہ کی محبت کی وجہ سے ٹیڑھے ہو جاتے ہیں۔

سوال 3: ﴿وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً﴾ ”اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما“ اس دعا میں جس یقین کی جھلک ہے اس کی وضاحت کریں؟

جواب: اس دعا میں یہ یقین جھلک رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے ہر بھلائی کا حصول ممکن ہے اور اس کی رحمت کی وجہ سے ہر برائی سے بچنا ممکن ہے۔

سوال 4: ﴿إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ ”بے شک آپ ہی بے حد عطا کرنے والے ہیں“ اللہ تعالیٰ کی صفت ”الوہاب“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ ”الوہاب“ ہے کثیر عطا کرنے والا ہے، موقع پر پہنچانے والا ہے۔ وہ اپنی حکمت کے تقاضوں کے مطابق جیسے چاہے تقسیم کرتا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، جس قدر چاہتا ہے ہدایت کے راستے پر ثبات عطا فرماتا ہے۔ ہدایت اس کی عطا ہے، ثبات اس کی عطا ہے۔ ﴿3﴾ پختہ علم والے اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک الوہاب کا وسیلہ اختیار کرتے ہیں کہ تو کثیر عطا کرنے والا ہے۔ ہمیں ہدایت عطا فرمادے، تو ہی مواقع بہم پہنچانے والا ہے ہمیں نفع مند علم کے مواقع عطا فرمادے۔ تو اپنی حکمت کے تقاضوں کے

مطابق تقسیم کرتا ہے، تو ہمارے حق میں اعمال صالحہ اور اپنی رضا کو رکھ دے۔ آمین۔

﴿رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ أَلَمْ يَلْمِ فِيهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ ۗ﴾ (9)

”اے ہمارے رب! بلاشبہ آپ ہی لوگوں کو اس دن جمع کرنے والے ہیں جس میں کوئی شک نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی

نہیں کرتا۔“ (9)

سوال 1: ﴿رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ أَلَمْ يَلْمِ فِيهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ ۗ﴾ ”اے ہمارے رب! بلاشبہ آپ ہی لوگوں کو اس دن

جمع کرنے والے ہیں جس میں کوئی شک نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اس سے مراد ہے کہ اے ہمارے رب! آپ لوگوں کو جزا کے دن جمع کرنے والے ہیں جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہم

اس پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ آپ نے ہمیں اس کی خبر دی ہے اور آپ کی بات حق ہے اور اس میں جزا دینے کا وعدہ کیا ہے اور آپ اپنے

وعدے کے خلاف نہیں کرتے۔ (تفسیر مراغی: 458/1) ﴿2﴾ ام ہانی سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ پہلے اور

بعد میں آنے والوں کو قیامت کے دن ایک میدان میں جمع کرے گا۔ (مسلم: 327) ﴿3﴾ یہ ایمان عمل پر آمادہ کرتا ہے اور غلطیوں سے بچاتا

ہے۔

سوال 2: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ ۗ﴾ ”بے شک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ ۗ﴾ ”بے شک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا“ کے بارے میں

فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ اس کے لیے ہے جس نے لا الہ الا اللہ کہا۔ (تفسیر ابن ابی حاتم: 602/2)

رکوع نمبر 10

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُغْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا أَوْلَادَهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۗ وَأُولَٰئِكَ هُمُ وَقُودُ النَّارِ﴾ (10)

”یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مال اور ان کی اولادیں اللہ تعالیٰ (کی پکڑ) سے ہرگز کچھ بھی ان کے کام نہ آئیں گے اور وہی لوگ

آگ کا ایندھن ہیں۔“ (10)

سوال 1: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُغْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا أَوْلَادَهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۗ﴾ ”یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مال اور ان کی

اولادیں اللہ تعالیٰ (کی پکڑ) سے ہرگز کچھ بھی ان کے کام نہ آئیں گے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا“ اللہ تعالیٰ نے کفر یعنی انکار حق کے پیچھے کام کرنے والی نفسیات پر ایسے

ضرب لگائی ہے کہ آج جو چیزیں تمہیں اہم دکھائی دیتی ہیں، کل حشر کے دن وہ تمہارے کام نہیں آئیں گی۔ آج کی چیزوں کی اہمیت اس وقت

تک ہے جب تک معاملہ انسان اور انسان کے درمیان ہے۔ کل جب معاملہ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ہو جائے گا، جب غیب کا پردہ پھٹ جائے گا تو یہ چیزیں اتنی بے وقعت ہو جائیں گی جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ ﴿2﴾ ﴿لَنْ نُعْزِبَ عَنْهُمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا أَؤَدُّهُمْ مِنْ اللَّهِ شَيْئًا﴾ ”ان کے مال اور ان کی اولادیں اللہ تعالیٰ (کی پکڑ) سے ہرگز کچھ بھی ان کے کام نہ آئیں گے“ جو لوگ اللہ تعالیٰ، اس کے رسولوں، کتابوں اور آخرت کا انکار کرتے ہیں اپنے کفر کی وجہ سے سخت عذاب کے مستحق ہیں۔ وہاں ان کے اعمال اور ان کی اولادیں کام نہیں آئیں گی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون امتوں میں بھی جاری رہا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایمان اور اعمال صالح کی قدر ہے۔ رب العزت کا فرمان ہے: ﴿وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرَّبُكُمْ عِنْدَ رَبِّي إِلَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الْوَسْطَىٰ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي الْعُرْفَاتِ أُولَئُونَ﴾ اور تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایسے نہیں ہیں جو تمہیں ہمارے قرب میں نزدیک کر دیں مگر جو ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو یہی لوگ ہیں جن کے عمل کی بنا پر ان کی دو گنی جزا ہے اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں پرامن ہوں گے۔ (سبا: 37)

سوال 2: ﴿وَأُولَئِكَ لَهُمْ وَقُودُ النَّارِ﴾ ”اور وہی لوگ آگ کا ایندھن ہیں“ کون سی چیز انسان کو دوزخ کا ایندھن بناتی ہے؟
جواب: حق کا انکار کرنا اور کفر کرنا انسان کو دوزخ کا ایندھن بناتا ہے۔

﴿كَذَٰبِ الْفِرْعَوْنَ ۖ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ فَآخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (11)

”جیسے فرعون کی قوم کا اور ان سے پہلوں کا حال ہوا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہوں کے باعث پکڑ لیا اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔“ (11)

سوال 1: ﴿كَذَٰبِ الْفِرْعَوْنَ ۖ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ فَآخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ﴾ ”جیسے فرعون کی قوم کا حال ہوا اور ان سے پہلوں کا حال ہوا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہوں کے باعث پکڑ لیا“ کی وضاحت کریں؟
جواب: ﴿1﴾ ﴿كَذَٰبِ الْفِرْعَوْنَ﴾ ”جیسے فرعون کی قوم کا حال ہوا“ آل فرعون اور ان سے پہلے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو، اس کے طریق کار کو نہیں مانا۔ انہوں نے رسولوں کی تعلیمات کو ماننے سے انکار کیا اور ان سے دشمنی رکھی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہوں کے بدلے میں پکڑ لیا۔ ﴿2﴾ ﴿وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ”اور ان سے پہلوں کا“ پہلوں سے مراد پہلی امتیں ہیں مثلاً قوم نوح، قوم ہود، قوم شعیب وغیرہ۔ ﴿3﴾ ﴿كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا﴾ ”جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا“ آیات کو جھٹلانے سے مراد آیات کا انکار کرنا، ان کو غلط ثابت کرنا، ان کو اپنے لیے ضروری خیال نہ کرنا اور انہیں قابل عمل نہ سمجھنا ہے۔ ﴿4﴾ ﴿فَآخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ﴾ ”تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہوں کے باعث پکڑ لیا“ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر اور آیات کو جھٹلانے کے سبب انہیں پکڑ لیا تھا۔
سوال 2: ﴿وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے فرعون اور آل فرعون کے انجام سے اپنے ﴿شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ یعنی سخت عذاب والا ہونے کا شعور دلایا ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلاتے تھے۔

﴿قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَعْتٌ كَثِيرٌ وَسُوءٌ مَبْعَدٌ﴾ (12)

”آپ ان لوگوں سے کہہ دو جنہوں نے کفر کیا عنقریب تم مغلوب کیے جاؤ گے اور جہنم کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہ بہت ہی

برا ٹھکانہ ہے۔“ (12)

سوال 1: ﴿قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا﴾ ”آپ ان لوگوں سے کہہ دو جنہوں نے کفر کیا“ کافروں سے یہاں کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: یہاں کافروں سے مراد یہود مدینہ بنو قینقاع ہیں۔ (ایسر التفسیر: 159)

سوال 2: ﴿سَعْتٌ كَثِيرٌ وَسُوءٌ مَبْعَدٌ﴾ ”عنقریب تم مغلوب کیے جاؤ گے اور جہنم کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے

اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿سَعْتٌ كَثِيرٌ﴾ ”عنقریب تم مغلوب کیے جاؤ گے“ نبی ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ﷺ کافروں سے کہہ دیں۔ کافروں کی

مغلوبیت کی پیشین گوئی جلد پوری ہو گئی۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر جلاوطن کئے گئے اور بنو قریظہ قتل کئے گئے پھر خیبر فتح کر کے تمام یہودیوں پر جزیہ

عائد کر دیا گیا۔ (فتح القدر) ﴿2﴾ ﴿وَسُوءٌ مَبْعَدٌ﴾ ”اور جہنم کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی موت کے بعد تم

جہنم میں اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ یہ تمہارے کفر، عناد اور حق کو پہچاننے کے بعد انکار کی بناء پر ہے۔ ﴿3﴾ ﴿وَيُؤَسِّسُ

الْجَهَنَّمَ﴾ ”اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے“ اپنی موت کے بعد حق کو پہچاننے کے بعد انکار کی بناء پر تم جہنم کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہ بہت ہی

برا ٹھکانہ ہے۔ (ایسر التفسیر: 160) ﴿4﴾ اس آیت میں مومنوں کی مدد اور فتح کی جانب اشارہ ہے اور کافروں کے لیے تنبیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے یہودی اور عیسائی کافروں کے خلاف مومنوں کی مدد فرمائی۔ وہ قیامت تک مدد فرماتا رہے گا۔ اس میں عبرت ہے اور قرآن کی ایسی نشانی

ہے جو آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کافر دنیا میں مغلوب ہونے کے ساتھ ساتھ قیامت کے دن جمع کر کے جہنم کی

طرف ہانک دیے جائیں گے جو برا ٹھکانہ ہے اور ان کے بد اعمال کا برابرہ ہے۔

سوال 3: اللہ تعالیٰ کی وعید کہ کافر مغلوب کیے جائیں گے اور جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے، کے انسان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ ”عنقریب تم مغلوب کیے جاؤ گے اور جہنم کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے“ یہ الفاظ انسان کو اس کی سرکشی کے بارے میں سوچنے پر

مجبور کرتے ہیں۔ ﴿2﴾ کفر حق کو چھپانا بھی ہے اور سرکشی کا رویہ بھی، مغلوبیت کے ساتھ جہنم کی طرف اکٹھے کیے جانے کے الفاظ سے انسان

سُرکشی کی وجوہات پر غور و فکر کر کے سرکشی چھوڑنے کے لیے اندر سے مجبور ہو جاتا ہے۔ ﴿3﴾ ”بہت ہی برا ٹھکانہ ہے“ کے الفاظ تو مہر مثبت

کردیتے ہیں اور انسان اگر شعور سے کام لینے والا ہو تو کفر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔

﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَهُمْ رَأَى الْعَيْنِ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصَرِهِ مَن يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ﴾ (13)

”یقیناً تمہارے لیے ان دو گروہوں میں ایک نشانی تھی جو ایک دوسرے کے مقابلے میں آئے۔ ایک گروہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا، وہ کھلی آنکھوں سے انہیں اپنے سے دو گنا دیکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی مدد سے قوت پہنچاتا ہے۔ بلاشبہ اس میں یقیناً اہل بصیرت کے لیے بڑی عبرت ہے۔“ (13)

سوال 1: ﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا﴾ ”یقیناً تمہارے لیے ان دو گروہوں میں ایک نشانی تھی جو ایک دوسرے کے مقابلے میں آئے“ دو گروہوں سے کون سے گروہ مراد ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ﴾ ”یقیناً تمہارے لیے ان دو گروہوں میں ایک نشانی تھی“ یقیناً تمہارے لیے عظیم عبرت تھی۔ ﴿2﴾ ﴿فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا﴾ دو گروہوں میں جو ایک دوسرے کے مقابلے پر آئے۔ یہ معاملہ غزوہ بدر میں ہوا تھا۔ ﴿3﴾ سیدنا مجاہد نے کہا: اس سے مراد محمد ﷺ اور ان کے اصحاب اور مشرکین قریش ہیں جو بدر کے دو گروہ ہیں۔

سوال 2: ﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرَةٌ﴾ ”ایک گروہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا“ اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ”ایک گروہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ رہا تھا“ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ جن کی تعداد 313 تھی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اور اللہ تعالیٰ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے لڑ رہے تھے۔ ﴿2﴾ ﴿فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ”اللہ تعالیٰ کی راہ میں“ سعید بن جبیر اللہ عزوجل کے قول ﴿فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ کے بارے میں فرماتے ہیں: اس سے مراد ہے اللہ عزوجل کی اطاعت میں۔ (تفسیر ابن ابی حاتم: 2/605) ﴿3﴾ ﴿وَأُخْرَى كَافِرَةٌ﴾ ”اور دوسرا گروہ کافر تھا“ اس سے مراد مشرکین قریش ہیں جن کی تعداد 1000 کے قریب تھی جو طغوت کے راستے میں لڑ رہے تھے۔

سوال 3: ﴿يَرَوْنَهُمْ مِثْلَهُمْ رَأَى الْعَيْنِ﴾ ”وہ کھلی آنکھوں سے انہیں اپنے سے دو گنا دیکھتے تھے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”وہ کھلی آنکھوں سے انہیں اپنے سے دو گنا دیکھتے تھے“ مومن اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ کافر تعداد میں ان سے بہت زیادہ ہیں۔ یہ اضافہ تین گنا سے زیادہ تھا۔ ﴿2﴾ رب العزت نے فرمایا: ﴿وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي آعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّبُكُمُ فِي آعْيُنِهِمْ﴾ اور جب تم مقابل ہوئے، وہ ان کو تمہاری آنکھوں میں کم دکھاتا تھا اور تمہیں ان کی نگاہوں میں بہت کم کرتا تھا۔ (الانفال: 44) یہ اللہ

تعالیٰ کی طرف سے مومنوں کی مدد تھی کہ وہ ظاہری طور پر کھلی آنکھوں سے کفار کو دو گنا دیکھنے کے باوجود مشرکین کی تعداد کو کم محسوس کر رہے تھے۔ اس وجہ سے بھی مسلمان حوصلے میں تھے۔ ﴿3﴾ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر والے دن ہمیں مشرکین کی تعداد اس قدر کم معلوم ہوئی کہ میں نے اپنے پاس کے ایک شخص سے کہا کہ یہ لوگ تو کوئی ستر ہوں گے اس نے کہا، نہیں نہیں سو ہوں گے جب ان میں سے ایک شخص پکڑا گیا تو اس سے مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا کہ مشرکین ہم سے دو گنے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر: 395/1)

سوال 4: ﴿وَاللَّهُ يُؤَيِّتُ بِنَصَرِهِ مَن يَشَاءُ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی مدد سے قوت پہنچاتا ہے“ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اپنی مدد سے کیسے قوت پہنچائی؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنوں کی مدد یہ تھی کہ کفار کو مومن اپنے سے دو گنا نظر آنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے کیا تا کہ کفار پر رعب طاری ہو جائے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرشتوں کے ذریعے بھی کی۔ ﴿3﴾ جب دونوں فوجیں ٹکرائیں تو اللہ تعالیٰ نے کفار کی نظر میں مومنوں کو دو گنا کر کے دکھایا تا کہ ان پر رعب طاری ہو جائے اور وہ بری طرح شکست کھائیں۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی مدد کی تو انہوں نے کفار کو شکست دی، ان کے سرداروں کو قتل کیا اور بہت سے افراد کو قید کر لیا۔ اس لیے کہ جو اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے اور جو کفر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے چھوڑ دیتا ہے۔

سوال 5: ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ﴾ ”بلاشبہ اس میں یقیناً اہل بصیرت کے لیے بڑی عبرت ہے“ کی وضاحت کریں؟
جواب: ”بلاشبہ اس میں یقیناً اہل بصیرت کے لیے بڑی عبرت ہے“ یعنی جن کی بصیرت اور عقل کامل ہے جس کی وجہ سے وہ دیکھ رہے ہیں کہ جس جماعت کی مدد کی گئی ہے وہی اہل حق ہیں اور دوسرے باطل ہیں۔ ورنہ محض ظاہری اسباب، سامان اور تعداد پر نظر رکھنے والا یہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس چھوٹی سی جماعت کا اتنی بڑی جماعت پر فتح پانا بالکل محال اور ناممکن ہے۔ ان اسباب کے پیچھے ایک عظیم تر سبب بھی ہے جسے بصیرت، ایمان اور توکل علی اللہ کی نظر ہی دیکھ سکتی ہے اور وہ سبب ہے اللہ تعالیٰ کا اپنے مومن بندوں کو تقویت بخشنا اور اپنے کافر دشمنوں کے خلاف ان کی مدد کرنا۔ (تفسیر منان: 345/1)

سوال 6: غزوہ بدر سے کیا اسباق ملتے ہیں؟

جواب: غزوہ بدر سے یہ سبق ملتا ہے کہ ﴿1﴾ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قوت سے غافل ہوتے ہیں اور اپنے اسلحے اور افرادی قوت پر پھولے نہیں سماتے انہیں اللہ تعالیٰ کیسے شکست دلواتے ہیں۔ وہ دیکھ لیں کہ چند مفلس مہاجرین اور مدینے کے کاشتکاروں کی چھوٹی سی جماعت سے قریش کے مضبوط قبیلے کو جو عرب کا سر تاج تھا اللہ تعالیٰ نے کیسے شکست دلوائی۔ ﴿2﴾ غزوہ بدر سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کی قوت اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ﴿3﴾ اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اس جہان میں قوت والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ﴿4﴾ اس سے یہ سبق بھی

ماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے فتح دے دے اور جسے چاہے شکست دے دے۔

سوال 7: غزوہ بدر کے ذریعے مومنوں اور کافروں کا فرق کیسے واضح ہوا؟

جواب: دونوں میں اخلاقی اعتبار سے واضح فرق تھا۔ ﴿1﴾ کافروں کے لشکر میں شراب کے دور چل رہے تھے، ناپنے اور گانے والی لونڈیاں آئی ہوئی تھیں اور خوب داد عیش دی جا رہی تھی۔ ﴿2﴾ مسلمانوں کے لشکر میں پرہیزگاری، خدا خونی اور انتہا درجے کا نظم و ضبط ان کی نمازوں کے ذریعے پتہ چل رہا تھا۔ بات بات پر اپنی قوت کا نہیں اللہ تعالیٰ کا نام تھا اور اسی کے آگے دعائیں اور التجائیں تھیں۔ ﴿3﴾ کامل عقل والے مومنوں اور کافروں کا فرق بھی دیکھ رہے تھے اور یہ بھی کہ جن لوگوں کی مدد کی گئی ہے وہ حق پر ہیں اور دوسرے باطل پر ہیں۔ ظاہری معاملات کو دیکھنے والا یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ چھوٹی جماعت اتنی بڑی جماعت پر غالب نہیں آسکتی۔ اہل بصیرت ایمان اور توکل علی اللہ کی وجہ سے بصارت سے نظر نہ آنے والے اسباب کے پیچھے عظیم سبب دیکھتے ہیں وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کافروں کے خلاف اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔

﴿رُئِينَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ

وَالْحَرِّثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ وَاللَّهُ عِنْدَ أَحْسَنِ الْمَقَامِ ﴿14﴾

”لوگوں کے لیے نفسانی خواہشات کی محبت خوش نما بنادی گئی، جو عورتیں اور بیٹے اور سونا چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانے اور نشان زدہ

گھوڑے اور مویشی اور کھیتی ہیں۔ یہ سب دنیا کی زندگی کا سامان ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس بہت اچھا ٹھکانہ ہے۔“ (14)

سوال 1: ﴿رُئِينَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ ”لوگوں کے لیے نفسانی خواہشات کی محبت خوش نما بنادی گئی“ اس سے کیا واضح کیا گیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ اس نے لوگوں کے لیے دنیا کی مرغوب چیزوں کی محبت مزین کر دی ہے۔ ان میں سے کچھ چیزوں کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے۔ باقی چیزیں ان کے بعد آتی ہیں۔ اس آیت کے ذریعے خواہشات اور مرغوبات کے مزاج اور ان کی حقیقت کو سمجھا دیا گیا ہے۔ ﴿2﴾ خواہشات اور مرغوبات مستحب ہیں۔ ﴿3﴾ خواہشات اور مرغوبات مکروہ اور غلیظ نہیں ہیں۔ ﴿4﴾ انسان اپنی شہوتوں سے اندھی محبت کرتا ہے لیکن جب وہ حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہیں تو ان کا غلام جانوروں سے قریب ہو جاتا ہے۔ ﴿5﴾ یہ آیت خواہشات اور مرغوبات کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ کی ذات سے قائم کرتی ہے۔ ﴿6﴾ مرغوبات میں دلوں کو مائل کرنے کی صفت پائی جاتی ہے۔ اس لیے دل ان کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں ایک طرف وہ لوگ ہیں جو مادی اشیاء کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ ان کی فکر، ان کے خیالات، ان کے اعمال، ان ہی مرغوبات کے لیے ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ اپنا مقصد زندگی بھول گئے ہیں۔ دنیا سے ان کا تعلق جانوروں کا سا ہے۔ وہ مرغوبات سے لذت لیتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ انہوں نے انہیں کیسے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا عذاب کے مقام جہنم تک جانے کا سبب بن جاتی ہے، دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے مرغوبات کا

اصل مقصد سمجھ لیا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہیں تاکہ یہ دیکھا جائے کہ کون اپنی خواہشات اور لذتوں پر اللہ تعالیٰ کی رضا کو ترجیح دیتا ہے۔ انہوں نے دنیا کو آخرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا۔ وہ دنیا سے اس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے مددگار ثابت ہو۔ ان کے جسم، ان لذتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنے میں مددگار ہوں۔ ان کے جسم تو ان کے ساتھ ہوتے ہیں مگر دل ان سے دور ہوتے ہیں کیونکہ یہ سب کچھ دنیا کی زندگی کا تھوڑا سا سامان ہے۔ ﴿7﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ایک روحانی تعلق کے ذریعے سے انسان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ مرغوبات کا استعمال بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔

سوال 2: ﴿ذُرِّيْعَ الْبَنَاتِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ لوگوں کے لیے نفسانی خواہشات کی محبت خوش نمابنانے میں کیا حکمتیں ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی محبت طبعی طور پر انسان کے دل میں ڈال دی ہے، جس میں بے شمار حکمتیں ہیں: ﴿1﴾ اگر انسان طبعی طور پر ان چیزوں کی طرف مائل اور ان سے محبت کرنے والا نہ ہوتا تو دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا، دنیا کی بقا کا انحصار اس پر تھا کہ لوگوں میں فطری طور پر ان چیزوں کی محبت پیدا کر دی جائے تاکہ وہ ان چیزوں کے مہیا کرنے اور باقی رکھنے کی فکر میں پڑ جائیں۔ ﴿2﴾ اگر خواہشات کی محبت اور رغبت انسان کے دل میں نہ ہو تو اس کو آخرت کی نعمتوں کا ذائقہ ہی معلوم نہیں ہوگا نہ ہی ان میں رغبت ہوگی پھر نیک اعمال کی کوشش کر کے جنت حاصل کرنے کی اس کو کیا ضرورت ہوگی؟ اور برے اعمال چھوڑ کر دوزخ سے بچنے کی کیا فکر ہوگی؟ ﴿3﴾ خواہشات کی محبت اور رغبت فطری طور پر انسان کے دل میں پیدا کر کے انسان کا امتحان لینا مقصود ہے کہ کون ان چیزوں کی محبت میں مبتلا ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھتا ہے اور کون ان کی اصل حقیقت اور ان کے فانی ہونے کا یقین کر کے اپنی ضرورت کے مطابق ان کی فکر کرتا ہے اور ان کو آخرت کے کام میں لگا تا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خواہشات کی محبت کو آزمائش کے لیے مرغوب بنا دیا ہے جیسا کہ اس نے فرمایا: ﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِينَةً لِّهَا لِيَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ یقیناً ہم نے زمین پر جو کچھ ہے اس کی زینت بنا دیا ہے تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ (الکھف: 7)

سوال 3: ﴿مِنَ النِّسَاءِ﴾ ”عورتیں“ خواہشات کی محبت میں عورتوں کو پہلے درجے پر کیوں رکھا گیا؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے عورت میں مرد کے لیے رغبت رکھی ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے عورت کے پاس ہی سکون رکھ دیا ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمِنَ الْاَيْتَةِ اَنْ خَلَقَ كَلِمَةً مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس ہی سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کر سکو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی، بلاشبہ اس میں یقیناً ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔ (الروم: 21) ﴿3﴾ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے عورتیں اور خوشبو بہت پسند ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔“ (نسائی: 3391) ﴿4﴾ سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں کے

فتنہ سے بڑھ کر نقصان دینے والا اور کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔ (صحیح بخاری: 5096) ﴿5﴾ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”دنیا سے بچ کر رہو اور عورتوں سے بھی محتاط رہو کیونکہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلا فتنہ عورت کی وجہ سے پیدا ہوا۔“ (صحیح مسلم: 6948)

سوال 4: ﴿وَالْبَيْنِ﴾ اور بیٹے، بیٹوں کی محبت کو انسان کے لیے کیوں خوش نما بنا دیا گیا؟

جواب: بیٹوں کی محبت کو انسان کے لیے اس لیے خوش نما بنا دیا گیا کہ بیٹوں کی محبت نسل کے تسلسل اور بقاء کے لیے ہوتی ہے۔ ﴿1﴾ رب العزت نے فرمایا: ﴿أَنْبَاَ أَمْوَالِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ فَفْتَنَةٌ﴾ جان لو تمہارے اموال اور تمہاری اولاد دو اقعاً آزمائش ہیں۔ (الانفال: 28) ﴿2﴾ ﴿إِنَّ مِنْ آذْوَانِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ فَاحَدٌ مُرُوهُمْ﴾ یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولادوں میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں۔ چنانچہ ان سے ہوشیار رہو۔ (التغابن: 14)

سوال 5: ﴿وَالْقَنَاطِيرَ الْمُقَنْطَرَةَ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ﴾ اور سونا چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانے، سونا چاندی کی محبت کو انسان کے لیے خوش نما بنا دیا گیا، اس کی وضاحت کریں؟

جواب: سونا چاندی سے انسان محبت کرتے ہیں اسی لیے انہیں خزانوں کی صورت میں جمع کرتے ہیں۔ ﴿1﴾ سیدنا کعب بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”دوبھوکے بھیڑیے جن کو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے وہ اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا دین کو مال اور عزت کی حرص برباد کرتی ہے۔“ (جامع ترمذی: 2376) ﴿2﴾ سیدنا کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے نبی ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔“ (جامع ترمذی: 2336) ﴿3﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بندہ کہتا ہے میرا مال میرا مال، حالانکہ اس کے مال میں سے اس کی صرف تین چیزیں ہیں: جو کھایا اور ختم کر لیا، جو پہنا اور پرانا کر لیا اور جو اس نے (اللہ تعالیٰ کے راستے میں) دیا اور (یہ اس نے آخرت کے لیے جمع کر لیا) اس کے علاوہ تو صرف جانے والا اور لوگوں کے لیے چھوڑنے والا ہے۔“ (صحیح مسلم: 7422) ﴿4﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”بوڑھے آدمی کا دل دو چیزوں کی محبت، لمبی زندگی اور مال کی کثرت پر جو ان ہے۔“ (جامع ترمذی: 2338)

سوال 6: انسان کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں بیوی، بچوں اور مال و جائیداد کے گرد کیوں جمع ہو جاتی ہیں، وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ انسان کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں بیوی بچوں اور مال و جائیداد کے گرد اس لیے جمع ہو جاتی ہیں کہ انسان کے لیے ان چیزوں کو مزین کیا گیا اور محبوب بنا دیا گیا ہے۔ ﴿2﴾ یہ انسان کا فطری میلان ہے، اس کی شخصیت میں یہ رغبت موجود ہے۔

سوال 7: ﴿وَالْحَيْبِ السُّؤْمَةِ﴾ ”اور نشان زدہ گھوڑے“ ان کی محبت کو انسان کے لیے خوش نمائندیا گیا، اس کی وضاحت کریں؟
 جواب: ﴿1﴾ ”نشان زدہ گھوڑے“ قیمتی اور قابل قدر چیز سمجھے جاتے تھے۔ مسند احمد کی حدیث میں ہے انسان کا بہترین مال زیادہ نسل والا گھوڑا ہے اور زیادہ پھل دار درخت کھجور ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: 397/1: ﴿2﴾) مسند احمد میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے گھوڑے تین طرح کے ہوتے ہیں۔ رحمن کا گھوڑا، انسان کا گھوڑا اور شیطان کا گھوڑا۔ رحمن کا گھوڑا وہ ہے جو نبی سبیل اللہ باندھا جائے۔ اس کا گوبر، پیشاب اور لید سب کا اجر ہے۔ شیطان کا گھوڑا جس کے ذریعے ایک دوسرے پر فخر کیا جاتا ہے اور انسان کا گھوڑا جس پر لوگ سواری کرتے ہیں، جو اس کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔

سوال 8: ﴿وَالْأَنْعَامِ﴾ ”اور مویشی“ مویشی جانوروں کی محبت کو انسان کے لیے خوش نمائندیا گیا، اس کی وضاحت کریں؟
 جواب: مویشی جانوروں پر عرب کی معیشت کا انحصار تھا ان کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر فخر کیا کرتے تھے۔ رب العزت نے اسی لیے بندوں پر اپنے انعام کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ﴿وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۖ وَلكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۖ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ ۗ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ اور اس نے چوپائے پیدا کیے جن میں تمہارے لیے گرمی حاصل کرنے کا سامان ہے اور بہت سے فوائد بھی اور ان ہی میں سے تم کھاتے بھی ہو۔ اور ان میں تمہارے لیے جمال ہے جب شام کے وقت تم چرا کر لاتے ہو اور جب صبح کے وقت تم انہیں چرانے لے جاتے ہو۔ اور وہ تمہارے بوجھ اس شہر تک اٹھالے جاتے ہیں جہاں تم جانوں کی مشقت کے بغیر کبھی پہنچنے والے نہیں تھے۔ یقیناً تمہارا رب بہت نرمی کرنے والا، نہایت رحم والا ہے۔ (النحل: 5:7)

سوال 9: ﴿وَالْعَرَبِ﴾ ”اور کھیتی“ کی محبت کو انسان کے لیے کیوں خوش نمائندیا گیا؟
 جواب: کھیتوں کے ساتھ انسانی اور حیوانی زندگی کی بقا کا تعلق ہے۔ ان کی ضرورت تمام ضروریات سے بڑھ کر ہے۔ انسانوں اور حیوانوں کی خوراک ان ہی کھیتوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی محبت کو دلوں کے اندر بسا دیا گیا۔

سوال 10: ﴿ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ”یہ سب دنیا کی زندگی کا سامان ہیں“ یہ کہہ کر کس چیز کی طرف توجہ دلائی گئی ہے؟
 جواب: ﴿1﴾ یہ مرغوبات دنیا کی زندگی کے لیے ضروری سامان ہے۔ ﴿2﴾ یہ مرغوبات ہمیشہ کی اعلیٰ زندگی کا سامان نہیں ہیں۔ ﴿3﴾ ان مرغوبات سے زیادہ قیمتی، زیادہ بلند اور زیادہ پاکیزہ مقصد آخرت کی کامیابی ہے۔ ﴿4﴾ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی ﷺ نے فرمایا: ”دنیا فائدہ اٹھانے کی چیز ہے اور اس کا بہترین فائدہ نیک بیوی ہے۔“ (صحیح مسلم: 3649) ﴿5﴾ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ ایک چٹائی پر سو کر بیدار ہوئے تو آپ ﷺ کے پہلو مبارک پہ نشان پڑے ہوئے تھے، ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! ہم آپ کے لیے بستر نہ بنا دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میرا دنیا سے کیا تعلق؟ میں تو دنیا میں ایک سواری کی طرح ہوں (جو دوران سفر) کسی درخت کے سایہ میں ٹھہرتا ہے اور آرام کرنے کے بعد اسے چھوڑ کر (اپنی منزل کی طرف روانہ) ہو جاتا ہے۔“ (جامع

ترمذی: 2377) ﴿6﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”دنیا ملعون ہے اور اس کی ہر چیز ملعون ہے مگر اللہ تعالیٰ کا ذکر اور وہ چیز جس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور عالم یا طالب علم“ (ملعون نہیں ہیں)۔ (جامع ترمذی: 2322) ﴿7﴾ دنیا ان کے لیے آخرت کے سفر کا زاد راہ بن جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کے دھوکے سے بچتے ہیں۔ ﴿8﴾ اللہ تعالیٰ نے عقل والوں کو مرغوبات کی محبت سے روکنے کے لیے دارالقراری یعنی متقیوں کا انجام بیان کیا ہے۔

سوال 11: دنیا میں انسان کی خواہشات کے ذریعے اس کا امتحان کیسے لیا جاتا ہے؟

جواب: دنیا امتحان کی جگہ ہے اور یہاں کی چیزوں میں انسان کے لیے کشش رکھی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ﴿1﴾ کون ہے جو ظاہر سے اوپر اٹھ کر آخرت کی ان دیکھی چیزوں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے؟ ﴿2﴾ اور کون ہے جو ظاہری کشش سے متاثر ہو کر دنیا کی چیزوں میں کھوجاتا ہے؟

سوال 12: دنیا کی چیزوں کی اہمیت کا احساس انسان کو آخرت سے کیسے غافل کر دیتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ دنیا میں انسان اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کی تعمیر میں اتنا مشغول ہو جاتا ہے کہ اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ دنیا سے آگے بھی کوئی مستقبل ہے جس کی تعمیر کی اسے فکر کرنی چاہئے۔ ﴿2﴾ دنیا میں انسان کو اپنا گھر آباد کرنا اتنا محبوب ہو جاتا ہے کہ اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ اس کے سوا بھی کوئی گھر ہے جسے آباد کرنے کے لیے مجھے مصروف ہونا چاہئے۔ ﴿3﴾ دنیا میں دولت سمیٹنا اور جائیدادیں بنانا انسان کو اتنا قیمتی لگتا ہے کہ وہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ اس کے سوا بھی کوئی دولت ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہئے۔

سوال 13: خواہشات کی محبت کے بارے میں اسلام نے کیا راہ نمائی کی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ایسی حدود کے اندر رہ کر خواہشات پوری کی جائیں جن سے نفس کی تعمیر ہو۔ ﴿2﴾ خواہشات کی محبت کی وجہ سے زندگی کی نشوونما ہو۔ ﴿3﴾ انسان خواہشات کی محبت سے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہے۔ ﴿4﴾ خواہشات کی محبت میں بھی انسان کا مقصد آخرت کے گھر کا حصول ہو۔ ﴿5﴾ انسان خواہشات کی محبت میں غرق ہو کر نہ رہ جائے۔ ﴿6﴾ اسلام نے شہوت و لذت اور اخلاقی بلندی و پاکیزگی میں توازن پیدا کیا ہے اور حد اعتدال میں اجازت دی ہے۔ ﴿7﴾ ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت خیال کرتے ہوئے ذریعہ آخرت بنایا جائے اور شریعت کی حدود میں رہ کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے تو یہ مذموم اور مغضوب نہیں بلکہ پسندیدہ ہیں۔ اصل چیز نیت اور عمل ہیں۔

سوال 14: ﴿وَاللَّهُ عِنْدَ أَحْسَنِ الْمَبَاقِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے پاس بہت اچھا ٹھکانہ ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اللہ تعالیٰ کے پاس بہت اچھا ٹھکانہ ہے“ دنیا اور اس میں جو کچھ ہے، پانی کی طرح ہے۔ اس میں انسان کا دل ایک کشتی کی طرح ہے۔ پانی جب تک کشتی کے نیچے اور ارد گرد رہے تو کشتی کے لئے مفید اور اس کے مقصد وجود کو پورا کرنے والا ہے۔ اگر پانی کشتی کے

اندر داخل ہو جائے تو یہی کشتی کے غرق ہونے اور تباہی کا سامان ہو جاتا ہے۔ دنیا کا مال و متاع جب تک انسان کے دل پر غالب نہ ہو اس کے لئے دین و دنیا میں مدگار ہے اور جس وقت اس کے دل پر چھا جائے تو دل کی بربادی ہے۔ ﴿2﴾ دنیا میں جو کچھ ہے قلیل ہے، زائل ہونے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے باقی رہنے والی نعمتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ﴿وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَبَإِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے پاس بہت اچھا ٹھکانہ ہے، یعنی لوٹ کر جانے کی بہترین جگہ ہے۔ اس لیے دنیا سے وہ طلب نہ کرو جو ﴿حُسْنُ الْمَبَإِ﴾ اچھا ٹھکانہ، کو حرام کر دے۔ یا اللہ ایسے حُسْنُ الْمَبَإِ کو ہمارے لیے حرام نہ کر دینا۔ (ترمذی: 2322)

﴿قُلْ أُوْنِيَّتِكُمْ بِحَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۗ لِّلَّذِينَ اٰتَقُوا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتْ جَنَّتٌ تَجْرِي مِّنْ تَحْتِهَا اَنْهٰرٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۗ

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بِوَسِيَّتِكُمْ اٰلِ عِبَادٍ ﴿15﴾

”آپ کہہ دیں کیا میں تمہیں ان سب سے بہتر نہ بتاؤں؟ پرہیزگاروں کے لیے ان کے رب کے پاس جنتیں ہیں جن کے نیچے

نہریں بہتی ہیں، اس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں، اور نہایت پاک صاف بیویاں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ہے اور اللہ تعالیٰ

بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔“ (15)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟

جواب: مسند احمد میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے اللہ جب کہ تو نے اسے زینت دے دی تو اس کے بعد کیا؟ اس پر اس کے بعد والی آیت اتری کہ اے نبی ﷺ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میں تمہیں اس سے بہترین چیزیں بتاتا ہوں۔ (تفسیر ابن کثیر: 397/1)

سوال 2: ﴿قُلْ أُوْنِيَّتِكُمْ بِحَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۗ لِّلَّذِينَ اٰتَقُوا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتْ جَنَّتٌ تَجْرِي مِّنْ تَحْتِهَا اَنْهٰرٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ”آپ کہہ دیں کیا میں تمہیں ان سب سے بہتر نہ بتاؤں؟ پرہیزگاروں کے لیے ان کے رب کے پاس جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿بِحَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ﴾ جو ان تمام چیزوں سے عورتوں، بیٹوں، مال اور جائیداد وغیرہ سے زیادہ بہتر ہیں۔ ﴿2﴾ ﴿لِّلَّذِينَ اٰتَقُوا﴾ ”پرہیزگاروں کے لیے“ جو اپنے رب سے ڈر گئے اور جنہوں نے شرک کو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کو چھوڑ دیا۔ ﴿3﴾ ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتْ جَنَّتٌ تَجْرِي مِّنْ تَحْتِهَا اَنْهٰرٌ﴾ ”ان کے رب کے پاس جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں“ ان کے محلات اور درختوں کے نیچے سے نہریں بہیں گی۔ دودھ، شہد، شراب اور شفاف پانی کی نہریں۔ ﴿4﴾ ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ”اس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں“ یعنی وہ اس میں رہیں گے تو اس کے بعد کبھی وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ نے متقیوں کا انجام بیان فرمایا ہے کہ ان

کے لیے آخرت کی نعمتیں دنیا کی مرغوبات سے بہتر ہیں۔ وہاں کے باغات میں خوب صورت محلات، پھولوں سے لدے ہوئے درخت، ان کے نیچے سے بہتی نہریں، پاک بیویاں اور ہمیشہ کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی رضا جس سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں۔ ان دونوں جہانوں کا موازنہ کر کے انتخاب کر لیں۔

سوال 3: تقویٰ کو اللہ تعالیٰ نے تمام خواہشات کی محبت سے افضل کیوں قرار دیا؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھ کر اس کی اطاعت کرنا اور اس کے عذابوں کے خوف سے اس کے روکے سے رک جانا تقویٰ ہے۔ ﴿2﴾ تقویٰ اللہ تعالیٰ کا خوف، اس کا ڈر ہے جو روحانی اور مادی دنیا کی اصلاح کرتا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ خواہشات میں غرق ہونے سے بچاتا ہے۔ ﴿4﴾ تقویٰ دنیا کی خواہشات کے مقابلے میں آخرت کی خواہشات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ رکھنے کی وجہ سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی رضا سب سے زیادہ محبوب ہو جاتی ہے۔ ﴿6﴾ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ دنیا اور آخرت کی خواہشات کے مقابلے میں سب سے بھاری، سب سے بڑی نعمت ہے۔

سوال 4: جو شخص ہمیشہ کی زندگی کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے اس کی زندگی کیسی ہوگی؟

جواب: ﴿1﴾ جو شخص ہمیشہ کی زندگی کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے دنیا کی رونقیں اس کی نظر میں حقیر ہو جائیں گی۔ ﴿2﴾ اس کا دل اس یقین سے بھر جائے گا کہ آخرت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ ﴿3﴾ ایسا شخص اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرے گا۔ ﴿4﴾ ایسا شخص آخرت کے لیے زیادہ حریص بن جائے گا۔ ﴿5﴾ ایسا شخص معاملات میں اپنی خواہشات کے پیچھے نہیں بھاگے گا۔ ﴿6﴾ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے عدل کو سامنے رکھ کر اپنا رویہ متعین کرے گا۔ ﴿7﴾ ایسے شخص کے قول اور عمل میں فرق نہیں ہوگا۔ ﴿8﴾ ایسے شخص کا مال اللہ تعالیٰ کے لیے وقف ہو جائے گا۔ ﴿9﴾ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جتنی بھی مشکلات آئیں ایسا شخص پوری استقامت کے ساتھ اس راستے پر قائم رہے گا۔ ﴿10﴾ اس کا دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے پکھلے گا۔ ﴿11﴾ اس کی تنہائیاں رب کی محبت میں بسر ہوں گی۔ ﴿12﴾ اس کے پاس اس کے سوا کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوگا کہ اے میرے اللہ! مجھے معاف کر دے۔

سوال 5: ﴿وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ﴾ ”اور نہایت پاک صاف بیویاں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور نہایت پاک صاف بیویاں ہیں“ جو حیض، منی، بول اور ہر طرح کے ظاہری و باطنی عیب اور نجاست سے پاک ہوں گی۔ ﴿2﴾ ”اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے“ اللہ عزوجل کی رضا ساری نعمتوں سے بڑھ کر ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی تھوڑی سی رضامندی سب سے بڑی ہے۔ (التوبہ: 72) ﴿3﴾ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے پوچھے گا کہ کیا تم لوگ خوش ہو گئے؟ تو اہل جنت کہیں گے: ہم کیوں نہ خوش ہوتے؟ تو نے تو ہمیں وہ کچھ دیا ہے

جو کسی کو بھی نہیں دیا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں تمہیں اس سے بھی افضل چیز دیتا ہوں۔ میں تمہیں اپنی رضامندی دیتا ہوں ایسی رضامندی جس کے بعد تم پر کبھی بھی ناراض نہیں ہوں گا۔ (صحیح مسلم: 7140)

سوال 6: ﴿وَاللَّهُ بِصِرِّ الْعِبَادِ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اللہ تعالیٰ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے“ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھتا ہے اور ان کی اچھی بری صفات کی خبر رکھتا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھتا ہے کہ کون نعمتوں کو پا کر اطاعت کا رویہ اختیار کرتا ہے اور کون نافرمانی کرتا ہے؟ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ بصیر ہے اس لیے وہ اپنے بندوں کو ان کے حق کے مطابق اجر دے گا۔

﴿الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا مَعَاذُكَ لِنُؤْمِنَ بِكَ وَأَنْتَ أَعْدَابُ النَّاسِ﴾ (16)

”وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! بلاشبہ ہم ایمان لائے سو ہمارے لیے ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے

بچالے۔“ (16)

سوال 1: ﴿الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا مَعَاذُكَ لِنُؤْمِنَ بِكَ وَأَنْتَ أَعْدَابُ النَّاسِ﴾ ”جو لوگ کہتے ہیں اے ہمارے رب! بلاشبہ ہم ایمان لائے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”جو لوگ کہتے ہیں اے ہمارے رب! بلاشبہ ہم ایمان لائے“ ایمان دل میں راسخ یقین کو کہتے ہیں۔ ﴿2﴾ جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم دل میں راسخ یقین کے ساتھ اس پر ایمان لائے جو آپ نے اپنے رسولوں پر نازل کیا ہے۔ ﴿3﴾ ایمان عقل پر نگہبان اور بدنی اعمال پر غالب رہتا ہے جس کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نہیں پھرتا الا یہ کہ نادانی یا بھول چوک ہو جائے۔ ﴿4﴾ ایمان کی وجہ سے توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ﴾ اللہ تعالیٰ پر توبہ کا قبول کرنا صرف انہی کے لیے ہے جو نادانی سے برائی کرتے ہیں پھر جلد ہی اس سے توبہ کرتے ہیں۔ (النساء: 17) ﴿وَإِنِّي لَعَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَى﴾ اور بلاشبہ جس شخص نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے، پھر سیدھی راہ پر چلا، تو یقیناً میں بہت بخشنے والا ہوں۔ (طہ: 82)

سوال 2: اس آیت میں متقیوں کی کن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔؟

جواب: اس آیت میں جنت الفردوس کے وارث ہونے والے متقیوں کی صفت ایمان، خشیت اور ان کی دعا کا ذکر کیا گیا۔

سوال 3: ﴿فَاعْفُرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَتَنَا عَذَابِ النَّاسِ﴾ ”سو ہمارے لیے ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے“ ایمان لانے کے بعد انسانوں کو گناہوں کی بخشش کی فکر کیوں لاحق ہو جاتی ہے؟

جواب: ”سو ہمارے لیے ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے“ ایمان لانے کے بعد ہی انسان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمال صالحہ کی جزا اور گناہوں کی سزا ملے گی۔ اس لیے اسے گناہوں کی بخشش کی فکر لاحق ہو جاتی ہے تاکہ وہ آگ کے

عذاب سے بچ سکے۔

سوال 4: ﴿الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّكَ آتِنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَتُبْنَا بِهَا إِنَّكَ أَنْتَ الرَّحِيمُ الْعَلِيمُ﴾ ”وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! بلاشبہ ہم ایمان لائے سو ہمارے لیے ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے، متقی اللہ تعالیٰ سے کیسے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّكَ آتِنَا﴾ ”وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! بلاشبہ ہم ایمان لائے، متقی سب سے پہلے اپنے ایمان کا اقرار کرتے ہیں اور قبولیت کی گھڑیوں میں یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم آپ پر، آپ کی کتاب پر، آپ کے نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ایمان کی بنیاد پر مغفرت طلب کرتے ہیں۔ ﴿2﴾ ﴿فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا﴾ ”سو ہمارے لیے ہمارے گناہ بخش دیں، متقی دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہمارے ایمان کی بدولت ہمارے گناہ معاف فرما دیجئے۔ اپنی رحمت سے ہماری خطائیں معاف فرما دیجئے۔ ﴿3﴾ ﴿وَتُبْنَا بِهَا﴾ اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔ متقیوں کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں گناہوں کے برے نتائج یعنی جہنم کی آگ سے بچالیجئے۔ ﴿4﴾ اس آیت سے رات کے آخری حصے میں استغفار کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: رات کے آخری حصے میں برکت اور بلندی والا معبود پہلے آسمان پر اتر کر اعلان فرماتا ہے کہ ہے کوئی سائل کہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اسے بخش دوں؟ (سنن ترمذی)

﴿الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالسَّاعِيْنَ بِآلِ سَعَادَةِ﴾ (17)

”وہ صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے اور فرماں برداری کرنے والے اور خرچ کرنے والے اور سحری کے اوقات میں بخشش مانگنے

والے ہیں۔“ (17)

سوال 1: ﴿الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالسَّاعِيْنَ بِآلِ سَعَادَةِ﴾ ”وہ صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے اور فرماں برداری کرنے والے اور خرچ کرنے والے اور سحری کے اوقات میں بخشش مانگنے والے ہیں“ اس آیت میں تقویٰ والوں کی کن صفات کمال کا تذکرہ ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اس آیت میں متقیوں کی جن صفات کمال کا تذکرہ ہے وہ صبر، صداقت، قنوت، انفاق اور سحری کے وقت استغفار ہیں۔ ﴿2﴾ ﴿الصَّابِرِينَ﴾ ”صبر کرنے والے“ جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کاموں پر کاربند رکھتے ہیں، اس کی ناراضگی کے کاموں یعنی گناہوں سے بچنے کے لیے استقامت اختیار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے مطابق پیش آنے والے مصائب اور مشکلات پر صبر کرتے ہیں۔ ﴿3﴾ ﴿وَالصَّادِقِينَ﴾ جو اپنے ایمان، اقوال اور حالات میں سچے ہیں۔ ﴿4﴾ ﴿وَالْمُؤْمِنِينَ﴾ ”اور فرماں برداری کرنے والے“ قتادہ اور ربیع بن انس نے کہا: ”جو دل کی خوشی سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔“ (ابن ابی حاتم) ﴿5﴾ ﴿وَالسَّاعِيْنَ﴾ ”اور خرچ کرنے والے“ جو اللہ

کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ ضرورت مندوں کو بھی دیتے ہیں اور دین کی حفاظت کے کاموں میں بھی خرچ کرتے ہیں۔ ﴿6﴾
 ﴿وَالسُّعْفُورِ بِالْأَسْكَارِ﴾ ”اور سحری کے اوقات میں بخشش مانگنے والے ہیں“ اس سے مراد رات کے آخری حصے میں تہجد ادا کرنا اور کثرت سے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنا ہے۔

سوال 2: صبر انسان کو کیا دیتا ہے؟

جواب: صبر سے انسان کے اندر تین بنیادی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں: ﴿1﴾ ثابت قدمی۔ ﴿2﴾ مشکلات میں بھی اللہ تعالیٰ کے دین پر قائم رہنا۔ ﴿3﴾ انسان کا اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہو جانا کہ یہ میرے بارے میں میرے رب کا فیصلہ ہے۔

سوال 3: صدق (سچائی) سے انسان کی زندگی میں کیا تبدیلی آتی ہے؟

جواب: صدق انسان کو نیکی کا راستہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت تک لے جاتی ہے۔

سوال 4: قنوت کسے کہتے ہیں؟

جواب: (i) اطاعت پر ہمیشگی اختیار کرنا۔ (ii) اللہ تعالیٰ کے لیے خشوع و خضوع کے ساتھ دل کو جھکائے رکھنا۔ (iii) قنوت عبادت کی روح اور خلاصہ ہے۔ (iv) قنوت کے بغیر عبادت بے روح اور بے ثمر درخت ہے۔

سوال 5: انفاق سے کیا مراد ہے؟

جواب: انفاق سے مراد اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنا ہے خواہ وہ واجب نفقہ ہو یا مستحب۔ انفاق نیکی کے تمام کاموں میں ہوتا ہے جس پر شارع نے رغبت دلائی ہو۔

سوال 6: انفاق فی سبیل اللہ کا فائدہ کیا ہوتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ انفاق فی سبیل اللہ سے انسان کو بخل سے نجات ملتی ہے۔ ﴿2﴾ انفاق سے مومن عملاً انسانی اخوت کو ذاتی خواہشات اور لذات پر ترجیح دیتا ہے۔ ﴿3﴾ انفاق کی وجہ سے مومن دولت کے ہاتھوں رسوا نہیں ہوتا۔ ﴿4﴾ انفاق سے مومن social security کا ایسا ماحول پیدا کرتا ہے جو سب انسانوں کے لیے خوش گوار ہوتا ہے۔ ﴿5﴾ انفاق فی سبیل اللہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا نصیب ہوتی ہے۔

سوال 7: رات کے پچھلے پہر میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعائیں کون کرتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ جس کے لیے آخرت کی کامیابی سب سے بڑا کام بن جائے۔ ﴿2﴾ جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول سب سے بڑا مشن بن جائے۔ ﴿3﴾ جو اپنے آپ کو معمولی اور گناہ گار سمجھتا ہے اس لیے رب سے مغفرت کی درخواست کرتا ہے اور ایسا وقت منتخب کرتا ہے جب دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ ﴿4﴾ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اول رات، درمیانی اور آخری رات میں وتر پڑھے ہیں سب سے آخری وقت رسول اللہ ﷺ کے وتر پڑھنے کا سحری تک تھا۔ ﴿5﴾ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رات کو تہجد پڑھتے

رہتے اور اپنے غلام سیدنا نافع سے پوچھتے کیا سحر ہوگئی؟ جب وہ کہتے: ہاں تو آپ ﷺ صبح صادق کے نکلنے تک دعا و استغفار میں مشغول رہتے۔ ﴿6﴾ سیدنا حاطب بن علیؓ فرماتے ہیں: سحری کے وقت میں نے سنا کہ کوئی شخص مسجد کے کسی گوشہ میں کہہ رہا ہے، اے اللہ تو نے مجھے حکم کیا میں بجالایا، یہ سحر کا وقت ہے مجھے بخشش دے، میں نے دیکھا تو وہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ تھے۔ ﴿7﴾ سیدنا انس بن مالکؓ فرماتے ہیں ہمیں حکم کیا جاتا تھا کہ ہم جب تہجد کی نماز پڑھیں، تو سحری کے آخری وقت ستر مرتبہ استغفار کریں، اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا کریں۔ (تفسیر ابن کثیر: 398/1)

سوال 8: رات کی آخری گھڑیوں میں استغفار کرنا انسان کے لیے کیسے بہت مفید ہو جاتا ہے؟

جواب: رات کی آخری گھڑیوں میں استغفار کرنا انسان کے لیے اس اعتبار سے بہت مفید ہو جاتا ہے کہ ﴿1﴾ یہ وقت پرسکون ہوتا ہے۔ ﴿2﴾ اچھے خیالات کا انسان کے دل و ذہن پر القاء ہوتا ہے۔ ﴿3﴾ اس میں انسانی نفس کے تصورات جاگ جاتے ہیں۔ ﴿4﴾ ایسے وقت میں انسان کی روح اور کائنات کی روح رب کائنات کے سامنے ایک ہو جاتی ہے۔ ﴿5﴾ ایسے وقت میں استغفار انتہائی عمدہ روحانی اثرات پیدا کرتی ہے۔

﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِنَافِثِطٍ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (18)

”اللہ تعالیٰ نے اور فرشتوں نے اور اہل علم نے گواہی دی ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اس حال میں کہ وہ انصاف

پر قائم ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔“ (18)

سوال 1: ﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِنَافِثِطٍ﴾ ”اللہ تعالیٰ نے اور فرشتوں نے اور اہل علم نے گواہی دی ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے“ اللہ تعالیٰ نے اپنے معبود برحق ہونے کی شہادت کیسے دی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے توحید کا پختہ ترین ثبوت پیش کیا ہے وہ ہے اللہ عزوجل کی اپنی گواہی اور اس کی مخلوق میں سے معزز ترین افراد یعنی فرشتوں اور علماء کی گواہی۔ (تفسیر سحری: 348/1) ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا اور جو کچھ وحی کے ذریعے سے بیان کیا اس کے ذریعے اس نے اپنی وحدانیت کی شہادت دی ہے۔ (فتح القدیر) ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کی شہادت یہ ہے کہ اس نے توحید پر قطعی دلائل قائم فرمائے ہیں۔ اس عظیم اصول پر آفاق و انفس کے دلائل قائم ہیں۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ کا جو بندہ بھی توحید کا علم لے کر اٹھا ہے اس نے ہمیشہ توحید کا انکار کرنے والوں اور مشرکوں کے خلاف اس کی مدد کی ہے۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو جو بھی نعمت حاصل ہے وہ اسی کی طرف سے ہے۔ اس کے سوا کوئی مشکلات کو دور نہیں کر سکتا۔ ﴿6﴾ مخلوق کے تمام افراد عاجز ہیں جو نہ اپنے آپ کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان سے بچا سکتے

ہیں اور نہ کسی اور کے نفع و نقصان پر اختیار رکھتے ہیں۔ ﴿7﴾ یہ زبردست دلیل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا واجب ہے اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا باطل ہے۔ (تفسیر سعدی: 348/1) ﴿8﴾ ﴿وَالْمَلِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ﴾ اور فرشتوں اور اہل علم نے، فرشتے اور اہل علم بھی توحید کی گواہی دیتے ہیں۔ فرشتوں کی گواہی کا علم ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے بتانے سے ہوا ہے۔ ﴿9﴾ ﴿وَأُولُو الْعِلْمِ﴾ اور اہل علم سے مراد وہ لوگ ہیں جو کتاب اور سنت کا علم رکھتے ہیں۔ (فتح القدیر) ﴿10﴾ اہل علم کی گواہی اس لیے معتبر ہے کہ تمام دینی معاملات میں ان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر توحید کے معاملے میں۔ ﴿11﴾ علماء کا توحید پر اتفاق ہے۔ انہوں نے لوگوں کو اس کی طرف دعوت دی ہے اور توحید تک پہنچنے کے راستے بتائے ہیں۔ (تفسیر سعدی: 349/1) ﴿12﴾ اہل علم اپنے علم کی وجہ سے باقی ساری کائنات کے مقابلے میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ ﴿13﴾ عقیدہ توحید پر اللہ تعالیٰ کی گواہی ہے جو ساری حقیقتوں کا براہ راست علم رکھتا ہے۔ معتبر فرشتوں کی گواہی ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا حکم نہیں چلتا۔ مخلوقات میں سے جن کے پاس علم ہے ان کی گواہی ہے کہ ایک اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کی تدبیر اور انتظام کرنے والا ہے۔ ﴿14﴾ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو منتخب کر کے اس عظیم معاملے میں شہادت دینے کے لیے مقرر کیا۔ ﴿15﴾ ﴿قَالُوا بِالْقِسْطِ﴾ اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے افعال اور بندوں کے معاملات کے فیصلے کرنے میں ازل سے انصاف کے ساتھ متصف ہے۔ امر و نہی میں بھی اس کا راستہ صراط مستقیم ہے، خلق و تقدیر میں بھی۔ (تفسیر سعدی: 349/1) ﴿16﴾ اللہ تعالیٰ، اس کے معزز فرشتوں، اہل علم، اور انبیاء کی گواہیوں کی وجہ سے مخلوق پر واجب ہے کہ وہ اتنی عظیم گواہیوں والے حکم کو تسلیم کریں اور اس پر عمل کریں۔ ﴿17﴾ توحید پر عظیم گواہیوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ شرف والا کام توحید کا علم حاصل کرنا ہے۔

سوال 2: امت مسلمہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے شہادت کے مقام پر فائز کیا ہے، قرآن حکیم سے مثال دیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ اور اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو جائیں۔ (البقرہ: 143)

سوال 3: ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کے سوا کوئی رب نہیں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ﴿2﴾ ﴿هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ وہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے، وہ اپنے ملک اور اپنی خلق میں غلبہ رکھنے والا عزیز ہے اور اپنے تصرف میں حکیم ہے، وہ کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر نہیں رکھتا۔ مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ عرفات میں رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی تو اس کے بعد فرمایا: ﴿وَأَنَا عَلَى ذَلِكَ مِنَ الشَّهِيدِينَ يَا رَبِّ﴾ یعنی اے پروردگار! اور میں بھی اس پر شاہد ہوں۔ (ابن کثیر)

﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا خَلَّفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بِمَا بَيَّنَّاهُمْ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ

اللَّهُوَقَاتُ اللَّهُ سَرِيءُ الْحِسَابِ (19)

”یقیناً دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہے، اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی انہوں نے اختلاف نہیں کیا۔ مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آچکا آپس میں ضد کی وجہ سے اور جو اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتا ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔“ (19)

سوال 1: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ ”یقیناً دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہے“ دین کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ دین سے مراد ایسا نظام زندگی یا ضابطہ حیات ہے جسے انسان اس دنیا کے لیے یا دنیا و آخرت دونوں کے لیے بہتر سمجھ کر اختیار کرتا ہے۔ (تیسیر القرآن: 252/1) ﴿2﴾ اسلام کا مطلب سر تسلیم خم کرنا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور اطاعت پر جس کی دعوت اس کے رسولوں نے دی، جس کی ترغیب اس کی کتابوں نے دی۔ اس کے سوا کوئی دین قبول نہیں۔ ﴿3﴾ اسلام میں یہ بھی شامل ہے کہ محبت، خوف، امید، انابت اور دعا خالصتاً اس کے لیے ہو اور اس مقصد کے لیے اس کے رسول ﷺ کی پیروی کی جائے۔ یہی تمام رسولوں کا دین ہے جو ان کی پیروی کرے گا وہ ان کے راستے پر ہوگا۔ (تفسیر منان: 351) ﴿4﴾ ہر نبی کے زمانے میں ان کا لایا ہوا دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل قبول تھا۔ سب سے آخر میں نبی ﷺ کا لایا ہوا دین اسلام کہلایا جو قیامت تک باقی رہے گا۔ ﴿5﴾ رب العزت کا فرمان ہے: ﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ (آل عمران: 85) ﴿6﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ اس امت کا کوئی بھی یہودی اور نصرانی جو میری بات سنے، (شریعت) جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں (یعنی اسلام) اور وہ اس پر ایمان نہ لائے تو اس کا ٹھکانہ جہنم والوں میں سے ہوگا۔“ (صحیح مسلم: 386) ﴿7﴾ اہل کتاب اور مشرکین عرب کو آپ ﷺ نے دعوت دی۔ آپ ﷺ نے اس آیت کے مطابق عرب و عجم کے تمام ملوک و امرا کو دعوتی خطوط لکھے۔

سوال 2: ﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوْتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمْ الْعِلْمُ بَعِيَا بَيْنَهُمْ﴾ ”اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آچکا آپس میں ضد کی وجہ سے“ اہل کتاب نے علم آجانے کے بعد کیوں اختلاف کیا؟

جواب: ﴿1﴾ اہل کتاب کو ان کی کتابیں متحد ہو کر دین پر عمل کرنے کا حکم دیتی تھیں۔ لیکن انہوں نے علم آجانے کے بعد ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے باہم اختلاف کیا۔ ﴿2﴾ لوگوں کے باہمی اختلاف سے مراد ایک ہی دین کے ماننے والوں کے درمیان اختلاف ہے مثلاً یہودیوں کے اختلافات، عیسائیوں کی فرقہ بندیوں۔ ﴿3﴾ اختلافات کی بنیاد دلائل نہیں بلکہ حسد اور بغض تھا۔ ﴿4﴾ ﴿بَعِيَا بَيْنَهُمْ﴾ ”آپس میں ضد کی وجہ سے“ اس سے مراد ظلم اور حسد ہے۔ ﴿5﴾ اختلاف کی وجہ سے اور حسد اور تکبر کی نفسیات اسلام کی سچائی کا اعتراف

نہیں کرنے دیتی۔ ﴿6﴾ اختلاف کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حق واضح نہیں۔ حق واضح ہوتا ہے لیکن اس کا اعتراف نہیں کرتے۔

سوال 3: ﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيمٌ الْحَسَابِ﴾ اور جو اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتا ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ یہاں آیات سے مراد وہ آیات ہیں جو اسلام کے سچے دین ہونے پر گواہ ہیں۔ ﴿2﴾ مسند احمد میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک یہودی لڑکا جو نبی ﷺ کے لئے وضو کا پانی رکھا کرتا تھا اور جو تیاں لا کر رکھ دیتا تھا وہ بیمار پڑ گیا۔ نبی ﷺ اس کی بیمار پرسی کے لئے تشریف لائے۔ اس وقت اس کا باپ بھی اس کے سر ہانے بیٹھا ہوا تھا آپ ﷺ نے فرمایا: اے فلاں لا الہ الا اللہ کہہ۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور باپ کو خاموش دیکھ کر خود بھی چہو گیا، آپ ﷺ نے دوبارہ یہی فرمایا۔ اس نے پھر اپنے باپ کی طرف دیکھا تو باپ نے کہا: ابوالقاسم ﷺ کی مان لے تو اس بچے نے کہا: اشہد ان لا الہ الا اللہ وانک رسول اللہ۔ نبی ﷺ وہاں سے یہ فرماتے ہوئے اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے میری وجہ سے اسے جہنم سے بچالیا۔ (تفسیر ابن کثیر: 400,401/1) ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنے سر بیج الحساب ہونے کا علم اس لئے دلایا ہے کہ لوگ باہمی اختلافات چھوڑ دیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا حساب دینا ہے۔

﴿فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسَلْتُ وَجْهَ اللَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَسَلْتُكُمْ ۗ فَإِنْ أَسَلْتُمْ فَقَدْ

أَسَلْتُمْ ۗ وَإِنْ تَوَكَّلْتُمْ عَلَيَّ الْبَلَدُ ۗ وَاللَّهُ بِصِيْرَتِكُمْ آخِذٌ عَاتِدٌ ﴿20﴾

”پھر وہ لوگ اگر آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دو کہ میں نے اور جنہوں نے میری پیروی کی اپنے چہرے کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر دیا اور آپ ان لوگوں سے جو کتاب دیے گئے اور ان پڑھوں سے کہہ دیں: ”کیا تم تابع ہو گئے؟“ پھر اگر وہ تابع ہو جائیں تو یقیناً ہدایت پا گئے اور اگر وہ منہ موڑیں تو آپ کے ذمے صرف پیغام پہنچانا دینا ہے اور اللہ تعالیٰ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔“ ﴿20﴾

سوال 1: ﴿فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسَلْتُ وَجْهَ اللَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ ”پھر وہ لوگ اگر آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دو کہ میں نے اور جنہوں نے میری پیروی کی اپنے چہرے کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر دیا“ اس بات سے کیا توجہ دلائی جا رہی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿فَإِنْ حَاجُّوكَ﴾ ”پھر وہ لوگ اگر آپ سے جھگڑا کریں“ یعنی باطل دلیلوں سے آپ کے ساتھ جھگڑیں۔ ﴿2﴾ ﴿فَقُلْ أَسَلْتُ وَجْهَ اللَّهِ﴾ ”تو آپ کہہ دو کہ میں نے اپنے چہرے کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر دیا“ اس سے مراد ہے کہ میں نے اپنے تمام قلبی اور بدنی اعمال اللہ وحدہ لا شریک لہ کے لیے خالص کر لیے ہیں۔ جیسا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيفًا ۗ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ یقیناً میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف متوجہ کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، یک سو ہو کر، اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ (الانعام: 79) ﴿3﴾ ﴿وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ اور جنہوں نے میری پیروی کی ہے یعنی جنہوں نے

اپنے تمام اعمال کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر لیا۔ ﴿4﴾ میں نے اور میرے پیروکاروں نے اپنے مالک کے سامنے سر جھکا دیے ہیں اور ہم نے اسلام کے سوا سارے مذاہب کو چھوڑ دیا۔

سوال 2: ﴿وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُولِيْنَ أَسْأَلْتُمْ طَبَقًا أَسْأَلْتُمْ﴾ ”اور آپ ان لوگوں سے جو کتاب دیے گئے اور

ان پڑھوں سے کہہ دیں: ”کیا تم تابع ہو گئے؟“ پھر اگر وہ تابع ہو جائیں تو یقیناً ہدایت پا گئے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُولِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ اہل کتاب اور امیوں سے کہہ دو۔ ﴿2﴾ ﴿أُوتُوا

الْكِتَابَ﴾ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ ﴿3﴾ امیوں سے مراد مشرکین عرب ہیں کیونکہ ان میں پڑھے لکھے لوگ قلیل تھے۔ ﴿4﴾

﴿أَسْأَلْتُمْ﴾ ”کیا تم تابع ہو گئے؟“ کیا تم اسلام لے آئے یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کو مان لیا ہے؟ ﴿5﴾ ﴿طَبَقًا

أَسْأَلْتُمْ﴾ ”پھر اگر وہ تابع ہو جائیں تو یقیناً ہدایت پا گئے“ اگر وہ آپ کی دعوت قبول کر لیں تو وہ ہدایت کے راستے پر آ جائیں گے۔

﴿6﴾ جس طرح تم ہدایت کے راستے پر ہو ایسے ہی وہ بھی تمہارے بھائی بن جائیں گے، ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو تمہیں حاصل

ہیں اور ان کے وہی فرائض ہوں گے جو تمہارے ہیں۔ ﴿7﴾ انسان کو ہدایت اللہ تعالیٰ کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے، اپنا آپ اللہ تعالیٰ کے

حوالے کرنے سے ملتی ہے۔ اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دینے سے اور اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرنے سے انسان کو ہدایت ملتی

ہے۔

سوال 3: ﴿وَإِنْ تَوَلَّوْا فَمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ﴾ ”اور اگر وہ منہ موڑیں تو آپ کے ذمے صرف پیغام پہنچا دینا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اگر وہ منہ موڑیں تو آپ کے ذمے صرف پیغام پہنچا دینا ہے“ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر انہوں نے حق سے منہ موڑ لیا اور

اس کو پہچاننے کے بعد اس سے اعراض کیا تو ان کا معاملہ آپ کو نقصان نہیں دے گا جب کہ آپ نے انہیں حق پہنچا دیا۔ ﴿2﴾ اگر کوئی ہدایت

کے راستے پر آنے سے منہ پھیر لے تو دعوت دینے والا یقین رکھے کہ اس کا کام محض پہنچا دینا ہے۔ ﴿3﴾ ہر ایک نے حساب اپنے رب

کو دینا ہے۔

سوال 4: ﴿وَاللَّهُ بِصِدْقِكُمْ بِالْعِبَادِ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور اللہ تعالیٰ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے“ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال دیکھنے والا ہے اور ان کی نیتوں کو جاننے والا ہے۔

رکوع نمبر 11

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيْنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ

بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (21)

”یقیناً جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور لوگوں میں سے انہیں قتل کرتے ہیں جو انصاف کا حکم دیتے ہیں تو آپ انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔“ (21)

سوال 1: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِالْآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ﴾ ”یقیناً جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور لوگوں میں سے انہیں قتل کرتے ہیں جو انصاف کا حکم دیتے ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ یہاں کفر کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں جو بڑے بڑے جرائم کے مرتکب ہوئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا جو حق کا ثبوت پیش کرتی ہیں اور حق کا انکار کرنے والا ہی کفر میں مبتلا ہوتا ہے۔ ﴿2﴾ ﴿وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ ”اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں“ جو اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو قتل کرتے تھے جن کا حق اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑا ہے۔ انبیاء پر ایمان لانا، ان کی عزت کرنا، ان کی اطاعت کرنا اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے۔ ﴿3﴾ ﴿وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ﴾ ”اور لوگوں میں سے انہیں قتل کرتے ہیں جو انصاف کا حکم دیتے ہیں“ وہ ان لوگوں کو بھی قتل کرتے تھے جو انصاف کا حکم دیتے تھے یعنی جو احسان اور خیر خواہی سے اچھی بات بتاتے اور بری بات سے روکتے انہیں وہ شہید کر دیتے۔ اپنے ان جرائم کی وجہ سے وہ دردناک عذاب کے مستحق ہیں۔

سوال 2: پیغمبروں کو کیوں ناحق قتل کیا جاتا تھا؟

جواب: ﴿1﴾ پیغمبروں کو اس لیے ناحق قتل کیا جاتا تھا کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کے راستے کی طرف دعوت دیتے تھے۔ جن لوگوں پر یہ دعوت ناگوار ہوتی تھی وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے، وہ دعوت دینے والے پیغمبر سے جان چھڑانا چاہتے تھے تاکہ کوئی ان کے معاملات پر تنقید نہ کرے، کوئی انہیں اپنی زندگی کی تبدیلی کی طرف توجہ نہ دلائے۔ اس وجہ سے پیغمبر کی طرف سے مسلسل دعوت یہودیوں کے اندر دشمنی کی آگ بھڑکاتی تھی حتیٰ کہ وہ وقت آجاتا تھا جب لوگ غرور اور تکبر کی وجہ سے پیغمبر کو قتل کر دیتے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ”غرور حق کو نہ ماننا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔“ ﴿2﴾ سیدنا ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ قیامت کے دن کس شخص کی سزا سب سے زیادہ سخت ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کی سزا سب سے سخت ہوگی جس نے کسی نبی کو یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے شخص کو قتل کیا ہوگا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا: عبیدہ! ابو بنی اسرائیل نے نئے دن کے اول حصے میں اچانک حملہ کر کے تننالس (43) انبیاء کو بیک وقت قتل کر دیا تھا پھر بنی اسرائیل میں سے ایک سو بارہ عابدوزاہد میدان میں آگئے اور انہوں نے ان قاتلین کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ شروع کر دی۔ شام ہوتے ہوتے یہ تمام لوگ موت کی گھاٹ اتار دیئے گئے یہ سب کچھ ایک دن میں ہو گیا۔ (فتح القدر: 1/417)

سوال 3: یہود نے انصاف کا حکم دینے والوں کو کیوں قتل کیا؟

جواب: ﴿1﴾ یہود نے انصاف کا حکم دینے والوں کو اس لیے قتل کیا کہ وہ بھلائی کی طرف رغبت دلاتے تھے اور برائی سے نفرت دلاتے تھے اور انہیں حق ناگوار تھا۔ ﴿2﴾ یہود کو اصلاح کی کوششیں کرنے والے ناپسند تھے اس لیے انہوں نے اصلاح کرنے والوں کو قتل کیا۔ ﴿3﴾ یہودی غرور و تکبر میں مبتلا تھے انہیں سچی باتیں اور عدل و انصاف کی ترغیب ناگوار تھی اس لیے انہوں نے انبیاء اور انصاف کا حکم دینے والوں کو قتل کیا۔

سوال 4: ﴿فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ ”تو آپ انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو“ یہودیوں کو عذاب الیم کی بشارت کیوں دی گئی؟

جواب: ﴿1﴾ یہودیوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا، انبیاء کو قتل کیا، حق سے منہ پھیرا، غرور اور تکبر میں مبتلا ہوئے، لوگوں پر اپنی بڑائی جتانے لگے اور لوگوں میں سے انہیں قتل کرنے لگے جو انہیں انصاف کا حکم دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی آخرت کی رسوائی کے لیے ذلیل کرنے والے عذاب تیار کر دیے جس کی تکلیف بدنوں، دلوں اور روحوں کے لیے ہے جس کی شدت اور دکھ کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ ﴿2﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اس قوم پر زیادہ ہوگی جس نے اللہ تعالیٰ کے رسول کے ساتھ یہ معاملہ کیا اور آپ ﷺ اس وقت اپنے دانت کی طرف اشارہ فرما رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس آدمی پر بھی اللہ تعالیٰ کا غصہ زیادہ ہوگا جسے اللہ تعالیٰ کا رسول، اللہ رب العزت کے راستہ میں قتل کرے۔ (صحیح مسلم: 4648)

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ حَوَّطْتَ أَعْمَالَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَالَهُمْ مِنْ نُصْرَةٍ﴾ (22)

”یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور ان کے لئے کوئی مددگار نہیں۔“ (22)

سوال 1: ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ حَوَّطْتَ أَعْمَالَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ ”یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے“ یعنی ان کے برے اعمال کی وجہ سے ان کی نیکیاں ضائع ہو گئیں۔ ﴿2﴾ حبوط کے لغوی معانی کسی جانور کا زہریلی گھاس کھا کر پھول جانا ہیں۔ اس سے بظاہر تو جانور موٹا تازہ ہو جاتا ہے لیکن نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر کار وہ برباد اور ہلاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی زندگی میں تو کافروں کے بڑے بڑے کارنامے ہیں لیکن قیامت میں ان کے کام کچھ نہیں آئے گا دنیا میں ان کے باطل کے لیے لگائی جانے والی قوتیں اور مال سب ضائع ہو جائیں گے اور ان کا کوئی حامی و مددگار نہیں ہوگا۔ ﴿3﴾ اعمال کے ضائع ہوجانے سے مراد دنیا میں ان کا قبول نہ ہونا اور آخرت میں ان پر جزا کا نہ ملنا ہے۔

سوال 2: یہود کو ان کے اعمال کی پاداش میں کون سی وعیدیں دی گئیں؟

جواب: ﴿1﴾ ان کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے۔ ﴿2﴾ ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ ﴿3﴾ ان کے لیے دردناک، ذلیل کرنے والے عذاب تیار کر لیے گئے ہیں۔

سوال 3: ﴿وَمَا لَكُمْ مِّنْ نَّاصِرِينَ﴾ ”اور ان کے لئے کوئی مددگار نہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور ان کے لئے کوئی مددگار نہیں“ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا نہیں جو انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلا دے۔ کوئی ایسا نہیں جو ان کی سزا میں ذرہ برابر کمی کروا سکے۔ وہ ہر خیر سے محروم ہو گئے اور ہر شر اور مصیبت کے حق دار بن گئے۔ یہی حالت ان ہی جیسے دوسرے لوگوں کی ہے جو اللہ تعالیٰ پر، انبیاء پر اور نیک لوگوں پر جبری ہو جاتے ہیں۔

﴿الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ يَتَوَلَّوْنَ فَوَيْلٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ

مَعْرِضُونَ﴾ (23)

”کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا؟ انہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف بلا یا جاتا ہے تاکہ وہ ان

کے درمیان فیصلہ کرے پھر ان میں سے ایک گروہ منہ موڑ لیتا ہے، اس حال میں کہ وہ منہ موڑنے والے ہوتے ہیں۔“ (23)

سوال 1: ﴿الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ يَتَوَلَّوْنَ فَوَيْلٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مَعْرِضُونَ﴾ ”کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا؟“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی حالت بیان فرمائی ہے۔ یہاں اہل کتاب سے مراد مدینہ کے یہودی ہیں جن کی اکثریت اسلام قبول کرنے سے محروم رہی، جو رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے حتیٰ کہ ان کے ایک قبیلے کو قتل اور دوسرے کو جلاوطن کر دیا گیا۔ ﴿2﴾ ﴿الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ يَتَوَلَّوْنَ فَوَيْلٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مَعْرِضُونَ﴾ ”کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا؟“ یہودیوں اور عیسائیوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا اور مسلمانوں کو پوری کتاب دی گئی ہے کیونکہ قرآن حکیم دین کے تمام اصولوں کا مجموعہ ہے اور پچھلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ الکتاب سے مراد وہ سارا ریکارڈ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بھی زمانے، کسی بھی دور میں کسی بھی نبی پر اترا۔ کتاب بھیجنے والا یعنی اللہ تعالیٰ ایک ہے، اس کی نگہبانی ایک ہے اور حقیقتاً کتاب بھی ایک ہے۔ ﴿3﴾ کتاب کا تقاضا تھا کہ وہ سب سے زیادہ اس پر قائم رہتے، اس کے احکامات کو مانتے لیکن ان کی حالت یہ ہو گئی کہ انہیں کتاب کے فیصلے کو قبول کرنے کی طرف بلا یا جاتا ہے تو ان میں سے کچھ لوگ اپنے دلوں، اپنی روجوں اور اپنے بدنوں سے منہ پھیر لیتے ہیں اس میں مسلمانوں کے لیے تشبیہ ہے کہ یہود جیسے نہ ہو جائیں ورنہ ان جیسی سزا کے مستحق ہو جائیں گے۔

سوال 2: کیا پچھلی کتابوں کو جاننے اور ماننے والوں کے لیے قرآن کو پچھانا ممکن ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں پیغمبروں پر وحی نازل کی ہے۔ آخر میں قرآن حکیم کی صورت میں نبی ﷺ پر وحی نازل کی ہے۔ اس لیے پچھلی کتابوں کو جاننے اور ماننے والوں کے لیے قرآن حکیم کو پہچاننا ممکن ہے۔ ﴿2﴾ ہدایت ایک ہے، ہدایت بھیجنے والا ایک ہے۔ یہ یکسانیت ہے اور یکسانیت کی وجہ سے پہچاننا مشکل نہیں ہے۔

سوال 3: قرآن مجید کی دعوت اور پچھلی آسمانی کتابوں کی دعوت میں کیا فرق ہے؟

جواب: ﴿1﴾ قرآن مجید کی دعوت خالص اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ ﴿2﴾ پچھلی آسمانی کتابوں میں انسانی کلام کی آمیزش ہو گئی ہے۔ ﴿3﴾ قرآن مجید کی دعوت انسانوں کی ملاوٹ سے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پاک کر رہی ہے۔

سوال 4: قرآن مجید کی دعوت کا انکار کیوں کیا جاتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ قرآن مجید کی دعوت کو لوگ اپنے لیے سنجیدہ معاملہ نہیں سمجھتے تو خود ساختہ عقیدوں کی وجہ سے آخرت کے عذاب سے خود کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ ﴿2﴾ حق کے داعی کی طرف سے جب قرآن مجید کی دعوت دی جاتی ہے تو جو لوگ قبول نہیں کرتے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید کو قبول نہ کرنے سے ان کی کامیابی خطرے میں پڑنے والی نہیں ہے۔

سوال 5: کتاب اللہ کی دعوت کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ زندگی کے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے راہ نمائی لی جائے۔ ﴿2﴾ معاشرے اور معاش کے فیصلے اللہ تعالیٰ کی کتاب سے لیے جائیں۔ ﴿3﴾ نظریاتی اور عملی امور میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف رجوع کیا جائے۔

سوال 6: ﴿يُدْعُونَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ﴾ ”انہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”انہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے“ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو ان معاملات میں حکم بنایا جو ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تھے۔ قرآن مجید کا ان کے بارے میں فیصلہ یہ ہے کہ وہ ہدایت پر نہیں اس لیے ان سے منہ پھیر لیں۔ (تفسیر خازن: 1/235، 234)

سوال 7: ﴿ثُمَّ يَسْأَلُ قَوْمَهُمْ هَلْ مَعْرُضُونَ﴾ ”پھر ان میں سے ایک گروہ منہ موڑ لیتا ہے، اس حال میں کہ وہ منہ موڑنے والے ہوتے ہیں“ کتاب اللہ سے منہ موڑنے اور اس سے فیصلے نہ لینے کا اصل سبب کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ یہاں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی مذمت کی ہے جنہیں کتاب اللہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو وہ کئی کترا کر نکل جاتے تھے، جو یہ دعوے کرتے تھے کہ ہم تورات اور انجیل پر عمل پیرا ہیں۔ جب تورات اور انجیل کے حکم پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی کہ اس میں محمد ﷺ کی پیروی کا حکم ہے تو آؤ اللہ تعالیٰ کی کتاب پر عمل کرو اور محمد ﷺ کی اتباع کرو تو وہ پہلو بچا کر نکل جاتے ہیں۔ ﴿2﴾ کتاب اللہ سے منہ

موڑنے اور اس سے فیصلے نہ لینے کا اصل سبب آخرت کے حساب و کتاب کے بارے میں یقین نہ ہونا ہے۔ ﴿وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ مُعْرِضُونَ﴾ اور جب ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو اچانک ان میں سے ایک گروہ منہ موڑنے والا ہوتا ہے۔ (النور: 48) ﴿3﴾ جس کو اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف بلایا جائے اس کا فرض ہے کہ اس کتاب کو مانے، اسے دل سے تسلیم کرے اور اس کی اطاعت کرے۔ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ درحقیقت مؤمنوں کی بات ہی یہ ہوتی ہے جب انہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے فرماں برداری کی۔ (النور: 51)

﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ نَمَسَّنَا الثَّامِرَ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ وَعَزَّوَجْهَ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾ (24)

”یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کہا تھا گنتی کے چند دنوں کے سوا دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز نہ چھوئے گی، اور اس چیز نے ان کے دین کے بارے میں انہیں دھوکے میں ڈال دیا جو وہ گھڑا کرتے تھے۔“ (24)

سوال 1: ﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ نَمَسَّنَا الثَّامِرَ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ﴾ ”یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کہا تھا گنتی کے چند دنوں کے سوا دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز نہ چھوئے گی“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کہا تھا گنتی کے چند دنوں کے سوا دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز نہ چھوئے گی“ وہ عقیدہ جس کی وجہ سے یہودیوں نے دھوکا کھایا تھا، جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے تھے، وہ یہ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے ہیں، اس لیے ہمیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی اور اگر ہم دوزخ میں گئے تو صرف 7 دن جائیں گے۔ ان کے نظریے کے مطابق دنیا کی عمر 70,000 سال ہے اور ہر ہزار سال کے بدلے میں ہم ایک دن جہنم میں جائیں گے۔

سوال 2: ﴿وَعَزَّوَجْهَ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾ ”اور اس چیز نے ان کے دین کے بارے میں انہیں دھوکے میں ڈال دیا جو وہ گھڑا کرتے تھے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: یہودیوں کی افترا پر دازی تھی کہ ہم جہنم میں 7 دن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنی کسی کتاب میں نازل نہیں کی۔ ان کی اسی افترا پر دازی نے انہیں اپنے دین کے معاملے میں دھوکے میں مبتلا کیا۔ انہوں نے اپنی جانب سے ایک بات گھڑی کہ ہم جنت میں جائیں گے پھر اسی کو حقیقت سمجھ لیا اور گناہوں سے اجتناب نہیں کیا۔ یہ بات بہت بڑا جھوٹ ہے کیونکہ ان کا ہلاکت خیز انجام ہونے والا ہے۔ اب ان کی حالت یہ ہے کہ جب بھی انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا جاتا ہے وہ اس سے کئی کتراتے ہیں۔

سوال 3: کیا آج مسلمانوں نے بھی خود ساختہ عقیدے بنا رکھے ہیں جن کا دین سے تعلق نہیں، وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ آج مسلمانوں نے بھی خود ساختہ عقیدے بنا رکھے ہیں جن کا دین سے تعلق نہیں مفاد سے تعلق ہوتا ہے مثلاً (i) زندگی دنیا کا نام ہے اور دنیا کے ساتھ دین کا کیا تعلق؟ (ii) خاندانی زندگی میں دین کی ضرورت نہیں۔ (iii) لوگوں کی روزمرہ زندگی، معاشرتی رابطوں اور معاشی معاملات میں دین کو لانے کی ضرورت نہیں۔ ﴿2﴾ دین کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں مثلاً (i) دین پر عمل نہیں کیا جا سکتا بہت مشکل ہے۔ (ii) دین پر عمل کیا تو دنیا چھوٹ جائے گی۔ (iii) انسان نماز، روزہ، زکوٰۃ کی ادائیگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کر لے یہی کافی ہے۔ (iv) بندہ رشتہ داروں کے حقوق ادا کر لے بس یہ کافی ہے۔ (v) عورت اپنے گھر اور بچوں کا خیال رکھ لے بس یہ کافی ہے۔ (vi) عورت اپنے شوہر کو خوش کر دے تو جنت اسی کی ہے چاہے وہ نمازیں نہ پڑھے، چاہے وہ دین پر نہ چلے۔ (vii) بس انسان کا اخلاق اچھا ہونا چاہئے۔ (viii) تجارتی معاملات میں کسی کو دھوکہ نہ دے یہی کافی ہے۔ (ix) اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔ (x) اللہ تعالیٰ آخرت میں مسلمانوں کو پاک کرنے کے لیے چند دن دوزخ میں رکھ کر جنت میں داخل کر دے گا۔

﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْتُمُ لِيَوْمِ لَأَمْرٍ فِيهِ وَسُوفِيتُ كُلِّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (25)

”تو کیا حال ہوگا جب ہم انہیں اس دن کے لئے اکٹھا کریں گے جس میں کوئی شک نہیں اور ہر جان کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“ (25)

سوال 1: ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْتُمُ لِيَوْمِ لَأَمْرٍ فِيهِ﴾ ”تو کیا حال ہوگا جب ہم انہیں اس دن کے لئے اکٹھا کریں گے جس میں کوئی شک نہیں“ اس تصور کے بندہ مومن پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ ”تو کیا حال ہوگا جب ہم انہیں اس دن کے لئے اکٹھا کریں گے جس میں کوئی شک نہیں“ یہ ایک خوف ناک دھمکی ہے جسے سن کر مومن کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ دن بڑا خوف ناک ہوگا۔ وہ انصاف کا دن ہوگا، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی کا دن ہوگا، اس دن ہر ایک کو اس کی کمائی کا پورا بدلہ مل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے سوال کیا ہے جواب نہیں دیا، جواب تو خود ہی نظروں کے سامنے آ گیا ہے۔ ﴿2﴾ ﴿لِيَوْمِ لَأَمْرٍ فِيهِ﴾ ”اس دن کے لئے جس میں کوئی شک نہیں“ اس سے مراد قیامت کا دن ہے جس دن اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔

سوال 2: ﴿وَسُوفِيتُ كُلِّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ ”اور ہر جان کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ سعید ابن جبیر نے کہا: ﴿كُلِّ نَفْسٍ﴾ سے مراد نیک اور فاجر ہیں۔ ﴿مَا كَسَبَتْ﴾ سے مراد جو کچھ اچھا یا برا کام کیا۔ ﴿3﴾ قیامت کے دن کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا ہر ایک کو اپنے اعمال کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ ﴿4﴾ ﴿وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ ”اور ان پر ظلم

نہیں کیا جائے گا، ان پر ان کے اعمال کے بارے میں ظلم نہیں کیا جائے گا یعنی ان کی نیکیوں میں کمی نہیں کی جائے گی اور برائیوں میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہودیوں کے بارے میں واضح فرمایا ہے کہ ان کے اعمال ایسے ہیں جو شدید ترین عذاب کا حق دار بناتے ہیں۔ یہی حال ان لوگوں کا بھی ہوگا جو ان کے جیسے عمل کرتے ہیں۔

﴿قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ مُؤْتِي الْمُلْكِ مَن تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ وَتُعْزِزُ مَنْ تَشَاءُ وَتُزِيلُ مَنْ تَشَاءُ ۗ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۗ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿26﴾﴾

”آپ کہہ دیں اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے، تیرے ہاتھ میں ہی سب بھلائی ہے، تو ہر چیز پر یقیناً پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے۔“ (26)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟

جواب: ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے پروردگار سے دعا فرمائی کہ روم اور فارس کی بادشاہت آپ کی امت کو دے دی جائے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (جامع البیان: 3/246)

سوال 2: ﴿قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ﴾ ”آپ کہہ دو کہ اے اللہ! بادشاہی کے مالک!“ اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو دعا کا طریقہ سکھایا ہے اور تسبیح و تحمید کی تعلیم دی ہے۔ ﴿2﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آیت میں ملک سے مراد نبوت ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے جو تمام ملکوں کا مالک ہے، بادشاہ ہے۔ ﴿4﴾ مالک کا لفظ دعا کے شروع ہی میں لاکر یاد دلادیا کہ مالک نہ تصرف کا حق و اختیار اسی کو حاصل ہے جس سے دعا کی جارہی ہے۔ ﴿5﴾ یعنی اے اللہ! تو بادشاہ ہے جو تمام ملکوں کا مالک ہے۔ بادشاہ کی صفت علی الاطلاق تیرے لیے ہے اور آسمان کی اور زمین کی تمام سلطنت تیری ہی ہے اس میں تبدیلیاں لانا اور انتظام کرنا سب تیرے ہاتھ میں ہے۔ (تفسیر سعدی: 1/354)

سوال 3: اللہ تعالیٰ کے مالک الملک ہونے کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿مَلِكُ الْمُلْكِ﴾ وہ ہے جو ساری کائنات اور تمام انسانوں کا مالک ہے۔ ﴿2﴾ ﴿مَلِكُ الْمُلْكِ﴾ وہ ہے جو تمام اختیارات کا مالک ہے۔ ﴿3﴾ ﴿مَلِكُ الْمُلْكِ﴾ وہ ہے جس کی ملکیت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ ﴿4﴾ ﴿مَلِكُ الْمُلْكِ﴾ وہ ہے جو جسے چاہے بادشاہ بنا دے جسے چاہے فقیر کر دے۔ ﴿5﴾ ﴿مَلِكُ الْمُلْكِ﴾ وہ ہے جو جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلیل کر دے۔ ﴿6﴾ وہ جو کچھ چاہتا ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اس کی عطا عاریتاً ہے۔ ﴿7﴾ ﴿مَلِكُ الْمُلْكِ﴾ جب چاہتا ہے، جس سے چاہتا ہے اپنا ملک واپس لے

لیتا ہے۔

سوال 4: اللہ تعالیٰ کے مالک الملک ہونے کا یقین انسان کو کیا دیتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کے مالک الملک ہونے کے یقین سے یہ شعور ملتا ہے کہ کسی بھی چیز کا کوئی اصلی مالک نہیں کہ وہ اپنی ذاتی خواہش کے مطابق اسے استعمال کرے۔ ﴿2﴾ انسانوں کی ملکیت عارضی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطا ہے جو ان شرائط اور پابندیوں کے تحت ہے جن کے ماتحت عطا کرنے والے نے عطا کی ہے۔ ﴿3﴾ ﴿مَلِكِ الْمَلِكِ﴾ کی تعلیم اور راہ نمائی کے مطابق حکومت اور ملکیت میں تصرف ہوگا۔ ﴿4﴾ ﴿مَلِكِ الْمَلِكِ﴾ کی شرائط کے خلاف اگر حکومت اور ملکیت میں تصرف ہوگا تو وہ باطل ہوگا۔ ﴿5﴾ مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اس دنیا میں ﴿مَلِكِ الْمَلِكِ﴾ کی شرائط کے خلاف ہر تصرف کو مسترد کریں۔

سوال 5: ﴿تُوْتِي الْمَلِكُ مِنْ نَشَاءٍ وَتَتْرُكُ الْمَلِكُ وَمِنْ نَشَاءٍ﴾ ”تو جس کو چاہتا ہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے بادشاہی چھین لیتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”تو جس کو چاہتا ہے بادشاہی دیتا ہے“ یعنی بادشاہت اور تصرف کے اختیارات بھی تیرے ہاتھ میں ہیں جس کو جو چاہے عطا کر دے، مالک تو ہی ہے۔ ﴿2﴾ تو جس سے چاہتا ہے بادشاہت چھین لیتا ہے۔ حکومت کا چھین جانا اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ ﴿3﴾ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایران کے کسریٰ بادشاہوں سے اور روم کے قیصر بادشاہوں سے اور ان کے پیروکاروں سے حکومت چھین کر محمد ﷺ کو عطا فرمائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ ﴿4﴾ حکومت کامل جانا اور چھین جانا اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے کچھ دینی اور دنیوی اسباب بھی قائم کر رکھے ہیں۔ یہ اسباب اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہیں۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ نے حکومت کے حصول کے لیے جو اسباب مقرر کیے ہیں ان میں سے ایمان اور اعمال صالحہ، مسلمانوں کا باہمی اتحاد، صبر و ثبات اور باہمی تنازعات سے پرہیز وغیرہ ہیں۔ ﴿6﴾ رب العزت نے فرمایا: ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسَّخِلَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسَّخَلْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ وعدہ کیا ہے جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں ضرور بہ ضرور جاں نشین بنائے گا جیسا کہ اس نے ان سے پہلے لوگوں کو جاں نشین بنایا تھا۔ (النور: 55) ﴿7﴾ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقَيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَسَازَعُوا فَاذْفَعُوا بَأْسَ اللَّهِ وَابِئْسَ لِلشَّكَّانِ سَوَاءٌ مَلِكًا﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم مد مقابل ہو کسی گروہ کے تو ثابت قدم رہو اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑانہ کرو ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (الانفال: 45، 46) اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مومنوں کی باہمی محبت، ثابت قدمی اور اتفاق دشمنوں پر فتح کا باعث ہے۔ مسلمانوں کی حکومت کے ختم ہونے کا بڑا سبب دین سے دوری اور باہمی اختلاف ہے جس سے دشمن کو حوصلہ ملتا ہے اور وہ ان کے درمیان جدائی ڈال

دیتا ہے۔

سوال 6: ﴿وَتُوذُّ مِنْ شَأْنٍ وَمَنْ شَاءَ بِبَيْتِكَ الْحَرَامِ﴾ ”اور تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے، تیرے ہاتھ میں ہی سب بھلائی ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے تیرے ہاتھ میں ہی سب بھلائی ہے“ یعنی ﴿1﴾ عزت اور ذلت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کے حکم، فیصلوں اور ارادے میں کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہیں۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی جبر نہیں۔ ﴿4﴾ سارے معاملات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ عدل کے ساتھ عزت اور ذلت دیتا ہے۔ ﴿6﴾ اللہ تعالیٰ اپنی اطاعت کی وجہ سے عزت اور معصیت کی وجہ سے ذلت دیتا ہے۔ ﴿7﴾ اللہ تعالیٰ کی نظر میں وہ معزز ہے جو ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت سمجھے۔ جو عزت اور ذلت کو خالص اللہ تعالیٰ کی چیز سمجھے۔ ﴿8﴾ اللہ تعالیٰ کی نظر میں وہ عزت کے لائق نہیں جو ہر چیز پر اپنی ملکیت سمجھے، جو عزت کو خالص اپنا ذاتی حق سمجھے۔ ﴿9﴾ ﴿بَيْتِكَ الْحَرَامِ﴾ ”تیرے ہاتھ میں ہی سب بھلائی ہے“ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں سارے اختیارات ہیں اور اس کی نگہبانی میں سب کا بھلا ہے۔ ﴿10﴾ تمام بھلائیاں صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھلائی دینے والا نہیں۔ وہ کائنات اور انسان کی نگہبانی انصاف اور عدل کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کا دینا اور واپس لینا سب انصاف کے ساتھ ہے۔ اس کے ہاتھ میں بھلائی ہے، وہ ہر حال میں خیر ہی خیر ہے۔ وقت کے بڑے جس کو بے حقیقت سمجھیں اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کے حق میں سر بلندی کا فیصلہ کر دے۔ نصرت، غنیمت اور عزت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ علم کی مسند پر بیٹھنے والے جس کی جہالت کا فتویٰ دے دیں، اللہ تعالیٰ چاہے تو اسی کے ذریعے علم کا چشمہ جاری کر دے۔

سوال 7: ﴿إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ”تو ہر چیز پر یقیناً پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے“ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا کیسے یقین دلایا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”تو ہر چیز پر یقیناً پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے“ کوئی چیز تیرے حکم سے سر تابی نہیں کر سکتی سب کچھ تیری قدرت اور مشیت کے تحت ہے۔ صرف تیرے ہاتھ میں ہر خیر کے خزانے ہیں۔ (صفوة التفاسیر: 1/177) ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے بادشاہی دینے اور چھین لینے سے اپنے قدریر ہونے کا یقین دلایا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے عزت اور ذلت دینے سے اپنے قدریر ہونے کا یقین دلایا ہے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ نے رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنے سے اپنے قدریر ہونے کا یقین دلایا ہے۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ نے بے جان سے جان دار اور جان دار سے بے جان پیدا کرنے سے اپنے قدریر ہونے کا یقین دلایا ہے۔ ﴿6﴾ اللہ تعالیٰ نے بے حساب رزق دینے سے اپنے قدریر ہونے کا یقین دلایا ہے۔

﴿تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتُرْزُقُنِي مِنْ شَأْنٍ بَعِيرٍ﴾

حَسَابٍ (27) ﴿﴾

”تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو ہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور تو ہی مردہ کو زندہ سے

نکالتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے، بے حساب رزق دیتا ہے۔“ (27)

سوال 1: ﴿تَوَلِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتَوَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ﴾ ”تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے“ رات کو دن میں داخل کرنے اور دن کو رات میں داخل کرنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اس سے مراد موسموں کی تبدیلی ہے۔ غیر محسوس طور پر کائنات میں ہونے والی حرکت سے رات دن کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور دن رات میں پرویا جاتا ہے۔ گرمیوں میں رات کا ایک حصہ دن میں بدل جاتا ہے اور سردیوں میں دن کا ایک حصہ رات بن جاتا ہے۔ رات کی تاریکی میں دن کی روشنی داخل ہو جاتی ہے اور دن کی روشنی میں رات داخل ہو جاتی ہے۔ زمین تاریک ہے۔ وہ سورج کے سامنے اپنے مرکز کے گرد گھوم رہی ہے۔ اس طرح تاریک حصہ روشن حصے سے بدلتا رہتا ہے اور روشن حصہ تاریک سے بدلتا رہتا ہے۔ کائنات کے اندر ہونے والی یہ مسلسل حرکت بتا رہی ہے کہ اس نظام میں بلاشبہ حکیم و دانا کا ہاتھ ہے۔ یہ کائنات کی گواہی ہے۔ ﴿2﴾ ﴿تَوَلِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ﴾ ”تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے“ اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت سے موسموں میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ روشنی، دھوپ، سایہ، سکون اور انتشار پیدا ہوتا ہے رات اور دن بڑے چھوٹے ہوتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی قدرت، عظمت، حکمت اور رحمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ (تفسیر سعدی: 1/355)

سوال 2: ﴿وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُدْخِرُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ ”اور تو ہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور تو ہی مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ ”اور تو ہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے“ اللہ تعالیٰ مردہ عناصر سے زندگی کو وجود میں لاتا ہے اور زندہ چیزوں کو مردہ عناصر میں بدل دیتا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ زندگی کو موت کی طرف بڑھاتے ہیں اور موت سے زندگی کو نکالتے ہیں۔ ﴿3﴾ ایک زندہ مخلوق پر جو لمحہ بھی گزرتا ہے اس میں زندگی کے ساتھ موت بھی طاری کرتے رہتے ہیں۔ اس کی زندگی کو موت کھا لیتی ہے اور پھر سے زندگی نمودار ہوتی ہے مثلاً: (i) زندہ جسم کے اندر موت کو دیکھنا چاہیں تو ایک زندہ مخلوق کے خلیے [cells] ختم ہوتے جاتے ہیں اور ان کی جگہ جدید خلیے پیدا ہوتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔ (ii) جو cells مر جاتے ہیں وہ دوسرے period میں دوبارہ زندہ ہو جاتے ہیں اور جو زندہ ہو جاتے ہیں وہ دوسرے دور میں پھر dead ہو جاتے ہیں۔ ﴿4﴾ زندہ وجود پورے کا پورا ختم ہو جاتا ہے تو اس کے cells ذرات کی شکل اختیار کرتے ہیں اور پھر دوسرے زندہ جسم میں آتے ہیں۔ اس طرح زندگی اس جسم میں داخل ہوتی ہے۔ ﴿5﴾ انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ کوئی

مخلوق تیار کر سکتا ہے۔ ﴿6﴾ اس دعوے پر یقین نہیں کیا جاسکتا کہ موت و حیات کا یہ نظام اتفاقاً قائم ہو گیا ہے۔ ﴿7﴾ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام اشیاء مسخر ہیں۔ ان کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ متضاد اشیاء کو پیدا کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سبب مجبور کرتا ہے۔ ﴿8﴾ اللہ تعالیٰ نطفہ سے انسان اور انسان سے نطفہ پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کافر سے مومن اور مومن سے کافر پیدا کرتے ہیں۔ ﴿9﴾ ﴿وَتُخْرَجُ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ ”اور تو ہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے“ اللہ تعالیٰ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے جیسے چوزے کو انڈے سے نکالتا ہے۔ پرندے کو انڈے سے نکالتا ہے، درخت کو بیج سے نکالتا ہے اور کافر سے مومن کو نکالتا ہے۔ ﴿10﴾ ﴿وَتُخْرَجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ﴾ ”اور تو ہی مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے“ جیسے پرندے سے انڈا، درخت سے گٹھلی اور مومن سے کافر وغیرہ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

سوال 3: رات اور دن کا نظام اور موت و حیات کا نظام اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اس سے کیا سمجھنا مطلوب ہے؟

جواب: ﴿1﴾ رات اور دن کا نظام اور موت و حیات کا نظام اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے یہ سمجھنا مطلوب ہے کہ انسانی زندگی کے لیے راہ نمائی کا نظام بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ ﴿2﴾ انسان دوسرے انسانوں کو اپنا غلام نہیں بنا سکتے، اپنی فکر اور اپنے نظریے کو جبراً دوسروں پر مسلط نہیں کر سکتے۔ انسان صرف اللہ تعالیٰ کا غلام ہے۔

سوال 4: ﴿وَتَرَىٰ مِنْ شَأْنِهِمْ حِسَابٍ﴾ ”اور تو جسے چاہتا ہے، بے حساب رزق دیتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور تو جسے چاہتا ہے، بے حساب رزق دیتا ہے“ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے وسیع رزق دیتا ہے جہاں سے انسان کو گمان بھی نہیں ہوتا اور نہ اس نے کمائی کی ہوتی ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں ایک دن (سواری پر) رسول اللہ ﷺ کے پیچھے (بیٹھا ہوا) تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے لڑکے! میں تجھے چند باتیں بتلاتا ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ کے (احکام) کی حفاظت کر! اللہ تعالیٰ تیری حفاظت فرمائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ کے حقوق کا خیال رکھ، تو اس کو اپنے سامنے پائے گا۔ جب تو سوال کرے تو صرف اللہ تعالیٰ سے کر، جب تو مدد چاہے تو صرف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر اور یہ بات جان لے کہ اگر ساری امت بھی جمع ہو کر تجھے کچھ نفع پہنچانا چاہے تو وہ تجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں پہنچا سکتی جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے اور وہ اگر تجھے کچھ نقصان پہنچانے کے لئے جمع ہو جائے تو اس سے زیادہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھائے گئے اور صحیفے خشک ہو گئے۔ (جامع ترمذی: 2516) ﴿2﴾ وہ نیک اور فاجر کو بے حساب دیتا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ ہی رازق ہے اسی کا ہر چیز پر اختیار ہے۔

﴿لَا يَسْخَرُ الْمُؤْمِنُونَ الْكُفْرَيْنَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ

تُفَةً وَيَحِطُّرْكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ﴾ (28)

”ایمان والے مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں، اور جو ایسا کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز میں نہیں مگر یہ کہ تم

ان سے بچو، کسی طرح سے بچنا اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“ (28)

سوال 1: ﴿لَا يَخْذُ الْمُؤْمِنُونَ آلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ ”ایمان والے مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں“ غیر مسلموں سے دوستی پر اللہ تعالیٰ نے پابندی کیوں عائد کی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو کافروں سے دوستی لگانے سے روکا ہے کہ نہ ان سے محبت رکھیں، نہ ان کی مدد کریں، نہ مسلمانوں کے معاملات میں ان سے مدد لیں۔ ﴿2﴾ مومن سارے انسانوں کے ساتھ نیکی اور عدل کا سلوک کرنے کا پابند ہے۔ اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں۔ غیر مسلم اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے والا اس کے دشمن سے دوستی کیسے رکھ سکتا ہے؟ ﴿3﴾ جب غیر مسلموں سے دوستی مسلمانوں کے مفادات کی قیمت پر ہو تو ایسی دوستی مسلمانوں کے لیے جائز نہیں۔

سوال 2: ﴿وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَاِنَّهُ يَكْفُرُ بِاللّٰهِ وَآيٰتِهِ﴾ ”اور جو ایسا کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز میں نہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور جو ایسا کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز میں نہیں“ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ کافروں سے دوستی کرنے والے کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں۔ ﴿2﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلموں سے دوستی کرنے والا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ نہیں، وہ اللہ تعالیٰ سے کٹ گیا ہے۔ اس کا اللہ تعالیٰ کے دین میں کوئی حصہ نہیں کیونکہ کافروں سے دوستی اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے ایمان تو اللہ تعالیٰ اور اس کے دوستوں یعنی مومنوں سے تعاون کر کے اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرنے اور اس کے دشمنوں سے جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ﴿3﴾ ایسا شخص نہ اللہ تعالیٰ کے دین پر ہے، نہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا رابطہ ہے اور نہ دوستی۔ ﴿4﴾ جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی لگاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اس کے اولیاء کو فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں ایسا شخص مسلمانوں کی جماعت سے نکل جاتا ہے اور کافروں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے رب العزت نے فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْبٰهِيْمُوْا وَالنَّٰصِرِيْنَ اَوْلِيَاۡءَ ۗ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۡءُ بَعْضٍ ۗ وَمَنْ يَتَّخِذْهُمْ اَوْلِيَاۡءَ فَاِنَّهُ مِنْهُمْ﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو انہیں دوست بنائے گا تو یقیناً وہ انہی میں سے ہے۔ (المائدہ: 51)

سوال 3: ﴿اَلَا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰتًا﴾ ”مگر یہ کہ تم ان سے بچو، کسی طرح سے بچنا“ کیا کفار کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ان سے تعلقات رکھے جاسکتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ ”مگر یہ کہ تم ان سے بچو، کسی طرح سے بچنا“ بچاؤ کی تدبیر کے طور پر کسی مسلمان کو غیر مسلم گروہ سے ظاہری طور پر وقتی تعلق قائم کرنا پڑے تو کوئی حرج نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نیت کو دیکھتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا خوف موجود ہو، اسے حساب دینے کا پورا احساس ہو تو اس کی طرف سے پکڑ نہیں ہوگی۔ ﴿2﴾ وہ مسلمان جو کسی کافر حکومت میں رہتے ہیں وہ اگر حکومتی شر سے بچ سکتے ہوں تو ظاہری طور پر دوستی کا

اظہار کیا جاسکتا ہے۔ رب العزت نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ﴾ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ، تم ان کے پاس دوستی کا پیغام بھیجتے ہو حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے یقیناً انہوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ (المختہ: 1) ﴿4﴾ ﴿لَا تَجِدُوا قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ﴾ آپ ان لوگوں کو نہیں پائیں گے جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، اگرچہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے ہوں یا ان کے بھائی ہوں یا ان کا خاندان ہو۔ (المجادلہ: 22) ﴿5﴾ اگر تمہیں ان سے جان کا خطرہ ہو تو اپنی جان بچانے کے لیے زبان سے تقیہ کر سکتے ہو اور ظاہری طور پر ایسا کام کر سکتے ہو جس سے تقیہ ہو جاتا ہے۔ (تفسیر منان: 357/1) ﴿6﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ صرف زبان سے اظہار کرے لیکن عمل میں ان کا ساتھ ایسے میں بھی ہرگز نہ دے۔ (تفسیر ابن ابی حاتم: 629/2) (تفسیر ابن کثیر: 404/1) ﴿7﴾ امام بخاری نے ابو برداء کا قول نقل کیا ہے کہ ہم لوگ بعض قوموں کے سامنے مصنوعی مسکراہٹ کا اظہار کرتے تھے حالانکہ ہمارے دل ان پر لعنت بھیجتے تھے۔ (بخاری کتاب الأدب، باب: 82)

سوال 4: ﴿وَيُحَدِّثُ كُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے“ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے کہ تم اس کے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے کہ لوٹ کر تو اس کی طرف جانا ہے اس کے سوا کسی اور کی طرف نہیں جانا۔ حشر کے دن حساب و کتاب کے لیے جانا ہے۔ پھر وہ تمہارے اعمال کو شمار کرے گا اور ان کی جزا و سزا دے گا لہذا ایسے کام کرنے سے بچو جس کی وجہ سے سزا کے مستحق ہو جاؤ۔

﴿قُلْ إِنْ تُحِبُّوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْذَرُوهُ يُعَلِّمَنَّهٗ اللَّهُ ۖ وَيَعْلَمُ مَا فِي السُّبُوتِ وَمَا فِي الْأَرْحَامِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾

قَدِيرٌ (29)

”آپ کہہ دو جو تمہارے سینوں میں ہے، تم اسے چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے اور جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین

میں ہے اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے۔“ (29)

سوال 1: ﴿قُلْ إِنْ تُحِبُّوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْذَرُوهُ يُعَلِّمَنَّهٗ اللَّهُ﴾ ”آپ کہہ دو جو تمہارے سینوں میں ہے تم اسے چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی وسعت کے بارے میں واضح فرمایا ہے کہ جو تمہارے سینوں میں ہے تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ سے کسی انسان کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں خواہ اعلانیہ کی گئی ہو یا چھپ کر۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنے خوف کے ذریعے توجہ دلائی ہے کہ اس کے انتقام سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اس کے پاس علم کے ایسے ذرائع ہیں کہ اس سے بچ کر تم کہیں نہیں جاسکتے۔ ﴿4﴾ اس میں اشارہ ہے کہ دلوں کو پاک رکھنا چاہئے، ہر وقت اللہ تعالیٰ کے علم کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔ اس کے نتیجے میں بندے کو اس بات سے شرم آئے گی کہ اس کا مالک اس کے دل کو گندے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا دیکھے بلکہ وہ اپنی سوچ کو ایسے امور میں مشغول کرے گا جن سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو مثلاً قرآن مجید کی کسی آیت یا رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث پر غور و فکر کرنا یا ایسے علم کو سمجھنے کی کوشش کرنا جس میں اسے فائدہ ہو یا اللہ تعالیٰ کی مخلوق یا اس کی نعمت کے بارے میں سوچنا یا اللہ تعالیٰ کے بندوں کی بھلائی کے کسی کام کی سوچ بچار۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے علم اور قدرت کا ذکر فرماتا ہے تو اس میں ضمناً اعمال کی جزا و سزا بھی شامل ہوتی ہے جو قیامت کے دن واقع ہوگی۔ اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کی پوری جزا و سزا ملے گی۔ (تفسیر سعدی: 1/357,358)

سوال 2: ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّلْوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ ”اور جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی وسعت کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کا علم رکھتا ہے۔

سوال 3: ﴿وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے“ کی وضاحت کریں؟
جواب: اللہ تعالیٰ اپنے علم سے ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تُوَدِّعُهَا وَبَيْنَهُمْ أُمَّدًا ابْعِيدًا وَيُجْزَىٰ كُلُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾
اللَّهُ نَفْسَهُ وَاللَّهُ سَاءَ وَفِي الْعِبَادِ (30)

”جس دن ہر نفس اس کو موجود پائے گا جو اس نے نیکی کی اور جو اس نے برائی کی، اس دن آدمی تمنا کرے گا کاش! اس کے اور اس کی برائیوں کے درمیان میں بہت دور کا فاصلہ ہوتا، اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈرا رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بے حد نرمی کرنے والا ہے۔“ (30)

سوال 1: ﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ﴾ ”جس دن ہر نفس اس کو موجود پائے گا جو اس نے نیکی کی اور جو اس نے برائی کی“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا“ ”جس دن ہر نفس اس کو موجود پائے گا جو اس نے نیکی کی“ ایک دن ایسا آئے

گا جب امتحان کا پردہ ہٹ جائے گا اور انسان اپنے اعمال کے سرمائے کے سامنے کھڑا ہوگا۔ ﴿2﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی نیکیاں مکمل طور پر محفوظ ہوں گی ان میں ذرہ برابر کمی نہیں آئے گی۔ رب العزت نے فرمایا: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ (الزلزال: 7) ﴿3﴾ خیر ایک جامع لفظ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے والا ہر نیک عمل شامل ہے۔ خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ ﴿4﴾ ﴿وَمَا عَمِلْتُمْ مِنْ شَيْءٍ﴾ اور جو اس نے برائی کی، اور اس کی برائیاں بھی محفوظ ہوں گی۔ ﴿5﴾ سوء ایک جامع لفظ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والا ہر چھوٹا بڑا بر عمل شامل ہے۔

سوال 2: ﴿تَوَدُّكَ أَنْ تَبْتَاعُوا بِبَيْتِكَ أَمْ دَابَّةً﴾ اس دن آدمی تمنا کرے گا کاش! اس کے اور اس کی برائیوں کے درمیان میں بہت دور کا فاصلہ ہوتا، اس دن انسان کیوں چاہے گا کہ اس کے اور اس کی برائیوں کے درمیان دوری ہو جائے؟

جواب: ﴿1﴾ اس دن بے انتہا افسوس اور شدید غم کی وجہ سے آدمی تمنا کرے گا کاش! اس کے اور اس کی برائیوں کے درمیان میں بہت دور کا فاصلہ ہوتا۔ ﴿2﴾ وہ منظر اتنا ہولناک ہوگا کہ انسان چاہے گا کہ جو چیزیں دنیا میں اس کے لیے لذت کا سامان بنی ہوئی تھیں اس سے دور ہو جائیں۔ ﴿3﴾ اس دن آدمی تمنا کرے گا کہ کاش یہ دن نہ آتا! لیکن وہ آ گیا، انسان پکڑا گیا، اب کوئی چھٹکارا نہیں، اب کوئی جائے فرار نہیں۔ ﴿4﴾ رب العزت نے فرمایا: ﴿يَوْمَ مَن يَتُودُ الذَّنْبِينَ كَفَرُوا وَآوَا عَصَا الرَّسُولِ لَوْ تَشَاءُونَ بِهِمْ أَنْ تُرْمَضُوا﴾ جس دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی تمنا کریں گے کہ کاش! ان پر زمین برابر کر دی جائے۔ (النساء: 42) ﴿5﴾ ﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُنَّ أَقَالَ يَلَيْتُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ بَعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَيَتَمَنَّى الْفَرِيقُ﴾ یہاں تک کہ جب وہ ہمارے پاس آئے گا تو کہے گا کہ کاش میرے اور تمہارے درمیان مشرقوں کا فاصلہ ہوتا! چنانچہ بہت ہی برا وہ ساتھی ہے۔ (الزخرف: 38) ﴿6﴾ آج گناہوں کو ترک کر دینا ممکن ہے اس لیے آج انہیں چھوڑنا ہے۔

سوال 3: ﴿وَيُحَدِّثُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈرا رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے کیسے ڈرایا ہے؟
جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ اپنے عذاب سے ڈراتا ہے تاکہ لوگ اس کی نافرمانی سے بچیں ورنہ اس دن بندہ کہے گا۔ ﴿يُحَسِّرُنِي عَلَىٰ مَا قَرَأْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ﴾ ہائے افسوس اس کو تا ہی پر جو میں نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں کی۔ (الزمر: 56) ﴿2﴾ ﴿وَيَوْمَ يَعْصُ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَلَيْتَنِي أَتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا﴾ یو یکتی لیتنی لم اتخذ فلانا حلیلاً اور جس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو چبائے گا، وہ کہے گا: اے کاش کہ میں رسول کے ساتھ (ہدایت) کا کچھ راستہ اختیار کرتا! ہائے میری بربادی! کاش میں فلاں شخص کو دلی دوست نہ بناتا۔ (الفرقان: 27، 28) ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے محبت کرتے ہوئے اپنے آپ سے اور آنے والے وقت سے ڈرایا تاکہ نیک اعمال کی ترغیب ہو جس کے نتیجے میں امید اور عمل صالح حاصل ہو اور ترہیب ہو جس کے نتیجے میں خوف حاصل ہو اور گناہ چھوٹ جائیں۔

سوال 4: ﴿وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ﴾ اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بے حد نرمی کرنے والا ہے، کی وضاحت کریں؟
جواب: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو امید دلائی ہے کہ وہ اس کی رحمت سے مایوس نہ ہوں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کمال درجے کا مہربان ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی رحمت سے اپنا خوف نصیب فرمائے تاکہ وہ کام نہ کریں جس سے وہ ناراض ہوتا ہے۔

رکوع نمبر 12

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (31)﴾

”آپ کہہ دیں اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے

گا، اور اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا، بے حد رحم والا ہے۔“ (31)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ نجران کے عیسائیوں کا وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ ہم مسیح کی تعظیم اور ان کی اور ان کی ماں کی تقدیس اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کے لیے کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اس کی محبت ہے جس سے ہم محبت رکھتے ہیں اور اس کی تعظیم ہے جس کی وہ تعظیم کرتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا ہے کہ ان سے کہہ دیں: اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو جو تم توحید عبادت کی دلیل لے کر آئے ہو اس کے مطابق میری پیروی کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ بھی معاف کرے گا اور اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا، بے حد رحم والا ہے۔ (ایسر التفسیر: 170) ﴿2﴾ حسن نے کہا: عہد نبوی ﷺ میں لوگوں نے کہا: اے محمد ہم اپنے رب سے محبت کرتے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد ﷺ کی اتباع کو اپنی محبت کی اور آپ ﷺ کی مخالفت کو اپنے عذاب کی علامت بنا دیا۔ (جامع البیان: 256/3) (فتح القدر: 424/1)

سوال 2: ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ ”آپ کہہ دیں اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا“ اللہ تعالیٰ کی محبت کی کیا علامات ہیں؟

جواب: سہل بن عبد اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت قرآن مجید کی محبت ہے۔ قرآن مجید کی محبت کی علامت نبی ﷺ کی محبت ہے اور نبی ﷺ کی محبت کی علامت سنت کی محبت ہے اور سنت کی محبت کی علامت آخرت کی محبت ہے اور آخرت کی محبت کی علامت اپنے نفس کی محبت ہے اور اپنے نفس کی محبت کی علامت دنیا سے بغض ہے اور دنیا سے بغض کی علامت یہ ہے کہ اس سے بقدر ضرورت لیا جائے۔ (تفسیر قرطبی: 47/2)

سوال 3: اللہ تعالیٰ کی محبت کے کیا مطالبات ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کی محبت صرف زبانی دعویٰ نہیں ہے، اس کے ساتھ رسول ﷺ کی اتباع ضروری ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے

اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے۔ جس نے رسول اللہ ﷺ کی اتباع نہیں کی وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے والا نہیں۔ ﴿3﴾ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہر حال میں ہو، اقوال و افعال میں، ظاہر و باطن میں، عقائد و اعمال میں بھی۔ ﴿4﴾ جتنی کسی میں اتباع ہوگی اتنا ہی اس میں ایمان اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا حصہ ہوگا اور جتنی اتباع میں کمی ہوگی اتنا ہی ایمان اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں کمی ہوگی۔ ﴿5﴾ ﴿قَاتِلُوهُمْ﴾ ”تو میری پیروی کرو“ اتباع کے مفہوم میں اطاعت کی نسبت بہت زیادہ وسعت ہے۔ اطاعت صرف اوامرو نواہی میں ہوتی ہے جب کہ اتباع یہ ہے کہ جیسے تم رسول اللہ ﷺ کو کرتے دیکھو ویسے ہی تم بھی کرنے لگ جاؤ جس بات کو وہ ناپسند کریں اسے تم بھی ناپسند کرو۔ (تیسیر القرآن) ﴿6﴾ سیدنا نافع سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس چھینک ماری اور کہا: الحمد لله والسلام على رسول الله سيدنا عبد الله بن عمر رضي الله عنهما فرمایا: الحمد لله والسلام على رسول الله تو میں بھی کہتا ہوں لیکن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یوں سکھایا ہم الحمد لله على كل حال کہیں (لہذا جو سنت کا طریقہ ہے وہی اختیار کرو) (جامع ترمذی لابانی: 2200) ﴿7﴾ ﴿يُحِبُّكُمْ اللَّهُ﴾ ”اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا“ رسول اللہ ﷺ کی اتباع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ تمہاری اطاعت اور اپنے دلوں کو پاک کرنے اور تقویٰ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ ﴿8﴾ ﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ ”اور تمہارے گناہ معاف کرے گا“ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو ڈھانپ دے گا اور ان پر مواخذہ نہیں کرے گا۔

سوال 4: اللہ تعالیٰ بندے سے کیسے محبت کرتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ اس سے محبت رکھتا ہے جس نے محمد ﷺ کی اتباع کی۔ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور اس پر رحمت فرماتا ہے اور سیدھے راستے پر قائم رکھتا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو آسمان والے اور زمین والے اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو آواز دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو دوست رکھتا ہے لہذا تم بھی اس کو دوست رکھو۔ پس جبریل علیہ السلام اس کو دوست رکھنے لگتے ہیں پھر جبریل علیہ السلام تمام آسمان والوں میں اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو دوست رکھتا ہے لہذا تم بھی اس کو دوست رکھو چنانچہ اس کو تمام آسمان والے دوست رکھتے ہیں پھر زمین (والوں) میں اس کی مقبولیت رکھ دی جاتی ہے“۔ (بخاری: 1357)

سوال 5: رسول کا نمونہ ہی دنیا میں واحد مستند نمونہ کیوں ہے؟

جواب: رسول وہ شخص ہے جس کے کامل خدا پرست ہونے کی گواہی اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اس لیے خدا پرستانہ زندگی کے لیے رسول کا نمونہ ہی واحد نمونہ ہے۔

سوال 6: ﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا، بے حد رحم والا ہے“ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات غفور اور رحیم کا کیسے

یقین دلایا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے گناہوں کی معافی سے اپنی مغفرت اور رحمت کا یقین دلایا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے اتباع رسول کے نتیجے میں اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے اپنی رحمت کا یقین دلایا ہے۔

﴿قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِن تَوَكَّلْتُمْ عَلَى اللَّهِ فَلَا يَحِبُّ الْكُفْرِينَ﴾ (32)

”آپ کہہ دیں اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ موڑ جائیں تو اللہ تعالیٰ کافروں کو یقیناً پسند نہیں کرتا۔“ (32)

سوال 1: ﴿قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ﴾ ”آپ کہہ دیں اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو“ اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت میں کیا کچھ شامل ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اپنی اور رسول کی اطاعت کرنے کا حکم دیا۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت میں ایمان اور توحید شامل ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت میں ایمان کی شانیں یعنی ظاہری اور باطنی اقوال و افعال شامل ہیں۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت میں اللہ تعالیٰ کے منع کیے ہوئے کاموں سے رکنا بھی شامل ہے۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس کی کتاب کے احکامات پر عمل پیرا ہونے سے ممکن ہے۔

سوال 2: رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کیسے ممکن ہے؟

جواب: ﴿1﴾ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ان کی زندگی میں ان کے احکامات پر عمل کرنے سے اور ان کی وفات کے بعد ان کی سنت پر عمل کرنے سے اور اقوال و افعال اور احوال میں رسول اللہ ﷺ کی متابعت کرنے سے ہو سکتی ہے۔ ﴿2﴾ سیدنا عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑ سکتا جس پر رسول اللہ ﷺ عمل کیا کرتے تھے، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل میں سے کوئی چیز بھی چھوڑوں گا تو گمراہ ہو جاؤں گا۔ (متفق علیہ، اللؤلؤ والمرجان: 1150) ﴿3﴾ سیدنا نافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بانسری کی آواز سنی تو اپنی دونوں انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں اور راستے کی دوسری سمت کافی دور نکل گئے اور مجھ سے پوچھا: ”اے نافع! کیا کچھ سن رہے ہو؟ میں نے عرض کیا: ”نہیں“ تب انہوں نے اپنی انگلیاں کانوں سے نکالیں اور فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا رسول اللہ ﷺ نے بانسری کی آواز سنی اور ایسے ہی کیا (جیسے میں نے اب کیا) سیدنا نافع نے یہ بھی بتایا اس وقت میں چھوٹی عمر کا لڑکا تھا۔ (سنن ابی داؤد لیبانی: 4116) ﴿4﴾ سیدنا عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کا بھتیجا پہلو میں بیٹھا کنکریاں پھینک رہا تھا سیدنا عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے اسے منع کیا اور بتایا کہ نبی ﷺ نے اس سے منع کیا ہے نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایسا کرنے سے نہ تو شکار ہو سکتا ہے نہ دشمن کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ البتہ اس سے کسی کا دانت ٹوٹ سکتا ہے یا آنکھ پھوٹ سکتی ہے۔ بھتیجے نے

دوبارہ کنکریاں پھینکنی شروع کر دیں، تو سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ”میں نے تجھے بتایا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور تو پھر وہی کام کر رہا ہے لہذا میں اب تجھ سے کبھی بات نہیں کروں گا۔“ (سنن ابن ماجہ: 17) ﴿5﴾ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی بندیوں کو مسجد میں آنے سے نہ روکے۔“ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہما کے بیٹے نے کہا ”ہم تو روکیں گے“ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہما سخت ناراض ہوئے اور فرمایا ”میں تیرے سامنے حدیث رسول ﷺ بیان کر رہا ہوں اور تو کہتا ہے کہ ہم انھیں ضرور روکیں گے۔“ (سنن ابن ماجہ: 16)

سوال 3: ﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾ ”پھر اگر وہ منہ موڑ جائیں تو اللہ تعالیٰ کافروں کو یقیناً پسند نہیں کرتا“ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا﴾ ”پھر اگر وہ منہ موڑ جائیں“ سے مراد ایمان اور اطاعت سے منہ موڑنا ہے۔ ﴿2﴾ ﴿فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت نہ کرنے والوں کے بارے میں یہ حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو یقیناً پسند نہیں کرتا۔ (i) اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت نہ کرنے والوں کو کافر قرار دیا ہے۔ (ii) اس آیت میں منکرین حدیث اور اتباع رسول سے گریز کرنے والوں کے لئے وعید ہے کیونکہ دونوں طرح کے لوگوں کے رویے کو اللہ تعالیٰ نے کفر قرار دیا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ اطاعت نہ کرنے والوں کے فعل سے راضی نہیں ہوتا اس لیے ان کی مغفرت نہیں فرماتا۔ ﴿4﴾ طریقہ محمدی ﷺ کی مخالفت کفر ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر انہوں نے اعراض سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔ معلوم ہوا کہ طریقہ محمدی ﷺ سے اعراض کرنے والا کافر ہوتا ہے۔ (تیسیر الرحمن: 173/1) ﴿5﴾ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے کافر قرار دیا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمٰلَكُمْ﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔ (محمد: 33) ﴿6﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”میری امت کے سارے لوگ جنت میں جائیں گے سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے انکار کیا“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ کس نے انکار کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔ (صحیح بخاری: 7280) ﴿7﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔“ (صحیح مسلم: 4747) ﴿8﴾ عَنِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ. سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے ایسا عمل کیا جس پر ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ نامقبول ہے۔ (صحیح مسلم: 4493) ﴿9﴾ عَنِ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللهِ وَخَيْرُ الْهُدَى هُدَى مُحَمَّدٍ وَشَرُّ الْأُمُورِ مُحَدَّثَاتُهَا وَكُلُّ بَدْعَةٍ ضَلَالَةٌ. سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے

ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”حمد و ثنا کے بعد (یاد رکھو) بہترین بات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت محمد ﷺ کی ہدایت ہے اور بدترین کام دین میں نئی بات ایجاد کرنا ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔“ (صحیح مسلم: 2005) ﴿11﴾ سیدنا عمر باض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دین میں نئی چیزوں سے بچو اس لیے کہ ہر نئی بات گمراہی ہے۔ (سنن ابن ماجہ، لابلانی: 40) ﴿12﴾ سیدنا سہل بن سعد کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں حوض کوثر پر تمہارا پیش رو ہوں گا۔ جو وہاں آئے گا پانی پیئے گا اور جس نے ایک بار پانی پی لیا اس کو پیاس نہیں لگے گی اور بعض ایسے لوگ بھی آئیں گے جن کو میں پہچان لوں گا (اور سمجھوں گا یہ میرے امتی ہیں) اور وہ بھی مجھ کو پہچان لیں گے کہ میں ان کا رسول ہوں پھر انہیں مجھ تک آنے سے روک دیا جائے گا۔ میں کہوں گا: یہ تو میرے امتی ہیں لیکن مجھ کو بتایا جائے گا: اے محمد ﷺ آپ نہیں جانتے کہ آپ کے جانے کے بعد انہوں نے کیسی کیسی بدعتیں رائج کیں، پھر میں کہوں گا: دوری ہو، دوری ہو ایسے لوگوں کے لیے جنہوں نے میرے بعد دین بدل دیا۔ (صحیح بخاری: 6583)

﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ (33)

”یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمام جہانوں میں سے آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کے خاندان کو اور عمران کے خاندان کو منتخب فرمایا ہے۔“ (33)

سوال 1: ﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ ”یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمام جہانوں میں سے آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کے خاندان کو اور عمران کے خاندان کو منتخب فرمایا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے انتخاب کے بارے میں ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں منتخب فرمایا اس لیے سب انبیاء علیہم السلام برگزیدہ تھے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے انہیں رسالت کی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے چن لیا تھا تاکہ وہ قافلہ ایمان کے سالار رہیں۔ ﴿3﴾ رسالت ابتداء سے ایک ہی تھی۔ ﴿4﴾ جس دین کو پیش کیا گیا وہ دین بھی ایک ہی تھا۔ ﴿5﴾ یہ واضح کیا گیا کہ یہ لوگ ایک ہی سلسلے کے تھے، ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ ﴿6﴾ یہ ثابت کیا گیا کہ سب انبیاء علیہم السلام انسان تھے۔ ﴿7﴾ یہ ثابت کیا گیا کہ ان میں سے کوئی الہ نہیں تھا۔

سوال 2: آغاز میں سیدنا آدم علیہ السلام اور سیدنا نوح علیہ السلام کی ذاتی حیثیت اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا عمران علیہ السلام کے خاندانوں کا ذکر کیا گیا، اس طرح کس چیز کو سمجھانے کی کوشش کی گئی؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا آدم علیہ السلام اور سیدنا نوح علیہ السلام اپنی ذاتی حیثیت میں قابل احترام تھے۔ ﴿2﴾ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا عمران علیہ السلام کی ذاتی حیثیت کے علاوہ ان کی اولاد بھی قابل احترام تھی۔

سوال 3: سیدنا آدم علیہ السلام کی کیا فضیلت ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے بنایا۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام میں اپنی روح پھونکی۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے سیدنا آدم علیہ السلام کو سجدہ کروایا۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو اسماء کا علم عطا کیا۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت میں رہائش عطا کی۔ ﴿6﴾ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے سیدنا آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجا۔ ﴿7﴾ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کو عزت دی ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْوَجْدِ وَالْبَحْرِ وَرَأَوْهُمْ مِمَّنْ حَلَكْنَا مَنًّا بَلَا شِبْهٍ هُمْ يَلْقَوْنَ﴾ اور بلاشبہ ہم نے یقیناً اولاد آدم کو عزت دی ہے اور ہم نے انہیں خشکی اور سمندر میں سوار کیا اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا اور ہم نے جن کو پیدا کیا ان میں سے بہت سوں پر انہیں فضیلت دی، بڑی فضیلت دینا۔ (بنی اسرائیل: 70)

سوال 4: سیدنا نوح علیہ السلام کی کیا فضیلت ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدنا نوح علیہ السلام کو اس وقت رسول بنا کر بھیجا جب لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ کر بتوں کی عبادت کو اختیار کر لیا تھا۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدنا نوح علیہ السلام کو طویل عمر عطا کی۔ ﴿3﴾ سیدنا نوح علیہ السلام کو ساڑھے نو سو برس قوم کو تبلیغ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ﴿4﴾ سیدنا نوح علیہ السلام کی دعا سے اہل ایمان کو بچا لیا گیا اور کافروں کو ہلاک کر دیا گیا۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر وقت صبر، برداشت، شکر اور تبلیغ کی وہ توفیق بخشی جس کی وجہ سے وہ منتخب قرار دیے جانے کے لائق ہو گئے۔ ﴿6﴾ آپ علیہ السلام کی نسل کو قیامت تک باقی رکھا۔ ﴿7﴾ ہر زمانے میں لوگ آپ کی تعریف کرتے رہے اور کرتے رہیں گے۔ (تفسیر منان: 1/361)

سوال 5: آل ابراہیم کی کیا فضیلت ہے؟

جواب: ﴿1﴾ آل ابراہیم علیہم السلام میں خود سیدنا ابراہیم علیہ السلام بھی شامل ہیں جو خلیل الرحمن تھے۔ ﴿2﴾ آل ابراہیم علیہم السلام میں وہ تمام انبیاء شامل ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہم السلام کے بعد مبعوث ہوئے، وہ سب آپ کی نسل سے تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے ایسے فضائل سے نوازا کہ وہ سارے جہان میں برگزیدہ ہوئے۔ ﴿3﴾ آخری نبی ﷺ اور کائنات میں سب سے افضل ہستی محمد رسول اللہ ﷺ بھی ان ہی کی نسل سے تھے اور ان کی دعا کا نتیجہ تھے۔

سوال 6: آل عمران سے کون لوگ مراد ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ عمران بنی اسرائیل کے صالحین میں سے تھے۔ وہ سیدہ حنہ کے شوہر تھے اور سیدہ مریم علیہا السلام کے والد تھے۔ ﴿2﴾ آل عمران کو بلند درجہ سیدہ مریم علیہا السلام اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے عطا کیا گیا۔

سوال 7: سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا عمران علیہ السلام کی اولادیں قابل احترام اور برگزیدہ تھیں، وہ اسلام کے کس اصول کے تحت برگزیدہ تھیں؟
جواب: سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا عمران علیہ السلام کی اولادیں اپنے تعلق باللہ اور اعمال صالحہ کی وجہ سے قابل احترام اور برگزیدہ تھیں۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ برکت اور احترام جو خاندان نبوت میں آتا ہے وہ خون کی وراثت کی وجہ سے نہیں بلکہ نظریاتی وراثت کی وجہ سے آتا ہے،

عقیدے اور اعمال صالحہ کی وجہ سے آتا ہے۔

سوال 8: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا یعقوب علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ آل عمران کا ذکر کیا گیا، اس کی حکمت واضح کریں؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا یعقوب علیہ السلام تو بنی اسرائیل یعنی یہودیوں کے پیشوا تھے اور یہاں بات عیسائیوں کے بارے میں ہونے والی تھی اس لیے ان دونوں ہستیوں کے تذکرے کی ضرورت نہ تھی۔ ﴿2﴾ آل عمران کا ذکر سیدہ مریم علیہا السلام اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے قصوں کی تمہید کے طور پر کیا گیا۔

﴿ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ (34)

”وہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔“ (34)

سوال 1: ﴿ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ﴾ ”وہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں“ اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”وہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں“ اس سے مراد ہے کہ انبیاء تخلیق کے لحاظ سے بھی مشابہ تھے اور اخلاق حسنہ کے لحاظ سے بھی۔ رب العزت نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمِنْ آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ اور ان کے بعض آباؤ اجداد کو اور ان کی بعض اولادوں کو اور ان کے بعض بھائیوں کو بھی اور انہیں ہم نے چن لیا اور ہم نے انہیں سیدھا راستہ دکھلایا۔ (الانعام: 87) ﴿2﴾ انبیاء کے عقائد ایک تھے۔

سوال 2: ﴿وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے“ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات سمیع اور علیم کا کیسے یقین دلایا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام، نوح علیہ السلام، آل ابراہیم علیہم السلام اور آل عمران کے انتخاب سے اپنے ”سمیع“ اور ”علیم“ ہونے کا یقین دلایا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کی غلطی پر ان کی دعاسنی اور قبول کر لی یقیناً وہ ہر چیز کو جاننے والا اور سننے والا ہے اسی نے انہیں فضیلت عطا کی۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدنا نوح علیہ السلام کو فضیلت عطا کی اور ان کے حالات سے اپنے علیم ہونے اور ان کی بددعا پر اپنے عذاب سے اپنے ”علیم“ اور ”سمیع“ ہونے کا یقین دلایا ہے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ کی دعا سے اپنے ”علیم“ اور ”سمیع“ ہونے کا یقین دلایا ہے۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدہ مریم علیہا السلام کی عبادت گزار یوں، پاکیزگی اور صداقت پر اپنے ”علیم“ اور ”سمیع“ ہونے کا یقین دلایا ہے۔

سوال 3: اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے واقعات کیوں سنائے ہیں؟

جواب: انبیاء کے واقعات اس لیے سنائے ہیں تاکہ ہم ان سے محبت رکھیں، ان کی اتباع کریں، ان جیسے نیک اعمال کی توفیق مانگیں، ان جیسے اعمال کرنے پر خود کو حقیر سمجھیں۔

﴿إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۗ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (35)﴾

”جب عمران کی بیوی نے کہا: ”اے میرے رب! جو میرے پیٹ میں ہے، میں نے نذر مانی ہے کہ تیرے لیے چھوڑا ہوا ہوگا۔ پس

آپ مجھ سے قبول فرمائیں، یقیناً آپ سب کچھ سننے والے، سب کچھ جاننے والے ہیں۔“ (35)

سوال 1: ﴿إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي﴾ ”جب عمران کی بیوی نے کہا: ”اے میرے رب! جو میرے پیٹ میں ہے، میں نے نذر مانی ہے کہ تیرے لیے چھوڑا ہوا ہوگا۔ پس آپ مجھ سے قبول فرمائیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ عمران کی عورت سے مراد سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ حنہ ہیں۔ ﴿2﴾ سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ کا دل ایمان کے نور سے بھرپور تھا۔ ﴿3﴾ ﴿رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا﴾ ”اے میرے رب! جو میرے پیٹ میں ہے، میں نے نذر مانی ہے کہ تیرے لیے چھوڑا ہوا ہوگا“ انہوں نے اپنے عزیز ترین سرمائے کو اللہ تعالیٰ کے لیے پیش کر دیا تھا (یعنی وہ بچہ جو ان کے پیٹ میں تھا)۔ ﴿4﴾ ان کی پیش کش کے ساتھ کوئی شرط اور قید نہیں تھی۔ ﴿5﴾ اس نذر کے ساتھ انہوں نے کوئی شرکیہ تصور وابستہ نہیں کیا تھا۔ ﴿6﴾ ان کی نذر میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے حق کا تصور نہیں تھا۔ ﴿7﴾ ان کی دعاؤں میں خشوع و خضوع تھا۔ ﴿8﴾ وہ خالص اللہ تعالیٰ کی مسلم اور مطیع فرمان تھیں۔ ﴿9﴾ ان کے دل میں رضائے الہی کے جذبے کے سوا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ ﴿10﴾ ﴿مُحَرَّرًا﴾ ”چھوڑا ہوا ہوگا“ اللہ تعالیٰ کے نام پر چھوڑنے سے مراد عبادت گاہ کی خدمت کے لیے وقف کرنا ہے۔ ﴿11﴾ سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ نے نذر مانی تھی کہ میرے پیٹ کا بچہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گا اور اس کے بیت المقدس کی خدمت کرے گا۔ ﴿12﴾ ﴿فَتَقَبَّلْ مِنِّي﴾ ”پس آپ مجھ سے قبول فرمائیں“ یہ دعا سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ نے تب مانگی تھی جب سیدہ مریم علیہا السلام ان کے پیٹ میں تھیں کہ تو میری دعا سن رہا ہے میری نیت اور ارادے سے باخبر ہے مجھ سے قبول فرمالے۔

سوال 2: ﴿إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ ”یقیناً آپ سب کچھ سننے والے، سب کچھ جاننے والے ہیں“ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات

﴿السَّمِيعُ﴾ اور ﴿الْعَلِيمُ﴾ کا کیسے یقین دلایا ہے؟

جواب: ”یقیناً آپ سب کچھ سننے والے، سب کچھ جاننے والے ہیں“ اللہ تعالیٰ نے سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ کی نذر سے اپنے ﴿السَّمِيعُ﴾ اور ﴿الْعَلِيمُ﴾ ہونے کا یقین دلایا ہے۔ انہوں نے کہا: اے میرے رب میں نے آپ کے لیے نذر مانی، آپ کی رضا کے لیے

آپ کے گھر کی خدمت کے لیے میں نے اپنا بچہ آزاد کر دیا۔ آپ مجھ سے یہ مبارک عمل قبول فرمائیں۔ اس واقعہ سے سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ کے اللہ تعالیٰ کے اسمیع اور العظیم ہونے پر یقین کامل کا اظہار ہوتا ہے۔

﴿فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّى وَضَعْتُهَا اُنْثٰى ۗ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ ۗ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۗ وَاِنِّىۤ اَسْبِغُهَا مَرِيْمَ وَاِنِّىۤ

اُعِيْدُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتِكُمْ اِنَّ الشَّيْطٰنَ الرَّجِيْمَ ﴿36﴾

”پھر جب اس نے بچے کو جنم دیا تو کہا: ”اے میرے رب! میں نے تو لڑکی کو جنم دے دیا“ حالانکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا تھا جو اس نے جنم دیا ” اور لڑکا تو لڑکی جیسا نہیں ہوتا، اور بلاشبہ میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور یقیناً میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔“ (36)

سوال 1: سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ نے اللہ تعالیٰ سے یہ کیوں کہا: ﴿رَبِّ اِنِّىۤ وَضَعْتُهَا اُنْثٰى﴾ ”اے میرے رب! میں نے تو لڑکی کو جنم دے دیا“؟

جواب: ”پھر جب اس بچے کو جنم دیا تو کہا: ”اے میرے رب! میں نے تو لڑکی کو جنم دے دیا“ سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ یہ کہہ کر معذرت کر رہی ہیں کہ اگر لڑکا ہوتا تو وہ اللہ تعالیٰ کے گھر کی خدمت اچھے طریقے سے ادا کرتا۔

سوال 2: ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ﴾ ”حالانکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا تھا جو اس نے جنم دیا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ تو خوب جانتے تھے کہ اس نے کس کو جنم دیا ہے۔ اسے تو اس وقت بھی علم تھا جب ان کی والدہ کو بھی علم نہ تھا۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کیسے نہ جانتے جب کہ وہ ماہر خلاق اور عظیم ہیں۔

سوال 3: ﴿وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى﴾ ”اور لڑکا تو لڑکی جیسا نہیں ہوتا“ اس بات کی حقیقت واضح کریں کہ لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا؟

جواب: ﴿1﴾ لڑکے میں وہ فطری کمزوریاں نہیں ہوتیں جو لڑکی میں ہوتی ہیں۔ ﴿2﴾ لڑکے کے اوپر وہ تمدنی پابندیاں بھی نہیں ہوتیں جو لڑکی پر ہوتی ہیں۔ ﴿3﴾ یہ بات اس لیے کہی گئی کہ لڑکی ہونے کی صورت میں نذر کا مقصد اچھی طرح پورا نہیں ہوتا۔ ﴿4﴾ اس دور میں لڑکوں کی نذر دی جاتی تھی تاکہ وہ ہیکل کی خدمت کریں، صرف عبادت کے لیے وقف ہوں اور دنیا سے کٹ جائیں۔

سوال 4: سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ جس انداز سے بات کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، اس سے ان کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے، وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ یہ تعلق براہ راست ہے جس میں دل کی پوری بات بتائی جا رہی ہے اور بالکل واضح انداز میں بتائی جا رہی ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ

سے ہم کلامی ہے جس میں نہ تکلف ہے، نہ پیچیدگی۔ ان کی بات سے اللہ تعالیٰ کی قربت جھلک رہی ہے۔ ﴿3﴾ یہ احساس جھلک رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے، سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔

سوال 5: ﴿وَإِنِّي سَابِقَتُهُم مَّرِيَمَ﴾ ”اور بلاشبہ میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے“ سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ نے ان کا نام رکھا اس سے بچے کا نام رکھنے کے بارے میں کن امور کا پتہ چلتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ نے ان کا نام رکھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ پیدائش کے وقت بچے کا نام رکھنا جائز ہے۔ ﴿2﴾ ماں اپنے بچے کا نام رکھ سکتی ہے بشرط یہ کہ باپ کو یہ بات ناپسند نہ ہو۔ (تفسیر منان: 363/1) ﴿3﴾ حافظ ابن قیم نے پہلے، تیسرے اور ساتویں روز نام رکھنے کو درست قرار دیا ہے۔ ﴿4﴾ حافظ سیوطی نے (الاکلیل) میں لکھا ہے کہ یہ آیت دلیل ہے کہ بچے کا نام ولادت کے دن ہی رکھنا جائز ہے ساتویں دن کی ہی تعیین صحیح نہیں۔

سوال 6: سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ نے کہا: ﴿وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهُمَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾ ”اور یقیناً میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں“ اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور یقیناً میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں“ یہ بات سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ کے دل کے خلوص کو ظاہر کر رہی ہے۔ ﴿2﴾ اپنی اولاد کے لیے جو تحفظ چاہتے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے شیطان مردود سے بچائے۔ ﴿3﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اسے پیدا ہوتے ہی چھوتا ہے، جس سے وہ بچہ چلاتا ہے سوائے مریم علیہا السلام اور ان کے بیٹے (عیسیٰ علیہ السلام) کے۔ پھر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر تمہارا بیٹا چاہے تو یہ آیت پڑھ لو (وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهُمَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ) یہ کلمہ سیدہ مریم علیہا السلام کی ماں نے کہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور سیدہ مریم علیہا السلام اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو شیطان کے ہاتھ لگانے سے بچالیا۔ (صحیح بخاری: 4548)

سوال 7: سیدہ مریم علیہا السلام کی والدہ نے اپنی اولاد کے بارے میں معاشی توقعات نہیں باندھیں بلکہ نیک تمنا رکھی، اولاد کے بارے میں نیک تمنائیں کیا ہو سکتی ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ اولاد اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرگرم عمل ہو جائے۔ ﴿2﴾ اولاد شیطان کے شر سے بچے۔ ﴿3﴾ اولاد نیک لوگوں کی جماعت میں شامل ہو جائے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میری والدہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئیں اور انہوں نے مجھے اپنے آدھے دوپٹے کی چادر بنادی اور آدھے کو مجھے اوڑھا دیا اور عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ میرا بیٹا انس ہے۔ میں اسے آپ ﷺ کی خدمت کے لیے پیش کرنے آئی ہوں۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے دعا مانگیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے اللہ! اس کے مال اور اولاد میں زیادتی فرما۔“ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اللہ کی قسم! میرا مال بہت کثیر ہے اور میری اولاد کی اولاد کی تعداد آج کل ایک

سو ہے۔“ (صحیح مسلم: 6376)

سوال 8: والدین کے بچوں پر کیا اثرات ہو سکتے ہیں؟

جواب: والدین کے نیک جذبات کے اثر سے: ﴿1﴾ اولاد دنیا کی زندگی میں اپنے نفس پر قابو پانے والی ہوتی ہے۔ ﴿2﴾ وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والی ہوتی ہے۔ ﴿3﴾ وہ نیکی اور بدی میں سے نیک راستے کو اختیار کرتی ہے۔

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَلَّمَهَا كَمَا كَانَ مَلَكًا مَّخْفِيًا عَلَيْهَا كَرِيماً الْحَرَّابُ وَجَدَ عِنْدَهَا

رِزْقًا قَالَتْ لِيَرْزِئِمْنِي أَلِيَّ لَكَ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (37)﴾

”سو اس کے رب نے اسے اچھی قبولیت کے ساتھ قبول فرمایا اور اس کی بہترین پرورش کی اور زکریا کو اس کا سرپرست بنایا۔ زکریا جب کبھی اس کے پاس عبادت خانے میں آتے اس کے پاس رزق پاتے، وہ پوچھتے مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ کہتیں یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔“ (37)

سوال 1: ﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾ ”سو اس کے رب نے اسے اچھی قبولیت کے ساتھ قبول فرمایا اور اس کی بہترین پرورش کی“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ﴾ ”سو اس کے رب نے اسے اچھی قبولیت کے ساتھ قبول فرمایا“ اللہ تعالیٰ نے سیدہ مریم علیہا السلام کو نذر کے طور پر قبول فرمایا اور انہیں اور ان کی اولاد کو شیطان سے محفوظ فرمایا۔ ﴿2﴾ ﴿وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾ ”اور اس کی بہترین پرورش کی“ اللہ تعالیٰ نے سیدہ مریم علیہا السلام کی پرورش اچھے طریقے سے کی۔ ان کی ماں کے دل میں جو اخلاص تھا اور اللہ تعالیٰ کا ہو کر رہنے کا جو جذبہ تھا یہ اس کا صلہ تھا۔ ﴿3﴾ سیدہ مریم علیہا السلام کو نفع روح کے لیے، کلمۃ اللہ کی والدہ بننے کے لیے تیار کرنا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی خوب تربیت کی اور عمدہ طریقے سے پرورش کی۔ ﴿4﴾ صحیحین میں سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہو سنا: ”دنیا کی سب سے بہتر عورت مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد تھیں۔“ (صحیح بخاری: 3432)

سوال 2: ﴿وَكَلَّمَهَا كَمَا كَانَ مَلَكًا مَّخْفِيًا﴾ ”اور زکریا کو اس کا سرپرست بنایا“ سیدنا زکریا علیہ السلام نے سیدہ مریم علیہا السلام کے کفیل کیسے بنے، وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سیدنا زکریا علیہ السلام کو سرپرست بنا دیا گیا۔ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا کہ آل ہارون میں سے سیدنا زکریا علیہ السلام کو سیدنا مریم علیہا السلام کی نشوونما اور تربیت کے لیے منتخب کیا جائے۔ ﴿2﴾ سیدنا زکریا علیہ السلام کی کفالت کی وجہ سے سیدنا مریم علیہا السلام کی جسمانی اور اخلاقی تربیت بہت اچھی ہوئی۔

سوال 3: ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَ هَارِزَاتِهَا﴾ ”زکر یا جب کبھی اس کے پاس عبادت خانے میں آتے اس کے پاس رزق پاتے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: سیدہ مریم علیہا السلام کی کفالت سیدنا زکریا علیہ السلام نے کی تھی۔ وہ جب کبھی آپ علیہا السلام کے پاس محراب میں یعنی ان کی عبادت گاہ میں داخل ہوتے تو ان کے پاس جنت کے پھل پاتے۔ گرمیوں کے پھل سردیوں میں اور سردیوں کے پھل گرمیوں میں ہوتے۔

سوال 4: ﴿قَالَ لَيْسَ لِي مِنَ الْمَوْلَاةِ هَذَا فَقَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ ”وہ پوچھتے مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ کہتیں یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے“ یہ الفاظ کیا وضاحت کرتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ ”وہ پوچھتے مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ کہتیں یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے“ یہ الفاظ ان کے اپنے رب سے تعلق کی وضاحت کرتے ہیں۔ ﴿2﴾ سیدہ مریم علیہا السلام کے اندر رزق کی فراہمی کے غیر معمولی سلسلے کی وجہ سے کوئی غور نہ تھا۔ ﴿3﴾ سیدہ مریم علیہا السلام میں تواضع اور کس نفسی جھلک رہی ہے۔ ﴿4﴾ سیدہ مریم علیہا السلام نے واضح کیا کہ اس میں ان کی محنت و مشقت شامل نہیں بلکہ یہ رزق انہیں اللہ تعالیٰ نے کرامت کے طور پر عطا فرمایا۔

سوال 5: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَرُؤُكُم مِّنْ فَتْحِ حِسَابٍ﴾ ”یقیناً اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے سیدہ مریم علیہا السلام کے رزق سے سیدنا زکریا علیہ السلام کی حیرت پر اپنے بے حساب رزق کا یقین دلایا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔ اس نے فرمایا: ﴿وَمَنْ يَشَقِ اللَّهُ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دیتا ہے اور اس کو وہاں سے رزق دے گا جہاں اس کا گمان بھی نہ گیا ہوگا۔ (الطلاق: 2،3)

﴿هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ (38)﴾

”وہیں زکریا نے اپنے رب کو پکارا، اس نے کہا: ”اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما بلاشبہ تو ہی دعا کا خوب سننے والا ہے۔“ (38)

سوال 1: ﴿هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ﴾ ”وہیں زکریا نے اپنے رب کو پکارا“ سیدنا زکریا علیہ السلام نے اولاد کی دعا کی، یہ تمنا ان کے دل کے اندر کیسے پیدا ہوئی؟

جواب: ”وہیں زکریا نے اپنے رب کو پکارا“ سیدنا زکریا علیہ السلام نے اولاد کی دعا کی۔ اولاد کی تمنا ایک فطری خواہش ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کی

تخلیق اس فطری تمنا پر کی ہے کہ اس کے بعد کوئی اس کا جانشین ہو۔ سیدہ مریم علیہا السلام جیسی صالحہ لڑکی اور ان کے پاس غیر معمولی رزق کی کرامت دیکھ کر ان کے دل کے اندر امید پیدا ہوئی۔

سوال 2: ﴿قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ﴾ ”اس نے کہا: ”اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما بلاشبہ تو ہی دعا کا خوب سننے والا ہے“ سیدنا زکریا علیہ السلام نے اولاد کے لیے دعائیں کیا خصوصی درخواست کی؟
جواب: ﴿1﴾ ”اس نے کہا: ”اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما“، یعنی خوش اخلاق اور خوش اطوار یعنی دینی اور دنیاوی نعمتوں کی تکمیل ہو جائے۔ ﴿2﴾ سیدنا زکریا علیہ السلام کے دل میں اولاد کے لئے دعا کرنے کا خیال بے موسم کے پھلوں کو دیکھ کر آیا کہ اللہ تعالیٰ انہیں بوڑھا اور ان کی بیوی کو بانجھ ہونے کے باوجود اولاد عطا کر دے گا۔ ﴿3﴾ ”بلاشبہ تو ہی دعا کا خوب سننے والا ہے“ اللہ تعالیٰ سمیع الدعاء ہے یعنی دعاؤں کا سننے والا ہے۔ یہ یقین انسان کے اندر توکل کی صفت پیدا کرتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سہارے کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے اور سیدھے راستے پر چلنے لگتا ہے۔

﴿مَّا دَأْتُهَا الْمَلَائِكَةُ وَهِيَ فَاطِمَةٌ لِيُؤْتِيَهُنَّ مِثْقَالَ حَبِّ خَلْدٍ مِنْ ذُرِّيَّتِكُمْ إِنَّ اللَّهَ يُبْشِرُكِ بِمِثْقَالِ الذَّرَّةِ الْوَاحِدَةِ وَأَنْتَ حَسْبُ الْوَالِدِ﴾

﴿مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ (39)

”چنانچہ فرشتوں نے اس کو آواز دی جب کہ وہ عبادت خانے میں کھڑے نماز ادا کر رہے تھے: ”بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ایک کلمے (عیسیٰ) کی تصدیق کرنے والا اور سردار اور اپنے اوپر بہت ضبط رکھنے والا ہوگا اور نیک لوگوں میں سے نبی ہوگا۔“ (39)

سوال 1: ﴿مَّا دَأْتُهَا الْمَلَائِكَةُ وَهِيَ فَاطِمَةٌ لِيُؤْتِيَهُنَّ مِثْقَالَ حَبِّ خَلْدٍ مِنْ ذُرِّيَّتِكُمْ إِنَّ اللَّهَ يُبْشِرُكِ بِمِثْقَالِ الذَّرَّةِ الْوَاحِدَةِ وَأَنْتَ حَسْبُ الْوَالِدِ﴾ ”چنانچہ فرشتوں نے اس کو آواز دی جب کہ وہ عبادت خانے میں کھڑے نماز ادا کر رہے تھے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”چنانچہ فرشتوں نے اس کو آواز دی جب کہ وہ عبادت خانے میں کھڑے نماز ادا کر رہے تھے“ اور اپنے رب کی عبادت اور مناجات میں مشغول تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی۔

سوال 2: ﴿مَّا دَأْتُهَا الْمَلَائِكَةُ وَهِيَ فَاطِمَةٌ لِيُؤْتِيَهُنَّ مِثْقَالَ حَبِّ خَلْدٍ مِنْ ذُرِّيَّتِكُمْ إِنَّ اللَّهَ يُبْشِرُكِ بِمِثْقَالِ الذَّرَّةِ الْوَاحِدَةِ وَأَنْتَ حَسْبُ الْوَالِدِ﴾ ”بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ایک کلمے (عیسیٰ) کی تصدیق کرنے والا اور سردار اور اپنے اوپر بہت ضبط رکھنے والا ہوگا اور نیک لوگوں میں سے نبی ہوگا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے“ اللہ تعالیٰ نے یحییٰ کی خوش خبری دی، بچے کا نام خود یحییٰ رکھا اور بتایا کہ

پہلے آج تک کسی انسان کا یہ نام نہیں رکھا۔ (تیسیر القرآن: 262/1) ﴿2﴾ سیدنا یحییٰ نام اس لیے تجویز ہوا کہ اللہ تعالیٰ ایمان کے ساتھ زندگی دے گا۔ ﴿3﴾ ﴿مُصَدِّقًا﴾ سے مراد سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق ہے۔ ﴿4﴾ ﴿اللَّهُ تَعَالَىٰ كَيْفَ كُنِيَ﴾ اس سے مراد سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ﴿5﴾ ﴿وَسَيِّدًا﴾ ”اور سردار“ سے مراد بنی اسرائیل کا سردار ہوگا۔ قوم کی خراب حالت کی اصلاح کرے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ایسی صفات عطا فرمائے گا کہ آپ سردار بنیں گے، قوم کی راہ نمائی کریں گے، لوگ اپنے معاملات میں آپ سے راہ نمائی لیں گے۔ ﴿6﴾ ﴿وَحُصُونًا﴾ ”اور اپنے اوپر بہت ضبط رکھنے والا“ سے مراد نہ ان کی عورتوں کی طرف رغبت ہوگی نہ گناہ کے کاموں کی طرف رغبت ہوگی۔ نکاح نہ کرنا سیدنا یحییٰ علیہ السلام کی خصوصیت تھی۔ رب کی خدمت اور اطاعت میں مشغول رہنے کی وجہ سے بے رغبتی تھی۔ ﴿7﴾ ”اور نیک لوگوں میں سے نبی ہوگا“ سے مراد ہے کہ وہ نبی ہوگا اور پاک باز لوگوں میں سے ہوگا۔ ﴿8﴾ سیدنا یحییٰ علیہ السلام کے کردار پر جو روشنی قرآن نے ڈالی ہے، اس سے یہ نقشہ سامنے آتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنے والا ہوگا۔ سرداری و بزرگی کی شان والا ہوگا، اپنی جنسی خواہشات پر پوری قدرت رکھنے والا ہوگا، نبوت سے سرفراز ہوگا، ان کا شمار صالحین میں ہوگا۔

﴿قَالَ رَبِّ اَلَيْسَ لِي عِلْمٌ وَّ قَدْ بَلَّغْتَنِي الْكِبَرَ وَاَمْرًا نِي عَاقِرٌ قَالَ كَذَلِكِ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (40)﴾

”ذکر یانے کہا: ”اے میرے رب! میرے ہاں بیٹا کیسے ہوگا حالانکہ یقیناً مجھ تک بڑھاپا آپہنچا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے؟“ (اللہ

تعالیٰ نے) فرمایا: ”اسی طرح اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔“ (40)

سوال 1: ﴿قَالَ رَبِّ اَلَيْسَ لِي عِلْمٌ وَّ قَدْ بَلَّغْتَنِي الْكِبَرَ وَاَمْرًا نِي عَاقِرٌ﴾ ”ذکر یانے کہا: ”اے میرے رب! میرے ہاں بیٹا کیسے

ہوگا حالانکہ یقیناً مجھ تک بڑھاپا آپہنچا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے؟“ سیدنا ذکر یانے نے یہ کیوں کہا تھا؟

جواب: ”اے میرے رب! میرے ہاں بیٹا کیسے ہوگا حالانکہ یقیناً مجھ تک بڑھاپا آپہنچا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے؟“ سیدنا ذکر یانے نے یہ

اس لیے کہا تھا کیونکہ انہیں ایسا بیٹا ملنے کی خوش خبری دی گئی جو کامل صفات والا اور نبی ہوگا۔ سیدنا ذکر یانے انتہائی خوشی کی حالت میں

پکارا اٹھے۔ ”اے میرے رب! میرے ہاں بیٹا کیسے ہوگا حالانکہ یقیناً مجھ تک بڑھاپا آپہنچا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے؟“

سوال 2: ﴿قَالَ كَذَلِكِ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ﴾ ”فرمایا: ”اسی طرح اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے“ اس سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اسی طرح اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے“ اس سے مراد ہے کہ سیدنا ذکر یانے کے بڑھاپے اور ان کی بیوی کے بانجھ پن کے

باوجود اللہ تعالیٰ بیٹا عطا کرے گا۔ ﴿2﴾ جو رب اسباب کے ساتھ اولاد دیتا ہے وہ بغیر اسباب کے اولاد دے تو اس کے لیے مشکل

نہیں۔ ارشاد فرمایا: ﴿وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا﴾ اور یقیناً میں نے اس سے پہلے تجھے پیدا کیا حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ (مریم: 9)

﴿3﴾ سیدنا ذکر یانے کے یہاں اولاد ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ بے قید ہے، وہ ظاہری اسباب کے بغیر بھی اپنا کام کر سکتا

ہے، بڑھاپا اور بانجھ پن اس کے ارادے میں حائل نہیں ہو سکتے۔

﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۚ قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا ذُرِّيَّتَكَ وَإِذْ كُنْتَ مِنْكُمْ لَمَّا خَلَّيْتَهُ ۚ وَاجْعَلْ لِي آيَةً ۚ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۚ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۚ﴾

﴿الْإِنْجَارِ﴾ (41)

”زکریا نے کہا: ”اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی بتادیں“، (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: آپ کے لیے نشانی یہ ہے کہ تین دن تک

لوگوں سے کچھ اشاروں کے سوا باتیں نہ کر سکو گے اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح بیان کرو۔“ (41)

سوال 1: ﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً﴾ ”زکریا نے کہا: ”اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی بتادیں“ سیدنا زکریا علیہ السلام نے نشانی کیوں مانگی؟

جواب: ﴿1﴾ ”اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی بتادیں“ سیدنا زکریا علیہ السلام نے نشانی اس لیے مانگی کہ ان کے ہاں ولادت ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جب یہ غیر معمولی واقعہ پیش آئے تو مجھے پیشگی اطلاع ہو جائے۔ ﴿2﴾ اولاد کی خوش خبری سن کر سیدنا زکریا علیہ السلام کے شوق میں اضافہ ہوا جس کی وجہ سے انہوں نے نشانی طلب کی۔

سوال 2: ﴿قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا ذُرِّيَّتَكَ﴾ ”(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: ”آپ کے لیے نشانی یہ ہے کہ تین دن تک لوگوں سے کچھ اشاروں کے سوا باتیں نہ کر سکو گے“ بچے کی ولادت میں کیا نشانی مقرر کی گئی؟

جواب: ﴿1﴾ ”آپ کے لیے نشانی یہ ہے کہ تین دن تک لوگوں سے کچھ اشاروں کے سوا باتیں نہ کر سکو گے“ بچے کی ولادت کے لیے یہ نشانی مقرر کی گئی کہ تین دن کے لیے زبان بندی ہو جائے گی۔ ﴿2﴾ لوگوں کی طرف متوجہ ہوں گے مگر کچھ اشاروں کے سوا باتیں نہ کر سکیں گے۔ ﴿3﴾ صرف رب کی طرف متوجہ ہوں، اس کا ذکر کریں اور اس کی تسبیح کریں۔ ﴿4﴾ زبان بندی کی نشانی میں بڑی حکمت تھی اس طرح روزمرہ کے معمولات سے باہر لا کر اپنی کامل قدرت کا یقین دلایا گیا۔ ﴿5﴾ زبان بندی کی نشانی سے یہ یقین دلایا گیا کہ جس طرح اسباب موجودہ ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ ان کو کام کرنے سے روک سکتا ہے اسی طرح اسباب کے بغیر پیدا کر سکتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ تمام اسباب اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کے تحت ہیں۔ (تفسیر منان: 1/365)

سوال 3: ﴿وَإِذْ كُنْتَ مِنْكُمْ لَمَّا خَلَّيْتَهُ ۚ وَاجْعَلْ لِي آيَةً ۚ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۚ﴾ ”اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح بیان کرو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے شکرگزاری کے لئے سیدنا زکریا علیہ السلام کو حکم دیا کہ خاموشی میں کثرت سے صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرو تاکہ اللہ تعالیٰ مزید نعمتوں سے نوازے اور مزید شکر ادا کرنے کے قابل ہو جاوے۔

سوال 4: اس واقعے کو یہاں بیان کرنے کا اصل مقصد کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اصل مقصد عیسائیوں کے عقیدے کی غلطی واضح کرنا تھا۔ ﴿2﴾ سیدنا یحییٰ علیہ السلام کا ذکر اس لیے فرمایا کہ وہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے چھ ماہ پہلے معجزانہ طریقے سے پیدا ہوئے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اگر سیدنا یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش معجزے سے ہو چکی اور انہیں الہ نہیں بنایا گیا تو سیدنا مسیح علیہ السلام اپنی غیر معمولی پیدائش پر الہ کیسے ہو گئے؟

رکوع نمبر 13

﴿وَأَذَاتُ الْمَلَائِكَةِ لِزَيْمٍ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ طَهَّرَكَ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَىٰ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ﴾ (42)

”اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! یقیناً اللہ تعالیٰ نے آپ کو برگزیدہ بنایا ہے اور آپ کو پاک کیا ہے اور سب جہانوں کی عورتوں

پر آپ کو منتخب کیا ہے۔“ (42)

سوال: ﴿وَأَذَاتُ الْمَلَائِكَةِ لِزَيْمٍ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ طَهَّرَكَ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَىٰ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ﴾ ”اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! یقیناً اللہ تعالیٰ نے آپ کو برگزیدہ بنایا ہے اور آپ کو پاک کیا ہے اور سب جہانوں کی عورتوں پر آپ کو منتخب کیا ہے“ اللہ تعالیٰ نے سیدہ مریم علیہا السلام کو کیسے چن لیا تھا؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَأَذَاتُ الْمَلَائِكَةِ لِزَيْمٍ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ﴾ ”اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! یقیناً اللہ تعالیٰ نے آپ کو برگزیدہ بنایا ہے“ اس (برگزیدگی) کا تعلق مریم علیہا السلام کے بچپن سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تو شروع ہی سے آپ علیہا السلام کو بزرگی دے رکھی ہے، آپ علیہا السلام کی والدہ کی دعاؤں کو سن کر آپ علیہا السلام کو خلعت و جود بخشا گیا۔ ﴿2﴾ ہیکل کی خدمت کا کام لڑکوں اور مردوں کے لئے مخصوص تھا، آپ کو لڑکی ہونے کے باوجود اس کا موقع عنایت کیا گیا۔ ﴿3﴾ آپ علیہا السلام کو آپ کے حجرہ میں غذائیں جس اعجازی رنگ میں پہنچائی گئیں اس نے اللہ تعالیٰ کے نبی زکریا علیہ السلام تک کو متحیر کر دیا، یہ سب شواہد آپ کی برگزیدگی ہی کے تو ہیں۔ (تفسیر ماجدی: 569/1) ﴿4﴾ ”اور جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! یقیناً اللہ تعالیٰ نے آپ کو برگزیدہ بنایا ہے“ اللہ تعالیٰ براہ راست ان کے اندر اپنی ایک روح ڈالنے والے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام میں روح ڈالی تھی۔ ﴿5﴾ ﴿وَطَهَّرَكِ﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدہ مریم علیہا السلام کو حیض، نفاس، مردوں کے چھونے اور برے اخلاق سے پاک کیا۔ (تفسیر زمیز: 242/2) ﴿6﴾ سیدہ مریم علیہا السلام کو اللہ تعالیٰ نے گناہوں اور ایسی خرابیوں سے پاک کیا جو ان کی شان میں کمی کا باعث بن سکتی تھیں۔ ﴿7﴾ ﴿وَاصْطَفَىٰ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ﴾ ”اور سب جہانوں کی عورتوں پر آپ کو منتخب کیا ہے“ جہان سے مراد ساری عورتوں پر فضیلت ہے۔ ﴿8﴾ چند خواتین یعنی سیدہ خدیجہ بنت النخعہ، سیدہ عائشہ بنت النخعہ اور سیدہ فاطمہ بنت النخعہ کا اس فضیلت میں شریک ہونا سیدہ مریم علیہا السلام کے اصطفاء کے منافی نہیں۔ ﴿9﴾ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے

فرمایا: ”عورتوں پر عائشہ کی فضیلت ایسی ہے جیسے تمام کھانوں پر شریذ کی۔ مردوں میں سے تو بہت کامل ہو گزرے ہیں لیکن عورتوں میں مریم بنت عمران علیہا السلام اور فرعون کی بیوی آسیہ کے سوا اور کوئی کامل پیدا نہیں ہوئی۔“ (مسلم: 2431)

﴿يَرْزِمُ أَهْنِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَامْرَأُ كَيْ مَعَ الرَّكْعَيْنِ (43)﴾

”اے مریم! اپنے رب کی اطاعت کرو، سجدے کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔“ (43)

سوال 1: ﴿يَرْزِمُ أَهْنِي لِرَبِّكِ﴾ ”اے مریم! اپنے رب کی اطاعت کرو“ قنوت سے کیا مراد ہے؟
جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اے مریم اپنے رب کی اطاعت کرو۔ ﴿2﴾ قنوت سے مراد خشوع و خضوع کے ساتھ اطاعت پر مسلسل قائم رہنا ہے۔

سوال 2: ﴿وَاسْجُدِي وَامْرَأُ كَيْ مَعَ الرَّكْعَيْنِ﴾ ”اور سجدے کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو“ سیدہ مریم علیہا السلام کو عبادت کا حکم دیا گیا تو خاص طور پر رکوع اور سجدے کا ذکر کیا گیا، اس کی حکمت واضح کریں؟
جواب: ﴿1﴾ ”اور سجدے کرو“ سیدہ مریم علیہا السلام کو عبادت کا حکم دیا گیا تو خاص طور پر رکوع اور سجدے کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ عبادت میں رکوع اور سجدے کا مقام دوسری تمام عبادتوں سے افضل ہے۔ ﴿2﴾ رکوع اور سجدے سے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کا اظہار ہوتا ہے۔ ﴿3﴾ ”اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو“ اس سے مراد ہے بیت المقدس میں باجماعت نماز کے لیے حاضری دو۔ (ایسر التفاسیر: 173) ﴿4﴾ سیدہ مریم علیہا السلام کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا تھا کہ خشوع و خضوع کے ساتھ اطاعت پر مسلسل قائم رہیں۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ کے آگے سر بسجود رہیں۔ ﴿6﴾ اللہ تعالیٰ کے آگے جھکنے والوں کے ساتھ جھکیں۔ ﴿7﴾ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت میں مصروف رہیں۔ ﴿8﴾ ایسی زندگی بسر کریں جو اللہ تعالیٰ سے جڑی ہوئی ہو۔

﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ ۗ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اذِ يُنْفِقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اِيْهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۗ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اذِ

يَخْتَصِمُوْنَ (44)﴾

”یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں ورنہ آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے

کہ ان میں سے کون مریم کی سرپرستی کرے گا اور نہ ہی آپ اس وقت ان کے پاس تھے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔“ (44)

سوال 1: ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ﴾ ”یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں“ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو سیدہ مریم علیہا السلام کے بارے

”جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی طرف سے ایک کلمے کی خوش خبری دیتا ہے، اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم

ہوگا، وہ دنیا و آخرت میں بہت مرتبے والا اور مقرب بندوں میں سے ہوگا۔“ (45)

سوال 1: اللہ تعالیٰ کے فضل کو قبول کرنے کے لیے سیدہ مریم علیہا السلام کیسے تیار ہوئیں؟

جواب: سیدہ مریم علیہا السلام کی پاکیزگی، یک سوئی، مسلسل عبادت گزاری یہ تین خصوصیات ایسی تھیں جن کی بناء پر وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو قبول کرنے کے لیے اور ولادت مسیح کے لیے تیار ہو سکیں۔ سیدہ مریم علیہا السلام کو فرشتوں نے اطلاع دی کہ ان کے ہاں بچے کی پیدائش ہوگی۔

سوال 2: ﴿إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ لَیْمُومٌ إِنَّ اللّٰهَ یُبْزِرُکَ بِکَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾ ”جب فرشتوں نے کہا: ”اے مریم! یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی طرف سے ایک کلمے کی خوش خبری دیتا ہے“ اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”جب فرشتوں نے کہا: ”اے مریم! یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی طرف سے ایک کلمے کی خوش خبری دیتا ہے“ اس سے مراد سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی خوش خبری ہے جو اللہ تعالیٰ کے خصوصی فرمان کے ذریعے پیدا ہوئے۔ ﴿2﴾ آپ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا کلمہ اس لیے کہا گیا کہ آپ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ اور خصوصی فرمان کے ذریعے پیدا ہوئے تھے اور آپ علیہ السلام کے حالات اسباب سے خارج تھے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو نشانی اور عجیب مخلوق بنایا۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا جبریل علیہ السلام کو سیدہ مریم علیہا السلام کے پاس بھیجا۔ انہوں نے آپ کی قمیص کے گریبان میں پھونک ماری۔ مقدس فرشتے کی یہ مقدس پھونک سیدہ مریم علیہا السلام کے جسم میں داخل ہو گئی جس سے وہ پاک روح پیدا ہو گئی۔ اس وجہ سے آپ علیہ السلام روحانی فطرت رکھتے تھے جو روحانی مادے سے پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی روح کہا گیا۔ (تفسیر منان: 1/368,369)

سوال 3: ﴿اِسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيسٰی ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا يَّوْنٰنًا وَاٰلِ اٰخِرَةً وَاوَمِنَ النَّفٰثٰتِ﴾ ”اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا وہ دنیا و آخرت میں بہت مرتبے والا ہوگا اور مقرب بندوں میں سے ہوگا“ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کیوں کہا گیا؟

جواب: ﴿1﴾ ”اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا“ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کہا گیا کیونکہ انہوں پر ہاتھ پھیر کر انہیں شفا یاب کرتے تھے۔ ﴿2﴾ ”وہ دنیا و آخرت میں بہت مرتبے والا ہوگا“ اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو بن باپ کے پیدا کیا۔ وہ انسانوں کے ظرف کو جانتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ کس طرح ایک معجزے کا یہودی انکار کریں گے اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی بن باپ کی پیدائش کی وجہ سے کس طرح طعنے برداشت کرنے پڑیں گے اس لئے پیدائش سے پہلے ہی ان کے بارے میں واضح کر دیا کہ دنیا میں بھی معزز ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت کا مقام پائیں گے یعنی مقربین میں سے ہوں گے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اولوالعزم پیغمبروں میں شامل کیا جو بڑی شریعتوں کے حامل تھے۔ ان کے پیروکاروں کی کثیر تعداد تھی جو مشرق و مغرب میں پھیل گئی۔ ﴿4﴾ ”اور مقرب بندوں میں سے ہوگا“ مقرب لوگوں میں سے ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت والے ہوں گے، دوسرے انبیاء اور رسولوں کی طرح

آپ بھی شفاعت کریں گے، جس سے آپ کا بلند مقام جہان والوں کے سامنے ثابت ہو جائے گا۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں میں سے ہیں، اپنے رب سے انتہائی قریب ہیں بلکہ آپ مقربین کے سرداروں میں سے ہیں۔ (تفسیر منان: 1/369)

﴿وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ﴾ (46)

”اور وہ گود میں بھی اور ادھیڑ عمر میں بھی لوگوں سے باتیں کرے گا اور وہ نیک لوگوں میں سے ہوگا۔“ (46)

سوال: ﴿وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ﴾ ”اور وہ گود میں بھی اور ادھیڑ عمر میں بھی لوگوں سے باتیں کرے گا اور وہ نیک لوگوں میں سے ہوگا“ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیات کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے مسیح کا نام عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام بتایا، وہ دنیا و آخرت میں بہت مرتبے والا ہوگا، اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گود میں بات کرے گا، ادھیڑ عمر میں بھی لوگوں سے کلام کرے گا، نیک لوگوں میں سے ہوگا۔ ﴿2﴾ ﴿وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ﴾ ”اور وہ گود میں بھی لوگوں سے باتیں کرے گا“ وہ کلام عام کلام سے مختلف تھا۔ انہوں نے ایسی بات کی جس میں بھلائی اور کامیابی تھی۔ ﴿3﴾ وہ کلام اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانی تھی جس سے مومنوں کو فائدہ ہوا، اور دشمنوں پر جحمت قائم ہوئی اور یہ ثابت ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں۔ ﴿4﴾ وہ کلام ان کی والدہ کے لیے بھی نعمت بنا کیونکہ اس کے ذریعے ان کی والدہ پر لگنے والے الزام کی تردید ہو گئی۔

﴿فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾ قَالَ رَبِّي عَبْدُ اللَّهِ الْأَشْفَى الْكَلْبُ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۖ وَجَعَلَنِي مُلَبَّزًا أَلِيمًا مَا كُنْتُ وَ أَوْصِنِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَمَا دُمْتُ حَيًّا ۖ وَبَرًّا بِوَالِدَاتِي ۖ وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا﴾ تو مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا: ”ہم اس سے کیسے بات کریں جو گود میں ایک بچہ ہے؟“ بچے نے کہا: ”یقیناً میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا۔ اور اس نے مجھے برکت والا بنایا ہے جہاں بھی میں ہوں۔ اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک کہ میں زندہ رہوں۔ اور اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا بنایا۔ اور اس نے مجھے سرکش، بد بخت نہیں بنایا۔ (مریم: 32-29)﴾ ﴿5﴾ ﴿فِي الْمَهْدِ﴾ ”گود میں“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”گود میں تین بچوں کے سوا کسی نے بات نہیں کی۔ ان میں سے ایک عیسیٰ ابن مریم ہیں، دوسرا بنی اسرائیل کا وہ بچہ جسے جرجہ سے منسوب کیا گیا اور بچے نے جرجہ کی بریت کی اور بول کر اپنے اصلی باپ کا نام بتا دیا۔ تیسرے وہ بچہ جس نے ماں کی چھاتی چھوڑ کر کہا تھا: یا اللہ! مجھے اس ظالم سوار کی طرح نہ کرنا۔ (تیسیر القرآن: 1/265)﴾ ﴿6﴾ ﴿وَ كَهْلًا﴾ ”اور ادھیڑ عمر میں بھی“ جوانی اور بڑھاپے کے درمیان کی عمر ادھیڑ عمر کہلاتی ہے۔ ادھیڑ عمر میں کلام سے مراد ہے کہ جب بڑے ہو کر وحی اور رسالت عطا کئے جائیں گے تو کلام کریں گے۔ ﴿7﴾ اس سے یہ بھی مراد لی گئی ہے کہ جب قرب قیامت کے دور میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تب وہ اسلام کی تبلیغ کریں گے۔ یہی ادھیڑ عمر میں کلام سے مراد ہے۔ ﴿8﴾ ﴿وَمِنَ الصَّالِحِينَ﴾ ”اور وہ نیک لوگوں میں سے ہوگا“ نیک لوگوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق ادا کرتے ہیں، اس میں کمی نہیں کرتے۔

﴿ قَالَتْ رَبِّ اَنْىٰ يَكُوْنُ لىٰ وَاكِدٌ لِّمَ يَسْئَلُنىٰ بَشَرٌ لِّمَا كُنْتُ لَمِيْمًا ۗ وَكَذٰلِكَ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۗ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يُقُوْلُ لَهٗ كُنْ ۗ ﴾

﴿ فَيَكُوْنُ (47) ﴾

”مریم نے کہا: ”اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا حالانکہ کسی بشر نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا؟“ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: اسی

طرح اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو یقیناً وہ اس سے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔“ (47)

سوال 1: ﴿ قَالَتْ رَبِّ اَنْىٰ يَكُوْنُ لىٰ وَاكِدٌ لِّمَ يَسْئَلُنىٰ بَشَرٌ ﴾ ”مریم نے کہا: ”اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا حالانکہ کسی بشر نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا؟“ سیدہ مریم علیہا السلام نے یہ بات کیوں کہی؟

جواب: ﴿1﴾ ”مریم نے کہا: ”اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا حالانکہ کسی بشر نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا؟“ سیدہ مریم علیہا السلام نے دوسرے انسانوں کی طرح روزمرہ زندگی میں سلسلہ اسباب کے عادی ہو جانے کی وجہ سے یہ کہہ دیا کہ ایسا کیسے ممکن ہے۔ حالانکہ وہ جانتی تھیں لیکن یہ بات ان کے لئے معمہ بن گئی جس کے حل کے لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کا عام قانون یہی ہے کہ مرد سے تعلق کیے بغیر اولاد نہیں ہوتی۔ یہ بات مریم نے تعجب کے طور پر فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر شک کرتے ہوئے نہیں فرمائی۔ (تفسیر منان: 369/1)

سوال 2: ﴿ قَالَتْ رَبِّ اَنْىٰ يَكُوْنُ لىٰ وَاكِدٌ لِّمَ يَسْئَلُنىٰ بَشَرٌ ﴾ ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اسی طرح اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اسی طرح اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے“ اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ یہ معجزہ ہے، اسے پیدا کرنے والا وہ ہے جو کسی بھی کام کو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ ﴿2﴾ ان الفاظ سے سیدہ مریم علیہا السلام کو جواب دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ تو جو چاہے پیدا کر سکتا ہے اور سیدہ مریم علیہا السلام کے دل کو ڈھارس بندھائی گئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اس کا انتخاب ہے، آپ کو اس پر مطمئن رہنا چاہیے۔

سوال 3: ﴿ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يُقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ ”جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو یقیناً وہ اس سے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے“ اس سے کس چیز کی طرف توجہ دلائی گئی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو یقیناً وہ اس سے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے“ اس سے کائنات کی ابتدا کی طرف توجہ دلائی گئی کہ جس طرح کائنات ﴿كُنْ﴾ ”ہو جا“ سے وجود میں آگئی تھی تو کیا کوئی انسان اس طرح وجود میں نہیں آسکتا؟ ﴿2﴾ ﴿كُنْ﴾ سے اس طرف توجہ دلائی گئی کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا حکم دیں تو وہ ہو جاتا ہے خواہ کسی ظاہری سبب سے ہو یا بے سبب۔ ﴿3﴾

سے میں پیدائشی اندھے کو اور کوڑھی کو ٹھیک کرتا ہوں اور مردوں کو بھی زندہ کرتا ہوں اور میں تمہیں خبر دیتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو بلاشبہ اس میں یقیناً تمہارے لئے نشانی ہے اگر تم ایمان والے ہو۔“ (49)

سوال 1: ﴿وَمَا سُوِّلَ إِلَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ﴾ ”اور وہ بنی اسرائیل کی جانب رسول ہوگا“ اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیا، وہ کیسی قوم تھی؟

جواب: ”اور وہ بنی اسرائیل کی جانب رسول ہوگا“ اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی جانب بھیجا جو اپنے زمانے کی افضل ترین قوم تھی۔

سوال 2: ﴿إِنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ ”میں یقیناً تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لایا ہوں“ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی کن نشانیوں (معجزات) کا تذکرہ ان آیات میں ملتا ہے؟

جواب: سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں: ﴿1﴾ مٹی سے پرندے کی صورت کا مجسمہ بنا کر پھونک مارنا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کا پرندہ بن جانا۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دینا۔ ﴿3﴾ مردے کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ کرنا۔ ﴿4﴾ لوگ جو کھا کر آتے تھے اور جو ذخیرہ کر کے رکھتے تھے وہ انہیں بتا دیتے تھے۔

سوال 3: ﴿إِنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُبْرِئُ الْكَلْبَةَ وَالْأَبْرَصَ وَأُنزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً يَدْرُسُ بِهِ الْعُجْبَ وَالشَّجَرُ يَسْجُدُ لِلرَّبِّ﴾ ”کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی صورت جیسی چیز بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نشانیاں بنتے ہیں اور وہ ہر معجزے میں اپنے رب کی قدرت کو پالیتے ہیں۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اس لیے معجزات عطا فرمائے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ واقعی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ ﴿3﴾ ﴿بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ ”اللہ تعالیٰ کے حکم سے“ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر یہ معجزات ظاہر نہ ہوتے۔ ﴿4﴾ اس لیے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے عقیدے کی بھی نفی ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے تھے۔

جواب: ”کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی صورت جیسی چیز بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے میں پیدائشی اندھے کو اور کوڑھی کو ٹھیک کرتا ہوں اور مردوں کو بھی زندہ کرتا ہوں“ ﴿1﴾ ایمان لانے والوں کے لیے معجزات اللہ تعالیٰ کی نشانیاں بنتے ہیں اور وہ ہر معجزے میں اپنے رب کی قدرت کو پالیتے ہیں۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اس لیے معجزات عطا فرمائے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ واقعی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ ﴿3﴾ ﴿بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ ”اللہ تعالیٰ کے حکم سے“ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر یہ معجزات ظاہر نہ ہوتے۔ ﴿4﴾ اس لیے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے عقیدے کی بھی نفی ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے تھے۔

سوال 4: ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّكُمْ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ ”بلاشبہ اس میں یقیناً تمہارے لئے نشانی ہے اگر تم ایمان والے ہو“ کی

وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانی تھی کہ بے جان مٹی زندہ جانور بن جائے، ایسے ہی بیمار تندرست ہوئے، مردے زندہ ہوئے اور غیبی امور کی خبریں دی گئیں۔ ﴿2﴾ اگر ایک نشانی بھی ہوتی تو بڑا معجزہ ہوتا۔ یہ نشانیاں یقین اور ایمان کے لیے تھیں۔

﴿وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَلَا جُلُكُم مِّنَ الَّذِينَ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجَنَّاتِكُمْ بَايِعْتُمْ مِّنْ رَّسُولِكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَأَطِيعُوا (50)﴾

”اور تصدیق کرنے والا ہوں اس کے لیے جو مجھ سے پہلے تورات میں سے ہے اور تاکہ میں بعض وہ چیزیں تمہارے لئے حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں، اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں چنانچہ اللہ تعالیٰ سے ڈرجاؤ اور میری اطاعت کرو۔“ (50)

سوال 1: ﴿وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ﴾ ”اور تصدیق کرنے والا ہوں اس کے لیے جو مجھ سے پہلے تورات میں سے ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ میں ویسی ہی تعلیمات لے کر آیا ہوں جیسی سیدنا موسیٰ علیہ السلام لائے تھے اور جو تورات میں موجود تھیں۔ ﴿2﴾ دین برحق اس وقت تورات میں پورا موجود تھا۔ اس میں پوری شریعت موجود تھی۔ ﴿3﴾ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اپنی رسالت میں تورات پر اعتماد فرماتے تھے۔

سوال 2: ﴿وَلَا جُلُكُم مِّنَ الَّذِينَ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ﴾ ”اور تاکہ میں بعض وہ چیزیں تمہارے لئے حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور تاکہ میں بعض وہ چیزیں تمہارے لئے حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں“ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے بتایا کہ انجیل کی شریعت میں آسانی اور نرمی ہے۔ ﴿2﴾ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے تورات میں سے بعض حرام چیزیں جو سزا کے طور پر حرام کی گئی تھیں، ان کو حلال کر دیا۔ ﴿3﴾ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انجیل نے تورات کے اکثر احکام منسوخ نہیں کیے بلکہ ان کی تکمیل کی ہے اور انہیں برقرار رکھا ہے۔

سوال 3: ﴿وَجَنَّاتِكُمْ بَايِعْتُمْ مِّنْ رَّسُولِكُمْ﴾ ”اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں“ اس سے مراد سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں۔ ﴿2﴾ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے معجزات کا ذکر اس لیے کیا کہ میں سچا ہوں اور میری پیروی واجب ہے۔

سوال 4: ﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَأَطِيعُوا﴾ ”چنانچہ اللہ تعالیٰ سے ڈرجاؤ اور میری اطاعت کرو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”چنانچہ اللہ تعالیٰ سے ڈرجاؤ اور میری اطاعت کرو“ اللہ تعالیٰ سے ڈرجاؤ، اس کے احکامات پر عمل کرو، اس کے منع کیے ہوئے

کاموں سے رک جاؤ۔ ﴿2﴾ میری اطاعت کرو کیونکہ رسول کی اطاعت اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ سَمِيٌّ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ (51)﴾

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، چنانچہ اسی کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔“ (51)

سوال 1: ﴿إِنَّ اللَّهَ سَمِيٌّ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ﴾ ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، چنانچہ اسی کی عبادت کرو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، چنانچہ اسی کی عبادت کرو“ اللہ تعالیٰ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے توحید الوہیت کی دعوت دی ہے کہ جس طرح ہم یہ مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارا رب ہے، فاعبدوہ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو یعنی جس طرح اس کو رب، خالق، رازق مانتے ہو اسی طرح صرف اسی کو معبود مانو، اسی سے محبت رکھو، اسی سے امید باندھو، اسی پر اعتماد کرو، اسی سے دعائیں کرو۔

سوال 2: سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت ﴿فَاعْبُدُوهُ﴾ سے عیسائیوں کی کیسے تردید ہوتی ہے؟

جواب: عیسائی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے ہیں۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے خود اقرار کیا کہ وہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ جیسا کہ رب العزت نے فرمایا: ﴿قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۖ آتَيْنِي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا﴾ بچے نے کہا: یقیناً میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے۔ (مریم: 30)

سوال 3: ﴿هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ﴾ ”یہی سیدھا راستہ ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: یہ سیدھا راستہ ہے یعنی توحید کا، اللہ تعالیٰ کی عبادت کا، رسول اللہ کی فرماں برداری کا۔ یہی راستہ جنت تک پہنچاتا ہے۔

﴿فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ۗ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ ۗ آمَنَّا بِاللَّهِ وَأَشْهَدُ بِآثَارِهَا

مُسْلِمُونَ (52)﴾

”پھر جب عیسیٰ نے ان سے کفر محسوس کیا تو کہا: ”کون اللہ تعالیٰ کی طرف میرا مددگار ہے؟“ حواریوں نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ کے مددگار

ہیں، ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہیں اور آپ گواہ ہو جائیں کہ یقیناً ہم فرماں بردار ہیں۔“ (52)

سوال 1: ﴿فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ﴾ ”پھر جب عیسیٰ نے ان سے کفر محسوس کیا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ﴾ ”پھر جب عیسیٰ نے ان سے کفر محسوس کیا“، یعنی جب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے یہ جان لیا کہ یہودی ان کی اطاعت کرنے کے لیے تیار نہیں۔

سوال 2: بنی اسرائیل کے بڑوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے سے انکار کیوں کیا؟

جواب: ﴿1﴾ بڑوں کے ہاتھ میں ہر قسم کے وسائل ہوتے ہیں۔ ﴿2﴾ جو لوگ مذہب کی گدیوں پر قابض ہوتے ہیں عوام کی نظر میں وہی مذہب کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ﴿3﴾ مذہب کے نمائندے جس کو رد کر دیں عوام بھی اس کو رد کر دیتے ہیں۔ ﴿4﴾ جو لوگ حق کی زندگی کا لیبل لگا کر لوگوں کے درمیان عزت کا مقام حاصل کر چکے ہیں وہ صرف خود انکار نہیں کرتے بلکہ دعوت دینے والے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

سوال 3: حق کی دعوت دینے والے کے خلاف محاذ آرائی کیسے ہوتی ہے؟

جواب: حق کی دعوت دینے والے کے خلاف اس طرح محاذ آرائی ہوتی ہے کہ ﴿1﴾ طرح طرح کے شوشے نکال کر عوام کو بھڑکایا جاتا ہے۔ ﴿2﴾ اس پر وسائل حیات تنگ کئے جاتے ہیں۔ ﴿3﴾ لوگ ایسے فرد کو بے دین قرار دے دیتے ہیں۔ ﴿4﴾ آخر کار طاقت کے ذریعے اس کو مٹا دینے کا منصوبہ بناتے ہیں۔

سوال 4: حق کے داعی کی مخالفت ہوتی ہے لیکن اس کا پیغام جاری رہتا ہے، اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کی مدد داعی کے ساتھ ہوتی ہے اس لیے کوئی مخالفت اس کی آواز کو دبانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ ﴿2﴾ داعی مخالفتوں کے باوجود اپنا مشن جاری رکھتا ہے۔

سوال 5: جو لوگ حق کی دعوت کی مخالفت کریں وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں کیسے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کی نظر میں حق کی دعوت کے مخالف اور انکار کرنے والے مفسد ہیں۔ ﴿2﴾ حق کے مخالف انسانوں کو داعی کی طرف جانے سے نہیں جنت کی طرف جانے سے روکتے ہیں اور اس سے بڑا کوئی فساد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کی جنت کی طرف جانے سے روکا جائے۔

سوال 6: ﴿قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ﴾ ”کہا: ”کون اللہ تعالیٰ کی طرف میرا مددگار ہے“ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے دین کی نشر و اشاعت اور اس کے قیام کے لیے عام اپیل کس طرح کی؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ﴾ کون ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں میرا مددگار۔ ﴿2﴾ کون ہے جو دین کی دعوت اور اس کی نصرت کے لیے میرے ساتھ تعاون کرے گا۔ ﴿3﴾ کون ہے جو انسانوں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے سلسلے میں میرا مددگار ہوتا ہے تاکہ میں اپنے فرائض اچھی طرح ادا کر سکوں۔

سوال 7: دعوت دین کے لیے مددگاروں کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟

جواب: حق کی طرف بلانے والے کو ساتھیوں کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ ﴿1﴾ اسے حمایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ﴿2﴾ اسے ساتھ

کی ضرورت ہوتی ہے۔ ﴿3﴾ ایسے افراد جو دعوت کا علم اٹھا کر چلتے رہیں۔ ﴿4﴾ ایسے افراد جو دعوت کو مسلسل پھیلاتے رہیں۔ ﴿5﴾ رسول اللہ ﷺ موسم حج میں لوگوں کو اپنا ساتھی اور مددگار بننے کے لئے مدد طلب کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی آواز پر انصار نے لبیک کہا۔ ﴿6﴾ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہل خاندان سے تعاون طلب کیا۔ اے حاضرین! میں تم سب کے لیے دنیا اور آخرت کی بہبود لے کر آیا ہوں اور میں نہیں جانتا کہ عرب بھر میں کوئی شخص بھی اپنی قوم کے لیے اس سے بہتر اور افضل کوئی شے لایا ہو، مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں آپ لوگوں کو اس کی دعوت دوں۔ بتاؤ تم میں سے کون میرا ساتھ دے گا؟ یہ سن کے سب کے سب چپ ہو گئے، سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر کہا: یا رسول اللہ (ﷺ)! میں حاضر ہوں، نبی ﷺ نے ابوطالب سے کہا: تم اس کی بات مانا کرو اور جو کہا کرے سنا کرو۔ یہ فقرہ سن کر مجمع خوب کھل کھلا کر ہنسا اور ابوطالب سے تمسخر کرنے لگا۔ دیکھو! محمد ﷺ نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ آج سے تم اپنے فرزند کا حکم مانا کرو۔ (رحمۃ للعالمین: 80) ﴿7﴾ عقبہ ثانیہ میں نبی ﷺ نے تعاون طلب کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اللہ تعالیٰ کا کلام پڑھ کر سنایا جس کے سننے سے وہ ایمان اور ایقان کے نور سے بھر پور ہو گئے۔ اب سب لوگوں نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ کا نبی ﷺ ہمارے شہر میں چل کر بسے تاکہ ہمیں پورا پورا فیض حاصل ہو سکے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: (i) کیا تم دین حق کی اشاعت میں میری پوری پوری مدد کرو گے؟ (ii) جب میں تمہارے شہر میں جا بسوں کیا تم میری اور میرے ساتھیوں کی حمایت اپنے اہل و عیال کی مانند کرو گے؟ ایمان والوں نے پوچھا: ایسا کرنے کا ہم کو معاوضہ کیا ملے گا؟ نبی ﷺ نے فرمایا: بہشت (جو نجات اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا محل ہے)۔ ایمان والوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ تو ہماری تسلی فرمادیتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ہم کو کبھی چھوڑ نہ دیں گے؟ نبی ﷺ نے فرمایا: ”نہیں! میرا جینا، میرا مرنا تمہارے ساتھ ہوگا۔“ اس آخری فقرے کا سننا تھا کہ عاشقان صداقت عجب سرور و نشاط کے ساتھ جاں نثاری کی بیعت اسلام کرنے لگے۔ براء بن معرور رضی اللہ عنہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس شب سب سے پہلے بیعت کی تھی۔ (رحمۃ للعالمین: 119)

سوال 8: ﴿قَالَ الْحَوَارِيُّونَ كَيْفَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ﴾ ”حواریوں نے کہا ”ہم اللہ تعالیٰ کے مددگار ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿قَالَ الْحَوَارِيُّونَ﴾ ”حواریوں نے کہا“ حواری کا مفہوم وہی ہے جو انصار کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے نبی اور دین کے مددگار۔ ﴿2﴾ ﴿نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ﴾ ”ہم اللہ تعالیٰ کے مددگار ہیں“ حواریوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو جواب دیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دین کے مددگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسی کام کو اللہ تعالیٰ کی مدد کہا جاسکتا ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کیا جائے۔

سوال 9: اللہ تعالیٰ کی مدد کیسے کی جاتی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کے رسول کی مدد کر کے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کے دین کو لے کر جو لوگ اٹھیں اور وہ سچے دین کی طرف بلانے والے ہوں تو ان کی مدد کر کے۔ ﴿3﴾ اسلام کے پیغام کو انسانوں تک پہنچا کر۔ ﴿4﴾ لوگوں کو دین سکھا کر۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے وقت، صلاحیت، مال، قوتیں اور رابطے لگا کر اللہ تعالیٰ کی مدد کی جاتی ہے۔

سوال 10: ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدُوْاۤ اَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ ”ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آپ گواہ ہو جائیں کہ یقیناً ہم فرماں بردار ہیں“ حواریوں نے اللہ تعالیٰ کی مدد پر اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہرایا، حکمت بتائیں؟

جواب: ﴿1﴾ حواریوں نے کہا ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ ﴿وَاشْهَدُوْاۤ اَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ اور آپ گواہ ہو جائیں کہ یقیناً ہم فرماں برداروں میں سے ہیں۔ ﴿2﴾ دین کی دعوت دینے والے کا معاملہ کسی انسان سے نہیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے۔ دین کی دعوت دے کر تو اجر اللہ تعالیٰ کی ذات سے لینا ہے۔ اس لیے حواریوں نے اللہ تعالیٰ کی مدد پر اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہرایا۔ ﴿3﴾ دعوت دینے والے یہ گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا دین حق ہے اور یہ کہ اس دین میں انسانوں کے لیے بھلائی ہے۔ ﴿4﴾ دعوت دینے والے اللہ تعالیٰ کے گواہ ہیں اور یہ گواہی وہی دے سکتا ہے جو اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کے دین کا نمونہ بنائے جس کی وجہ سے گواہی ممکن ہو جائے۔

﴿رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اُنزِلْتَ وَاَتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰہِدِیْنَ﴾ (53)

”اے ہمارے رب! جو آپ نے نازل کیا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے رسول کی پیروی کی ہے چنانچہ ہمیں بھی گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لیجئے۔“ (53)

سوال 1: ﴿رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اُنزِلْتَ وَاَتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ﴾ ”اے ہمارے رب! جو آپ نے نازل کیا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے رسول کی پیروی کی ہے“ حواریوں نے انصار اللہ بننے کے لیے اپنی کن صفات کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ ہمیں گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لیجئے؟

جواب: ﴿1﴾ حواریوں نے کہا: ﴿رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اُنزِلْتَ﴾ ”اے ہمارے رب ہم اس پر ایمان لے آئے جو آپ نے نازل کیا“ حواریوں نے انصار اللہ بننے کے لیے سب سے پہلے اپنے ایمان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھا کہ ہم اس پر ایمان لے آئے جو آپ نے نازل کیا۔ ﴿2﴾ حواریوں نے کہا: ﴿وَاَتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ﴾ ”اور ہم نے رسول کی پیروی کی ہے“ حواریوں نے انصار اللہ بننے کے لیے رسول کی اتباع کو اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھا کہ ہم کسی خود ساختہ طریقے پر عمل پیرا نہیں رسول کے طریقے کے پیروکار ہیں۔ ﴿3﴾ حواریوں نے کہا: ہم آپ کی توحید، رسالت اور وحی پر ایمان لانے والے ہیں اس لیے ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔

سوال 2: ﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰہِدِیْنَ﴾ ”چنانچہ ہمیں بھی گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لیجئے؟“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ چنانچہ ہمیں بھی گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لیجئے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ لکھ لیجئے جو لا الہ الا اللہ کی گواہی دیتے ہیں۔ ﴿2﴾ اس گواہی سے مراد اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار، انبیاء کی تصدیق اور اس کے مطابق عمل اور جو عبادت ان پر واجب ہے اس کو ادا کرتے ہیں۔ جب وہ دین کی نصرت کے لیے اور شریعت کو قائم کرنے کے لیے عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہو گئے تو بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان

لايا اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا۔ ان دونوں میں جنگ ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی مدد کی اور مشرکوں کو شکست ہوئی اور اہل توحید کا میاب ہو گئے۔ (تفسیر سعدی: 1/372، 373)

﴿وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرٌ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ (54)

”اور انہوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں میں سے بہتر ہے۔“ (54)

سوال: ﴿وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرٌ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ ”اور انہوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں میں سے بہتر ہے“ یہودیوں کا مکر کیا تھا؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَمَكَرُوا﴾ ”اور انہوں نے خفیہ تدبیر کی“ یہودی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھانا چاہتے تھے جس کے لیے انہوں نے ان پر الزام لگائے۔ ﴿2﴾ یہودی اللہ تعالیٰ کے نبی کو شہید کر دینا چاہتے تھے۔ ﴿3﴾ ﴿وَمَكَرَ اللَّهُ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ نے بھی خفیہ تدبیر کی“ اللہ تعالیٰ کا مکر (تدبیر) یہ تھی کہ اس نے یہودیوں کو ان کے منصوبوں پر سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ﴿4﴾ ﴿وَاللَّهُ خَيْرٌ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں میں سے بہتر ہے“ اللہ تعالیٰ بہترین تدبیر کرنے والا ہے وہ اپنے اولیاء کی حفاظت فرماتا ہے اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کرتا ہے۔

رکوع نمبر 14

﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ إِنِّي فَتَوَقَّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَىٰ مَطَهَّرُكَ مِنَ الْذَنبِ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الذُّنُوبِ أَفْوَكُ مِنَ الذُّنُوبِ﴾

﴿كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَمْ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأَخْلَمَ بَيْنَكُمْ فِيمَا لَكُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾ (55)

”جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ! یقیناً میں تجھے قبض کرنے والا ہوں اور تجھے اپنی جانب اٹھانے والا ہوں اور ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا تجھے پاک کرنے والا ہوں اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی انہیں قیامت کے دن تک ان لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں جنہوں نے کفر کیا۔ پھر میری طرف تم سب کی واپسی ہے، سو میں تمہارے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔“ (55)

سوال 1: ﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ إِنِّي فَتَوَقَّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَىٰ مَطَهَّرُكَ مِنَ الْذَنبِ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الذُّنُوبِ أَفْوَكُ مِنَ الذُّنُوبِ﴾ ”جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ! یقیناً میں تجھے قبض کرنے والا ہوں“ مُتَوَقَّيْ کے کیا معنی ہیں؟

جواب: مُتَوَقَّيْ سے مراد ہے کہ میں پورا پورا لینے والا ہوں یعنی یہودیوں کی سازش سے بچا کر آسمانوں پر اٹھانے والا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو آسمانوں پر اپنی طرف اٹھایا اور کسی اور شخص پر ان کی مشابہت ڈال دی۔ جس شخص کو ان کا ہم شکل بنایا گیا تھا اسے

پکڑ کر صلیب پر چڑھایا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ اس طرح اپنے خیال میں انہوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو شہید کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ حالانکہ انہوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ اسے سولی دی بلکہ اس کی شبیہ بنا دی گئی۔ (النساء: 157)

سوال 2: اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو واپس کیوں بلا لیا؟

جواب: ﴿1﴾ بنی اسرائیل نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول نہ کی۔ ﴿2﴾ انہوں نے سیدنا یحییٰ علیہ السلام کا سر ایک رقاصہ کی فرمائش پر کاٹ ڈالا۔ ﴿3﴾ بنی اسرائیل کے علماء اور فقہاء نے سازش کر کے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو رومی سلطنت سے سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔ ﴿4﴾ بنی اسرائیل کو مزید سمجھانا اور ان پر وقت لگانا بے فائدہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو واپس بلا لیا۔

سوال 3: سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے کتاب بھی برقرار رکھی اور شریعت بھی پھر یہودیوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیوں کیا تھا، فرق کس چیز میں آیا تھا؟

جواب: سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے کتاب بھی برقرار رکھی اور شریعت بھی، یہودیوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا انکار اس لیے کیا تھا کہ ان کا عقیدہ آخرت خراب ہو گیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم جو جی چاہے کریں ہماری پکڑ نہیں ہونے والی۔

سوال 4: سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے واپس بلانے کا تذکرہ اس مقام پر کس لیے کیا گیا؟

جواب: سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے واپس بلانے کا تذکرہ اس مقام پر عیسائیوں کے اس عقیدے کی تردید کے لیے کیا گیا کہ ”سیدنا عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں“ کیوں کہ وہ معجزانہ طور پر پیدا ہوئے۔ ان کے معجزات ایسے تھے کہ وہ انسان نہیں ہو سکتے اور یہ کہ انہیں آسمان کی طرف اٹھایا گیا۔

سوال 5: قرآن حکیم نے عیسائیوں کے غلط عقائد کی تردید کیسے کی؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ تھا۔ ﴿2﴾ معجزات کے بارے میں واضح کیا کہ یہ سارے کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے کچھ بھی اپنے اختیار سے نہیں کیا۔ ﴿3﴾ مسیح علیہ السلام تو صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے جس کی صلیب والی تصویر تم نے اپنے مذہب کا حصہ بنالی ہے مسیح علیہ السلام کو تو اس سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھالیا تھا۔

سوال 6: ﴿وَمَا أَفْعَاكُ إِلَّا﴾ ”اور تجھے اپنی جانب اٹھانے والا ہوں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ رب العزت نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمانوں پر اٹھالیا۔ ان کے دشمنوں نے ایک شخص کو پکڑ کر صلیب پر چڑھایا اور قتل کر دیا۔ اس طرح وہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو شہید کرنے کے عظیم جرم کے مرتکب ہوتے رہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں واضح فرمایا: ﴿وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا﴾ حالانکہ انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ اسے سولی چڑھایا بلکہ ان کے لیے اس کی شبیہ بنا دی گئی۔ اور بلاشبہ جن لوگوں نے اس

میں اختلاف کیا یقیناً وہ اس کے بارے میں شک میں ہیں، انہیں اس کے بارے میں گمان کا پچھا کرنے کے سوا علم نہیں اور انہوں نے یقیناً اسے قتل نہیں کیا۔ (النساء: 157) سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کرنے والے شک میں ہیں۔ ﴿3﴾ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کا مخلوق سے اوپر ہونا اور عرش پر حقیقتاً مستوی ہونا ثابت ہوتا ہے جیسے کہ قرآن وحدیث کی نصوص سے ثابت ہوتا ہے جنہیں اہل سنت نے تسلیم کیا ہے اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ (تفسیر سعدی: 373/1)

سوال 7: سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی وفات نہیں ہوئی تھی انہیں آسمان پر اٹھایا گیا۔ وہ زندہ ہیں، آئندہ ان کا مشن کیا ہوگا، اس کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ اٹھائے گئے ہیں۔ ﴿2﴾ قرب قیامت کے زمانہ میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ 100 سے زائد احادیث نزول مسیح علیہ السلام کے بارے میں مروی ہیں۔ ﴿3﴾ جب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے مسیح دجال کو قتل کریں گے، صلیب کو توڑ ڈالیں گے اور سجدہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے گا۔ ﴿4﴾ نبی ﷺ نے یہود کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: (اِنَّ عِيسَى لَمْ يَمُتْ وَاِنَّهٗ رَاجِعٌ اِلَيْكُمْ) یقیناً عیسیٰ علیہ السلام نے وفات نہیں پائی یقیناً وہ تمہاری طرف واپس لوٹیں گے۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب آسمان سے اتریں گے صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ قبول نہیں کریں گے۔ ان کے نزدیک یا تو اسلام ہوگا یا قتل، وہ شریعت اسلامیہ کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں گے اور مسلمان ہی ان کے مددگار اور ان کے پیروکار ہوں گے اور بہت ممکن ہے کہ اس آیت کریمہ میں اس کی طرف اشارہ ہو۔ (مسلم: 389) ﴿5﴾ یہ نبی امور میں سے ہے، منشا بہات میں داخل ہے۔ اس کی تاویل صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

سوال 8: ﴿وَمُطَهَّرَكَ مِنَ الْاٰذِنِ كُفْرًا﴾ ”اور تجھے پاک کرنے والا ہوں ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا“ اس سے کیا مراد ہے؟
جواب: ﴿1﴾ ”اور تجھے پاک کرنے والا ہوں“ یہاں اس سے مراد ان الزامات سے پاکیزگی ہے جو یہودی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر عائد کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی پاکیزگی ساری دنیا کے سامنے پیش کر دی۔ ﴿2﴾ اس سے یہ بھی مراد ہے کہ یہود و نصاریٰ، مجوسیوں اور آپ کی قوم کے ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا آپ کو پاک کرنے والا ہوں۔

سوال 9: ﴿وَجَاعِلُ الْاٰذِنِ اَتْبَعُوكَ فَوَيَ الْاٰذِنِ كُفْرًا اِلٰی يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ ”اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی انہیں قیامت کے دن تک ان لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں جنہوں نے کفر کیا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی انہیں قیامت کے دن تک ان لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں جنہوں نے کفر کیا“ ﴿1﴾ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی صحیح معنوں میں پیروی کرنے والے صرف مسلمان ہیں اور اگر صرف ماننے والے ہوں تو پھر عیسائی اور مسلمان ہیں۔ ﴿2﴾ یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا دنیاوی معاملہ ہے۔ آخرت کا معاملہ اس کے علاوہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے طریقہ کار کے مطابق ہوگا۔

سوال 10: ﴿ثُمَّ آتَىٰ مَرْجِعَهُمْ فَأَكْهَمَ بَيْنَهُمُ الْبَيْتَاتُ فَاصْتَلَفْتُمْ فِيهَا كُفْرًا بَلَّغْتُمْ فِيهَا إِلَهَكُمْ كَغُفْلَةٍ﴾ ”پھر میری طرف تم سب کی واپسی ہے، سو میں تمہارے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”پھر میری طرف تم سب کی واپسی ہے“ اس سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا اٹل ہے، اس کی طرف لوٹنے سے کوئی چھٹکارا نہیں پاسکتا، اس سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ ﴿2﴾ ”میں تمہارے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے“ لوگوں کے درمیان اختلافات کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے ہی کرنا ہے، اس کا فیصلہ کسی کے خود ساختہ عقیدے کے مطابق نہ ہوگا۔

﴿فَأَمْآلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَالَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ﴾ (56)

”پھر جن لوگوں نے کفر کیا انہیں میں دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا اور ان کے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا۔“ (56)

سوال 1: ﴿فَأَمْآلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ ”پھر جن لوگوں نے کفر کیا انہیں میں دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿فَأَمْآلَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ ”پھر جن لوگوں نے کفر کیا“ یہاں کافروں سے مراد اہل صلیب ہیں اور اہل تثلیث ہیں۔ (تفسیر المیسر: عائض القرنی: 73/1) ﴿2﴾ رب العزت نے ان کافروں کے بارے میں واضح فرمایا جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس کی آیات کے ساتھ کفر کیا۔ ﴿فَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا﴾ ”انہیں میں دنیا میں سخت عذاب دوں گا“ دنیا کے عذاب سے مراد قتل، قید، ذلت اور مسکنت ہے۔ ﴿3﴾ ﴿وَالْآخِرَةِ﴾ ”اور آخرت میں“ آخرت کے عذاب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور جہنم کا عذاب ہے۔ ﴿4﴾ جو لوگ حق کا انکار کرتے ہیں ان کے لئے دنیا اور آخرت کا عذاب ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ دراصل سچائی کی مخالفت کرتے ہیں جو جہالت بھی ہے اور نافرمانی بھی۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ کی نظر میں انکار کرنے والے مفسد ہیں کیونکہ وہ خود بھی جنت جانے سے رکتے ہیں اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ ایسے مفسدین کو دنیا میں بھی سزا دی جائے اور آخرت میں شدید عذاب ان کا مقدر ہے۔

سوال 2: ﴿وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ﴾ ”اور ان کے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور ان کے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا“ جو انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا سکے۔ نہ کسی کی شفاعت، نہ دوستی، نہ رشتے داری کام آئے گی نہ خود اپنے کام آسکیں گے۔ ﴿2﴾ جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوست بناتے ہیں وہ ان کے لیے مددگار نہیں ہوں گے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچائیں اور ان کی شفاعت کریں۔

﴿وَأَمْآلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَاللَّهُ لَا يَجِبُ الظَّالِمِينَ﴾ (57)

”لیکن جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، تو انہیں وہ پورے پورے ان کے اجر دے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت

نہیں کرتا۔“ (57)

سوال 1: ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ﴾ ”لیکن جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے تو انہیں وہ پورے پورے ان کے اجر دے گا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ ”لیکن جو لوگ ایمان لائے“ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، موت کے بعد کی زندگی پر اور ان سب امور پر ایمان لائے جن پر ایمان لانے کا انہیں حکم دیا گیا۔ ﴿2﴾ ﴿وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ ”اور جنہوں نے نیک عمل کیے“ اعمال صالحہ سے مراد وہ تمام اعمال ہیں جن کا تعلق دل، زبان اور بدن سے ہے، وہ اعمال جن کو رسولوں نے مشروع اور مطلوب قرار دیا، جن کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ ﴿3﴾ ﴿فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ﴾ ”تو انہیں وہ پورے پورے ان کے اجر دے گا“ انہیں ان کا پورا اجر دیا جائے گا، دنیا میں عزت، احترام، پاکیزہ زندگی اور مدد اور مکمل ثواب آخرت میں ملے گا جہاں اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و کرم بھی ہوگا۔ ﴿4﴾ ایمان والوں کو پورا پورا اجر ایمان اور نیک اعمال اور جہالت چھوڑ کر فرماں برداری کا رویہ اپنانے کی بنیاد پر دیا جائے گا۔

سوال 2: ﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتا“ وہ ظالموں پر غضب ناک ہے، ان سے ناراض ہے۔ ﴿2﴾ ظلم اس کائنات کی فطرت کے خلاف ہے کیونکہ ظالم حق دار کو اس کا حق نہیں دیتا۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ عادل ہے اس لئے ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور وہ کیسے اپنے بندوں پر ظلم کر سکتا ہے جب کہ انہیں ان کے اعمال کی جزا دیتا ہے۔

﴿ذَلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ﴾ (58)

”یہ ہے جو ہم پر حکمت آیات اور نصیحت میں سے تم پر پڑھتے ہیں۔“ (58)

سوال: ﴿ذَلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ﴾ ”یہ ہے جو ہم پر حکمت آیات اور نصیحت میں سے تم پر پڑھتے ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”یہ ہے جو ہم پر حکمت آیات اور نصیحت میں سے تم پر پڑھتے ہیں“ اللہ تعالیٰ کا نبی ﷺ اور ان کی امت پر احسان ہے کہ حکمت والا حکم اور پختہ قرآن ان پر نازل کیا۔ ﴿2﴾ پر حکمت آیات اور نصیحت سے مراد قرآن حکیم ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے پر حکمت قرآن مجید میں حلال و حرام کے احکامات بیان فرمائے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ نے نصیحت بھرے قرآن میں انبیاء کے حالات و واقعات اور معجزات بیان فرمائے۔ جن سے ہمیں ثابت قدمی، اطمینان قلب اور عبرت حاصل ہوتی ہے۔ ﴿5﴾ ﴿وَالذِّكْرِ﴾ ”اور نصیحت“ قرآن مجید کی صفت الذکر ہے۔ اس میں پچھلی قوموں کے حالات و واقعات سے نصیحت کی جاتی ہے۔ ﴿6﴾ اس میں ایسے عقلی دلائل ہیں جن سے ہر صاحب

شعور نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ ﴿7﴾ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا تذکرہ ہے۔ ﴿8﴾ قرآن حکیم میں انسان کی پیدائش، اس کی زندگی، اس کی موت، اس کے حساب کتاب اور ہمیشہ کی جنت اور جہنم کا تذکرہ ہے۔ ﴿9﴾ قرآن حکیم میں رسول اللہ ﷺ کی خدائی مشن سے محبت، اس کے لیے کوششوں، اس کے راستے کی رکاوٹوں اور جاں نثاروں کی قربانی کا تذکرہ ہے۔ ﴿10﴾ قرآن حکیم میں پچھلے انبیاء کا تذکرہ ہے۔ ﴿11﴾ قرآن حکیم ساری انسانیت کے لئے ”الذکر“ نصیحت ہے۔ ﴿12﴾ قرآن مجید ”حکیم“ ہے اور حکمت زندہ مخلوق کی صفت ہے۔ قرآن مجید زندہ کلام ہے دلوں کی زندگی کے لیے آیا، عقل کی غذا کے لیے آیا، زندگی بدلنے کے لیے آیا۔ اس کا پیغام حکمت سے لبریز ہے جو دلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ﴿13﴾ قرآن مجید کی کوئی بات خلاف عقل نہیں، خلاف واقعہ نہیں، کوئی بات انسانی فطرت کے خلاف نہیں۔ ﴿14﴾ قرآن مجید کا کوئی مضمون ایسا نہیں جو انسانی فہم سے بالاتر ہو۔ زمین پر اس حکیم کلام سے بڑا انقلاب کوئی کلام لے کر نہیں آیا۔

﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (59)

”بلاشبہ عیسیٰ کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم کی مثال جیسی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس (آدم) کو مٹی سے بنایا پھر اس سے کہا کہ ہو جا تو وہ

ہو گیا۔“ (59)

سوال 1: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ﴾ ”بلاشبہ عیسیٰ کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم کی مثال جیسی ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”بلاشبہ عیسیٰ کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم کی مثال جیسی ہے“ آدم ﷺ سب سے پہلے بشر ہیں جن کو سبھی بشر تسلیم کرتے ہیں۔ اگر سیدنا عیسیٰ ﷺ بن باپ کے پیدا ہوئے تو سیدنا آدم ﷺ معروف طریقہ کے مطابق مرد اور عورت کے تعلق سے وجود میں نہیں آئے بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت وجود میں آئے۔ جب ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے پھر بھی سیدنا آدم ﷺ اللہ تعالیٰ کے بیٹے نہیں تو سیدنا عیسیٰ ﷺ اسی طرح باپ کے بغیر پیدا ہونے کی بناء پر کیسے اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہو جائیں گے؟ ﴿2﴾ سیدنا عیسیٰ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بیٹے کیسے ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ ایک زندہ و جاوید ہستی ہے اس پر کبھی موت آنے والی نہیں ہے مگر سیدنا عیسیٰ ﷺ پر موت آنے والی ہے۔

سوال 2: عیسائیوں نے سیدنا عیسیٰ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنایا، ان کے دلائل کیا ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ عیسائیوں نے سیدنا عیسیٰ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنایا۔ ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ ﷺ عام انسانوں سے مختلف ہیں۔ ﴿2﴾ ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ ان کی پیدائش باپ کے واسطے کے بغیر ہوئی پھر آپ کو عام انسان کیسے کہا جائے؟ ﴿3﴾ ان کی تیسری دلیل یہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ ﷺ کا طریقہ پیدائش یہ بتاتا ہے کہ آپ بشر سے اوپر ہیں وہ انسان کے نہیں خدا کے بیٹے ہیں۔

سوال 3: ﴿خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ ”اللہ تعالیٰ نے اس (آدم) کو مٹی سے بنایا پھر اس سے کہا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا“ کی

وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اللہ تعالیٰ نے اس (آدم) کو مٹی سے بنایا، انہیں بغیر ماں باپ کے پیدا کیا۔ اس لئے عیسائیوں کے لیے تو سیدنا آدم ﷺ کے بارے میں بھی وہی عقیدہ رکھنا لازم آتا ہے جو وہ سیدنا عیسیٰ ﷺ کے بارے میں رکھتے ہیں۔ اگر سیدنا عیسیٰ ﷺ بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے معبود ہو سکتے ہیں تو آدم ﷺ تو ماں اور باپ دونوں ہی کے بغیر مٹی سے پیدا کیے گئے۔ ﴿2﴾ ”پھر اس سے کہا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا“ اس سے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا شعور دلایا ہے کہ صرف اس کے ”ٹکن“ کہنے سے ہر چیز وجود میں آتی ہے۔

﴿الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِينَ﴾ (60)

”یہی حق ہے تیرے رب کی جانب سے، چنانچہ آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا۔“ (60)

سوال 1: ﴿الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ﴾ ”یہی حق ہے تیرے رب کی جانب سے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”یہی حق ہے تیرے رب کی جانب سے“ یعنی سیدنا عیسیٰ ﷺ کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ حق ہے اور اعلیٰ ترین سچائی ہے۔ ﴿2﴾ انبیاء کے واقعات میں نبی ﷺ اور ان کی امت کی خصوصی تربیت ہے۔

سوال 2: ﴿فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِينَ﴾ ”چنانچہ آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”چنانچہ آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا“ آپ اس کے بارے میں کسی شک میں نہ رہیں کہ سیدنا عیسیٰ ﷺ سیدنا آدم ﷺ کی طرح اللہ تعالیٰ کے بندے، اس کے رسول، اس کا کلمہ اور روح ہیں۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے حق کو دلائل کے ساتھ واضح کیا اس لیے: ﴿فَمَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ﴾ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے؟ (یونس: 32)

﴿فَمَنْ حَا جَكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ آبَاءَنَا وَآبَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ أَوْنِسَاءٌ كَمَا وَنِسَاءُكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ هُمْ تَبْتِهَلُونَ فَجَعَلَ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكٰذِبِينَ﴾ (61)

”پھر جو آپ سے اس میں جھگڑا کرے اس کے بعد جو علم میں سے آپ کے پاس آ گیا تو آپ کہہ دو تم آؤ ہم اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو بلائیں اور اپنی عورتوں اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے آپ کو اور تمہیں بھی بلائیں ہم گڑگڑا کر دعا کریں پس ہم جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجیں۔“ (61)

سوال 1: ﴿فَمَنْ حَا جَكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ ”پھر جو آپ سے اس میں جھگڑا کرے اس کے بعد جو علم میں سے آپ کے پاس آ گیا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”پھر جو آپ سے اس میں جھگڑا کرے اس کے بعد جو علم میں سے آپ کے پاس آ گیا“ یعنی اگر آپ سے کوئی جھگڑا کرتا ہے اور

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے مقام سے بڑھا کر مقام ربوبیت پر لاتا ہے تو جب آپ ﷺ نے یقینی علم کے ساتھ، دلائل کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ ایسے یقینی علم کو نہ ماننے والا عناد میں مبتلا ہے اس کی بحث محض اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت اور ضد کی بنا پر ہے۔ ایسے شخص کا مقصد حق کی پیروی کرنا نہیں اس لیے دلائل کے ساتھ اس کا علاج نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقصد کے لیے ”مباہلہ“ کا طریقہ اختیار کیا جائے گا تاکہ فیصلہ ہو جائے۔

سوال 2: ﴿فَقُلْ تَعَالَىٰ انْتُمْ اَبْنَاءُ نَاو اَبْنَاءُ كُمْ وَنِسَاءُ نَاو نِسَاءُ كُمْ وَانْفُسًا وَاَنْفُسَكُمْ فَتَبْتِهَلْ فَتَجْعَلْ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلٰى الْكٰذِبِيْنَ﴾
 ”تو آپ کہہ دو تم آؤ ہم اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو بلائیں اور اپنی عورتوں اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے آپ کو اور تمہیں بھی بلائیں ہم گڑگڑا کر دعا کریں پس ہم جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اس آیت میں مباہلہ کا طریقہ اختیار کرنے کا حکم ہے۔ اگر دو گروہوں کے درمیان دلیل سے بات کو نہ مانا جائے تو آخری چیلنج ”مباہلہ“ کے ذریعے دیا جاتا ہے تاکہ فیصلہ ہو جائے۔ ﴿2﴾ مباہلہ ایک دوسرے پر لعنت کی بدعا کرنے کو کہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے فریقین اپنے بال بچوں کو لے کر آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

سوال 3: نبی ﷺ مباہلہ کے لیے نکلے تو آپ ﷺ کے ساتھ کون تھا؟

جواب: نبی ﷺ مباہلہ کے لیے نکلے تو آپ ﷺ کے ساتھ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ تھے۔

سوال 4: نجرانی عیسائیوں کا رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر کیا رد عمل تھا؟

جواب: ﴿1﴾ نجرانی عیسائی رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر مرعوب ہو گئے اور انہوں نے باہم مشورے کی مہلت مانگی۔ ﴿2﴾ مشورے میں ان کے ایک عالم نے کہا کہ بنی اسماعیل میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے گا وعدہ فرمایا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ وہی پیغمبر ہوں پھر ایک پیغمبر سے مباہلہ کا یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ تمہارے چھوٹے بڑے سب ہلاک ہو جائیں۔ اللہ کی قسم میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ دعا کریں تو پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائیں اس لیے بہتر ہے ہم صلح کر کے اپنی بستیوں کی طرف نکل جائیں۔

سوال 5: عیسائیوں کے مباہلہ نہ کرنے پر نبی ﷺ نے کیا فرمایا؟

جواب: عیسائیوں کے مباہلہ نہ کرنے پر نبی ﷺ نے فرمایا: اگر یہ لوگ مباہلہ کر لیتے تو یہ وادی ان پر آگ برساتی۔ ﴿1﴾ امام بخاری نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نجران کے نصرانیوں کے دوسرے رسول اللہ ﷺ کے پاس مباہلہ کے لیے آئے۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد ایک نے اپنے ساتھی سے کہا: ایسا نہ کرو اللہ کی قسم اگر یہاں اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اور ہم نے مباہلہ کیا تو ہم اور ہمارے بعد ہماری نسل کبھی فلاح نہیں پائے گی۔ چنانچہ وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو جزیہ دینے پر راضی ہو گئے۔ (صحیح بخاری: 4380) ﴿2﴾ امام احمد نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مباہلہ کی نیت کرنے والے ایسا کر گزرتے تو لوٹنے کے بعد نہ تو انہیں اپنا مال ملتا اور نہ

اہل وعیال۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول ترمذی اور نسائی میں بھی موجود ہے۔ (مسند احمد: 2225)

﴿إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ دُونِ اللَّهِ إِلَّا اللَّهُ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (62)

”بلاشبہ یہ یقیناً سچا بیان ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ یقیناً وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا

ہے۔“ (62)

سوال 1: ﴿إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ﴾ ”بلاشبہ یہ یقیناً سچا بیان ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”بلاشبہ یہ یقیناً سچا بیان ہے“ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یقیناً یہ سچا بیان ہے کہ وہ ”کلمۃ اللہ“ ہیں جسے سیدہ مریم علیہا السلام کی طرف القاء کیا گیا اور اس کی جانب سے روح اور اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

سوال 2: ﴿وَمَا مِنْ دُونِ اللَّهِ إِلَّا اللَّهُ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں“ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت درست نہیں کوئی اس کا استحقاق نہیں رکھتا۔ ﴿2﴾ ”اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں“ اس کا ہم سے یہ تقاضا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو اپنا واحد رب مانیں اور صرف اس کی غلامی اختیار کریں۔ ﴿3﴾ صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کریں۔ ﴿4﴾ صرف اللہ تعالیٰ سے تمام ہدایت اخذ کریں۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے ہدایت نہ لیں چاہے۔ آداب و اخلاق کے معاملات ہوں، چاہے زندگی کے طور طریقے ہوں، چاہے قانون ہو۔

سوال 3: ﴿وَإِنَّ اللَّهَ لَهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ ”اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ یقیناً وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے“ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات ”العزیز“ اور ”الحکیم“ کا کیسے یقین دلایا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ العزیز ہے، وہ ہر چیز پر غالب ہے، ہر چیز اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ الحکیم ہے، وہ حکمت والا ہے جو ہر چیز کو صحیح مقام پر رکھتا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ الحکیم ہے وہ کافروں کے ذریعے سے مومنوں کی آزمائش کرتا ہے جس سے مومن قوی اور عملی طور پر جہاد کرتے ہیں۔ (تفسیر سعدی: 377/1)

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ﴾ (63)

”اگر وہ پھر بھی منہ موڑیں گے تو اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو یقیناً خوب جاننے والا ہے۔“ (63)

سوال 1: ﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ﴾ ”اگر وہ پھر بھی منہ موڑیں گے تو اللہ تعالیٰ یقیناً فساد کرنے والوں کو خوب جاننے والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اگر وہ پھر بھی منہ موڑیں گے“ یعنی وہ توحید اور حق کو قبول کرنے سے اعراض کریں گے۔ ﴿2﴾ ”تو اللہ تعالیٰ یقیناً فساد کرنے

والوں کو خوب جاننے والا ہے، جو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور لوگوں کو اس کی دعوت دیتے ہیں۔ اس میں ان کے لیے وعید اور تہدید ہے۔

سوال 2: دنیا کا فساد کیا ہے؟

جواب: دنیا کا فساد شرک ہے۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾ اگر ان دونوں میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور بھی معبود ہوتے تو ان دونوں میں ضرور فساد برپا ہو جاتا۔ (الانبیاء: 22)

سوال 3: اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ہونے کا یقین کیسے دلایا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حالات کے سچے بیان سے، یہودیوں کی خفیہ تدبیروں کے علم سے، مباہلے کی دعوت اور اس پر رد عمل کے علم سے اور یہودیوں کے فساد کے علم سے اپنے علم ہونے کا یقین دلایا ہے۔

سوال 4: اس رکوع میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور عیسائیت کے بارے میں اہم حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے، مختصراً واضح کریں؟

جواب: ﴿1﴾ عیسیٰ علیہ السلام کے خدا یا خدا کا بیٹا ہونے کا جو عقیدہ ہے اس کی کوئی وجہ بھی درست نہیں۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی مصلحت کے تحت غیر معمولی انداز سے پیدا کیا۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ ہی نے انہیں معجزات عطا فرمائے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ ہی نے انہیں صلیب پر نہ چڑھنے دیا۔ ﴿5﴾ اختیار اللہ تعالیٰ کا ہے وہ اپنے جس بندے کو جیسے چاہے استعمال کر لے۔ ﴿6﴾ کسی انسان کے ساتھ خاص برتاؤ دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ خود مالک تھا یا مالک کا بیٹا تھا یا اس کی ملکیت میں شریک تھا، درست نہیں۔ ﴿7﴾ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت اور ان کے مشن میں کوئی فرق نہیں۔ ﴿8﴾ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا مذہب اسلام تھا یہ وہی مذہب ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ بعد میں عیسائیت ان عقائد پر قائم نہیں رہی۔

رکوع نمبر 15

﴿قُلْ يَا هَلْ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا

أَرْبَابًا إِنَّ دُونَ اللَّهِ لَفَن تَوَكَّلُوا فَقُولُوا شَهِدُوا بِمَا كَانُوا مُسْلِمُونَ﴾ (64)

”آپ کہہ دیں اے اہل کتاب! اس کلمے کی طرف آؤ جو ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان برابر ہے یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی

عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم اللہ تعالیٰ کے سوا ایک دوسرے کو بھی رب نہ بنائیں۔ پھر اگر وہ منہ موڑیں تو

آپ کہہ دیں کہ تم گواہ ہو جاؤ بلاشبہ ہم مسلمان ہیں۔“ (64)

سوال 1: ﴿قُلْ يَا هَلْ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ ”آپ کہہ دیں اے اہل کتاب! اس کلمے کی طرف آؤ جو ہمارے

درمیان اور تمہارے درمیان برابر ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اس کلمے سے مراد وہ کلمہ ہے جس کی بنیاد پر سب متحد ہو سکتے ہیں، جس پر تمام رسولوں کا اتفاق ہے۔ ﴿2﴾ امت مسلمہ میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے اسی کلمہ سوا کو بنیاد بنانے کی ضرورت ہے۔ اہل کتاب سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں۔ ﴿3﴾ اسلام کی پکار ایک اللہ کی پکار ہے، ایک اللہ تعالیٰ کو اپنا سب کچھ بنا لینے کی پکار ہے۔ ﴿4﴾ زندگی کا ہر کام ایک اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرنے کی پکار ہے۔ ﴿5﴾ انبیاء کی اصل تعلیمات اور عقیدہ مسلمانوں اور یہودیوں میں یکساں ہے۔ ﴿6﴾ انبیاء کی اصل تعلیم ”توحید“ ہے۔ ﴿7﴾ توحید کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات، صفات، اختیارات میں ایک مانا جائے، صرف اس کی عبادت کی جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، کسی انسان کو وہ مقام نہ دیا جائے جو کائنات کے مالک کے لیے خاص ہے۔ ﴿8﴾ اسلام، یہودیت اور عیسائیت کے عقیدہ توحید میں کوئی فرق نہیں، عقیدہ توحید ایک ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے توحید کا اقرار کیا لیکن عملی طور پر وہ سب کچھ اختیار کر لیا جو توحید کے خلاف تھا۔ توحید اپنی خالص صورت میں صرف قرآن مجید اور اسلام میں موجود ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے زبان سے اللہ تعالیٰ کو رب کہا لیکن اپنے نبیوں اور بزرگوں کو رب بنا ڈالا۔ عملی اعتبار سے وہ عقیدہ توحید پر نہیں ہیں۔

سوال 2: ﴿الَّا تَعْبُدُ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا﴾ ”یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں“ توکل، محبت، خوف اور امید کا تعلق اسی سے رکھیں، اس کے ساتھ کسی نبی، ولی کسی بت، حیوان، اور جمادات کو شریک نہ کریں۔

سوال 3: ﴿وَلَا يَشْخَذُ بِمَعْصُومٍ ابْنًا ابًا قَرْنًا دُونَ اللّٰهِ﴾ ”اور ہم اللہ تعالیٰ کے سوا ایک دوسرے کو بھی رب نہ بنائیں“ رب بنانے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ”اور ہم اللہ تعالیٰ کے سوا ایک دوسرے کو بھی رب نہ بنائیں“ یعنی صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں۔ ہم کسی مخلوق کی بات مان کر خالق کی نافرمانی نہ کریں کیونکہ یہ کام مخلوق کو خالق کا مقام دینے کے مترادف ہے۔ (تفسیر سعدی: 378/1)

سوال 4: ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَعُوْا اِلَّا الشُّهْدَا بِاَنَّكُمْ مِّنْهُمْ﴾ ”پھر اگر وہ منہ موڑیں تو آپ کہہ دیں کہ تم گواہ ہو جاؤ بلاشبہ ہم مسلمان ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ جب اہل کتاب یا دوسرے غیر مسلموں کو اس بات کی دعوت دی جائے اور وہ تسلیم کر لیں تو وہ دوسرے مسلمانوں کے برابر ہو جائیں گے۔ ان کے حقوق و فرائض دوسرے مسلمانوں کے برابر ہوں گے۔ اگر وہ تسلیم نہ کریں تو ثابت ہو جائے گا کہ وہ اپنی خواہش نفس کے پیروکار اور معاند ہیں۔ تو انہیں گواہ بنا کر کہہ دو کہ ہم مسلمان ہیں۔ (تفسیر سعدی: 378/1) ﴿2﴾ ایمان والوں پر جب شبہات وارد ہوں تو ان کے لیے

ایمان کی تجدید ضروری ہو جاتی ہے تاکہ وہ اپنے رب کی نعمت پر شکر ادا کریں۔ اس لیے آپ کہو کہ ہم سچے مسلمان ہیں اللہ تعالیٰ کے لیے مخلص ہیں۔

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنزِلَتِ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (65)﴾

”اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ حالانکہ تورات اور انجیل اس کے بعد ہی نازل کی گئیں تو کیا تم سمجھتے نہیں؟“ (65)

سوال 1: ﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ﴾ ”اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟“ کا شان نزول بتائیں؟

جواب: ﴿1﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: نجران کے عیسائی اور یہودیوں کے احبار رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہوئے اور آپ ﷺ سے مباحثہ شروع کر دیا۔ احبار نے کہا: ابراہیم علیہ السلام تھے اور عیسائیوں نے کہا: وہ عیسائی تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿2﴾ ﴿لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ﴾ ”تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟“ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جھگڑنے کا مطلب یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی دونوں دعویٰ کرتے تھے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں۔ ﴿3﴾ اہل کتاب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ”مجادلہ“ جھگڑا اس لیے کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کو اپنے دین کے معاملے میں گمراہ کر دیں۔ ﴿4﴾ ان کے جھگڑے کا مقصد یہ تھا کہ ان کے عقائد میں شبہات پیدا کر دیے جائیں۔ ﴿5﴾ جھگڑے کے پس منظر میں یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ نبوت ان کی اولاد میں رہے گی اس طرح وہ یہ فضیلت اپنے نام کروانا چاہتے تھے۔

سوال 2: ﴿وَمَا أُنزِلَتِ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ ”حالانکہ تورات اور انجیل اس کے بعد ہی نازل کی گئیں تو کیا تم سمجھتے نہیں؟“ اللہ تعالیٰ نے یہود اور عیسائیوں کے جھگڑے کا فیصلہ کس طرح کیا؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے یہود اور عیسائیوں کے جھگڑے کا فیصلہ یہ کہہ کر کیا کہ اس بات میں کیوں بحث کرتے ہو جس کا تمہارے پاس کچھ بھی علم نہیں۔ ﴿2﴾ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے نہ عیسائی، نہ مشرک بلکہ ایک سو مسلمان تھے۔ ﴿3﴾ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے نسبت کا سب سے زیادہ حق تو ان کو پہنچتا ہے جنہوں نے ان کی پیروی کی۔ ﴿4﴾ نبی ﷺ اور ان کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حق دار ہیں۔ ﴿5﴾ ﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ تو کیا تم سمجھتے نہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام تورات اور انجیل کے نازل ہونے سے پہلے گزرے ہیں، کیسے ممکن ہے کہ وہ یہودی یا عیسائی ہوں؟ یہ دعویٰ عقل کے خلاف ہے، کیا تم سمجھتے نہیں؟

﴿هَآئِنَّمْ هُوَ لَآءٍ حَآجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (66)﴾

”ہاں تم وہ لوگ ہو تم نے اس بات میں جھگڑا کیا جس کا تمہیں علم تھا پھر اس کے بارے میں کیوں جھگڑا کرتے ہو جس کا تمہیں علم ہی

نہیں؟ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“ (66)

سوال 1: ﴿مَا تَنْتَهُمْ هُوَ لَا حَاجَتُمْ فِيهَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَادِّثُونَ فِيهَا الَّذِينَ نَكْتُمُ بِهِ عِلْمٌ﴾ ”ہاں تم وہ لوگ ہو تم نے اس بات میں

جھگڑا کیا جس کا تمہیں علم تھا پھر اس کے بارے میں کیوں جھگڑا کرتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں؟“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے، عیسائیوں کا دعویٰ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام عیسائی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بحث کا

جواب دیا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں تمہارا جھگڑا ایسے معاملے میں ہے جس کا تمہیں علم نہیں۔ ایسے موضوع پر بحث نہیں کرنی

چاہئے جس کا علم نہ ہو۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لیے فرمایا: تم نے اس بات کے بارے میں تو جھگڑا کیا جن کا تمہیں

علم تھا پھر ایسی بات کے بارے میں کیوں جھگڑا کرتے ہو جس کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ﴿3﴾ سیدنا ابراہیم علیہ السلام تو تورات اور

انجیل نازل ہونے سے بہت پہلے گزرے ہیں۔

سوال 2: ﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کس دین پر تھے۔ ﴿2﴾ ”اور تم نہیں جانتے“ یعنی جہالت کی بنیاد

پر تم نہیں جانتے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا دین کیا تھا۔

﴿مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (67)

”ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی بلکہ وہ ایک سوسلمان تھے اور مشرکوں سے نہیں تھے۔“ (67)

سوال 1: ﴿مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا﴾ ”ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی بلکہ وہ ایک سوسلمان

تھے“ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیا واضح فرمایا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں واضح فرمایا کہ وہ نہ یہودی تھے، نہ عیسائی، ایک سوسلمان تھے، مشرک نہ تھے۔

﴿2﴾ ﴿حَنِيفًا﴾ سے مراد شرک سے بے زار، اللہ تعالیٰ کے لئے خالص۔ حنیف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ایک سو ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے

ماسوا کسی اور کی طرف نہیں جھکتا، جس کی محبت، جس کے جذبے، جس کی اطاعت، جس کی دعائیں، جس کی سرگرمیاں اللہ تعالیٰ کے لیے خالص

ہوں۔ ﴿3﴾ ﴿مُّسْلِمًا﴾ سے مراد صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا ہے۔ مسلم وہ ہے جو اپنا آپ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔

﴿4﴾ ﴿حَنِيفًا مُّسْلِمًا﴾ سے مراد خالص مسلمان ہے۔

سوال 2: ﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ ”اور مشرکوں سے نہیں تھے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور مشرکوں سے نہیں تھے“ یہودیوں اور عیسائیوں کے اندر عقیدے کی تبدیلی شرک کی حد تک پہنچ چکی ہے اور ابراہیم علیہ السلام مشرک نہ تھے۔ ﴿2﴾ مشرکین قریش جو اپنے آپ کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا پیروکار سمجھتے ہیں انہیں یہ بتایا گیا کہ ان کے عقیدے کی کوئی نسبت سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے نہیں ہے۔ اسلام اور شرک دو الگ عقائد ہیں دونوں کی حقیقت الگ ہے، دونوں کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔

﴿إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَكُنَّ الَّذِينَ اتَّبَعُوا هَذَا النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (68)

”یقیناً لوگوں میں ابراہیم کے سب سے زیادہ قریب وہ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اور اللہ

تعالیٰ مومنوں کا دوست ہے۔“ (68)

سوال 1: ﴿إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَكُنَّ الَّذِينَ اتَّبَعُوا هَذَا النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ ”یقیناً لوگوں میں ابراہیم کے سب سے زیادہ قریب وہ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”یقیناً لوگوں میں سیدنا ابراہیم کے سب سے زیادہ قریب وہ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے“ اس سے مراد یہ ہے کہ جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سنت اور ان کے طریقے پر ہیں وہ ان کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ ﴿2﴾ نبی ﷺ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دوست ہیں جو اللہ تعالیٰ کی گواہی کے مطابق ان کے دین پر ہیں۔ اس کے بعد وہ لوگ جو اس نبی ﷺ پر ایمان لائے ہیں اس لیے کہ وہ اپنے نظام زندگی اور اپنے Life style میں ایک جیسے ہو گئے ہیں۔ ﴿3﴾ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے سب سے زیادہ قریب نبی اکرم ﷺ اور سچے مومن ہیں کیونکہ اسلامی شریعت ملت حنیف کے سب سے قریب ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ملت ابراہیمی کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے۔ ﴿4﴾ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر نبی کے لیے انبیاء علیہم السلام میں سے دوست ہوتے ہیں، میرے دوست میرے باپ اور اللہ تعالیٰ کے خلیل جناب ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت ﴿إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَكُنَّ الَّذِينَ اتَّبَعُوا﴾ تلاوت فرمائی ”یقیناً لوگوں میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے سب سے زیادہ قریب وہ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی۔“ (آل عمران: 68) (ترمذی: 2995)

سوال 2: اسلامی نقطہ نظر سے ایمان کا رشتہ ہی اہم رشتہ ہے کیسے، وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اسلامی نقطہ نظر سے ایمان کا رشتہ ہی اہم رشتہ ہے کیونکہ انسان کا Social system ان بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا جن پر جانوروں کا قائم ہوتا ہے۔ مثلاً (i) ایک جگہ چرنے والے جانور (یہ علاقائی بنیاد ہے) (ii) ایک جنس کے جانور (یہ نسلی بنیاد ہے) (iii) ایک چراگاہ میں رہنے والے جانور (خاندانی بنیاد) ﴿2﴾ ایک انسان کا دوسرے انسان سے، ایک گروہ کا دوسرے گروہ سے، ایک نسل کا دوسری نسل سے رابطہ عقیدہ اور نظریہ حیات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ ﴿3﴾ ایک مومن دوسرے مومن سے محبت کرتا ہے۔ (i) ایک مسلمان گروہ کو

دوسرے مسلمان گروہ سے محبت ہوتی ہے۔ (ii) ایک اسلامی جماعت کا دوسری اسلامی جماعت سے تعلق ہوتا ہے۔ ﴿4﴾ ایمان والوں کے آپس میں تعلقات کے لیے (i) زمانے اور علاقے کی حدود حائل نہیں ہو سکتیں۔ (ii) اس تعلق کے راستے میں خون اور نسب کے فاصلے حائل نہیں ہوتے۔ (iii) اس تعلق کے راستے میں قوم اور وطن کے فاصلے بھی آڑے نہیں آسکتے۔ ﴿5﴾ ایمان والے نظریے کی بنیاد پر دوست ہوتے ہیں، ان کی دوستی میں سب سے اہم بنیاد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اسی کی خاطر یہ دوستی وجود میں آتی ہے۔

سوال 3: ﴿وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ﴾ اور اللہ تعالیٰ مومنوں کا دوست ہے، کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور اللہ تعالیٰ مومنوں کا دوست ہے“ اللہ تعالیٰ ان کا حامی و مددگار ہے جو ایمان والے ہیں۔ اس وجہ سے کہ ﴿1﴾ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا کوئی ولی نہیں۔ ﴿3﴾ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کا نام بلند کرنے والے ہیں۔ ﴿4﴾ ایمان والے صدیاں گزرنے پر بھی، زمانے گزرنے پر بھی، زمین اور وطن کا فاصلہ حائل ہونے پر بھی، خاندان اور برادریاں مختلف ہونے پر بھی ایک ہیں، یہ ایک ہی رہیں گے، یہ ایمان والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کا ولی ہے۔

﴿وَدَّتْ كَايِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ﴾ (69)

”اہل کتاب میں سے ایک گروہ خواہش رکھتا ہے کہ کاش وہ تمہیں گمراہ کر دیں حالانکہ وہ نہیں گمراہ کر رہے مگر اپنی جانوں کو اور وہ شعور نہیں رکھتے۔“ (69)

سوال 1: ﴿وَدَّتْ كَايِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ﴾ ”اہل کتاب میں سے ایک گروہ خواہش رکھتا ہے کہ کاش وہ تمہیں گمراہ کر دیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اہل کتاب میں سے ایک گروہ خواہش رکھتا ہے کہ کاش وہ تمہیں گمراہ کر دیں“ اللہ تعالیٰ مومنوں کو اہل کتاب کے اس خبیث گروہ کی مکاریوں سے متنبہ فرما رہا ہے کہ ان کی خواہش یہی ہے کہ تمہیں گمراہ کر دیں۔ جیسے ارشاد ہے: ﴿وَدَّتْ كَايِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ﴾ (البقرہ: 109) اور جسے کسی چیز کی خواہش ہوتی ہے وہ اسے حاصل کرنے کے لیے جدوجہد بھی کرتا ہے۔ یہ گروہ بھی پوری کوشش کرتا ہے کہ مومنوں کو مرتد کر دے۔ اس مقصد کے لیے وہ لوگ ہر ممکن طریقے سے شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (تفسیر منان: 380/1)

سوال 2: ﴿وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ﴾ ”حالانکہ وہ نہیں گمراہ کر رہے مگر اپنی جانوں کو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”حالانکہ وہ نہیں گمراہ کر رہے مگر اپنی جانوں کو“ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ بری تدبیریں کرنے والا اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ مومنوں کو گمراہ کرنے کی کوشش خود ان کی گمراہی اور عذاب میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنِ سَبِيلِ

اللَّهُ زِدْ لَهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ﴾ جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکا ہم ان کے عذاب پر عذاب کا اضافہ کریں گے اس کے بدلے جو وہ فساد کیا کرتے تھے۔ (اٰحل: 88)

سوال 3: اہل کتاب مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور خود گمراہ ہو جاتے ہیں، وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اہل کتاب مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور خود گمراہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی دلی خواہش ہے جس کا اظہار ہر تدبیر، ہر بحث، ہر مناظرے اور ہر سازش سے ہوتا ہے۔ ﴿2﴾ ان کی یہ خواہش محض دشمنی اور شرارت کی وجہ سے ہے، اس لیے یہ کھلی گمراہی ہے۔ ﴿3﴾ اس قسم کی خواہشات سچائی، بھلائی، ہدایت، خیر خواہی کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوتیں۔ ﴿4﴾ اہل کتاب جب بھی اہل اسلام کے خلاف کوئی سازش کرتے ہیں اس وقت خود گمراہ ہو جاتے ہیں اور ان کی گمراہ کرنے کی کوشش خود ان کی گمراہی اور عذاب میں اضافے کا سبب بن جاتی ہیں۔

سوال 4: ﴿وَمَا يَشْعُرُونَ﴾ اور وہ شعور نہیں رکھتے کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور وہ شعور نہیں رکھتے“ انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ ان کی کوشش، ان ہی کو نقصان پہنچا رہی ہے اور وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ رہے۔ (تفسیر منان: 380/1)

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تُشْهِدُونَ (70)﴾

”اے اہل کتاب! تم اللہ تعالیٰ کی آیات کا کفر کیوں کرتے ہو؟ حالانکہ تم گواہی دیتے ہو!“ (70)

سوال 1: ﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ﴾ ”اے اہل کتاب! تم اللہ تعالیٰ کی آیات کا کفر کیوں کرتے ہو؟“ اہل کتاب قرآن مجید کی دعوت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے، اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب: اہل کتاب قرآن مجید کی دعوت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ ﴿1﴾ ان کے اندر یہ احساس تھا کہ وہ پہلے سے حق پر ہیں۔ ﴿2﴾ حق پرستوں کے سب سے بڑے گروہ (بنی اسرائیل) سے وابستگی رکھتے ہیں۔

سوال 2: ﴿وَأَنْتُمْ تُشْهِدُونَ﴾ ”حالانکہ تم گواہی دیتے ہو!“ اہل کتاب کی گواہی سے کیا مراد ہے؟

جواب: ”حالانکہ تم گواہی دیتے ہو!“ یہاں اہل کتاب کی گواہی سے مراد نبی ﷺ کی صداقت اور آپ ﷺ کے حق پر ہونے کا علم ہے۔ بعض واقعات آپ لوگ ایک دوسرے کو خفیہ طور پر بتا بھی دیتے ہو۔

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْسُونِ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (71)﴾

”اے اہل کتاب! تم حق کو باطل سے گڈمڈ کیوں کرتے ہو اور کیوں تم حق کو چھپاتے ہو؟ حالانکہ تم جانتے بھی ہو!“ (71)

سوال 1: اس آیت میں یہودیوں کے کون سے جرائم کی نشان دہی کی گئی ہے؟

جواب: اس آیت میں یہودیوں کے دو بڑے جرائم کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ﴿1﴾ حق اور باطل کو ملانا تاکہ لوگوں کو حق کا پتہ نہ چل سکے۔ ﴿2﴾ حق کو چھپانا تاکہ لوگ نبی ﷺ کے بارے میں یہ نہ جان سکیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں جن کی گواہی تورات میں ان کے اوصاف سے دی گئی ہے۔

سوال 2: ﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِالْحَقِّ بِالْبَاطِلِ﴾ ”اے اہل کتاب! تم حق کو باطل سے گڈ مڈ کیوں کرتے ہو“ حق کو باطل سے گڈ مڈ کرنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”اے اہل کتاب! تم حق کو باطل سے گڈ مڈ کیوں کرتے ہو“ حق کو باطل سے گڈ مڈ کرنے سے مراد یہودیت اور نصرانیت کو اسلام سے ملانا ہے۔ آپ جانتے ہو کہ اس دین کے سوا اللہ تعالیٰ کوئی دین قبول نہیں کریں گے اور اسلام کے بغیر کسی عمل کی جزا نہیں ملے گی۔ (جامع البیان: 3/335) ﴿2﴾ اللہ رب العزت نے حق کو باطل کے ساتھ ملانے پر ان کی گوش حالی کی ہے کیونکہ وہ دو طریقوں سے اپنے ساتھ تعلق رکھنے والوں کو گمراہ کرتے ہیں حالانکہ علم والوں کا فرض ہے کہ وہ حق کو باطل سے اور پاک کو ناپاک سے، حلال کو حرام سے، صحیح کو غلط سے الگ کر دیں تاکہ لوگ ہدایت پر قائم رہیں۔ ﴿3﴾ رب العزت نے فرمایا: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الْبَنِي إِسْرَائِيلَ أَنْ تَدِينُوا بِالْحَقِّ كَمَا دِينْتُمْ لَنَا وَلَا تَكْتُمُونَ لَهُ قَبِيضًا مِمَّا آتَاكُمْ مِنْهُمْ﴾ اور جب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے پختہ عہد لیا جنہیں کتاب دی گئی کہ تم اس کتاب کو لوگوں کے سامنے ضرور بیان کرتے رہو گے اور تم اس کو نہیں چھپاؤ گے تو انہوں نے اس عہد کو اپنی پشتوں کے پیچھے ڈال دیا۔ (آل عمران: 187)

سوال 3: آج کے دور میں مسلمان حق کو باطل سے کیسے گڈ مڈ کرتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ آج کے دور میں مسلمان حق کو باطل سے ایسے گڈ مڈ کرتے ہیں کہ جو لوگ سچے دین کی دعوت لے کر اٹھتے ہیں ان پر کوئی الزام لگا دیتے ہیں اس طرح لوگ ان افراد کے بارے میں ہی نہیں دین کے بارے میں بھی شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ﴿2﴾ جو لوگ دین کی دعوت لے کر اٹھتے ہیں ان کے بارے میں کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑ دیتے ہیں، طرح طرح کے الجھن میں ڈالنے والے سوالات چھیڑنے سے لوگوں کو شک میں مبتلا کرتے ہیں تاکہ لوگ خود بھی الجھیں اور دوسروں کو بھی الجھائیں۔ یہ معاملہ شخصیات تک محدود نہیں رہتا بلکہ لوگ دین کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ﴿3﴾ لوگ دین کی دعوت لے کر اٹھنے والوں کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرتے ہیں، ان پر اعتراضات کرتے ہیں جس سے صرف شخصیات کے بارے میں رائے خراب نہیں ہوتی دین بھی مشتبه ہو جاتا ہے۔ اس طرح مسلمان حق کو باطل سے گڈ مڈ کرتے ہیں۔

سوال 4: ﴿وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ ”اور کیوں تم حق کو چھپاتے ہو؟ حالانکہ تم جانتے بھی ہو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور کیوں تم حق کو چھپاتے ہو؟“ یعنی نبی ﷺ کی شان کے بارے میں جو کچھ تورات اور انجیل میں آیا ہے اس کو چھپاتے

ہو۔ ﴿2﴾ ”حالانکہ تم جانتے بھی ہو“ مقاتل بن حیان کہتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ اسلام دین حق ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ ”یقیناً دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہے“ اور محمد ﷺ کا معاملہ حق ہے۔ (تفسیر ابن ابی حاتم: 678/2)

سوال 5: اہل کتاب کو اللہ تعالیٰ نے کیسے جھنجھوڑا ہے اور کیسے ان کے رویے کی طرف توجہ دلائی ہے، وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اہل کتاب کو اللہ تعالیٰ نے جھنجھوڑا ہے ”اے اہل کتاب! تم حق کو باطل سے گڈمڈ کیوں کرتے ہو اور کیوں تم حق کو چھپاتے ہو؟ حالانکہ تم جانتے بھی ہو!“ تم اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیوں کر رہے ہو باوجود اس کے کہ حق کے دلائل تمہارے پاس موجود ہیں؟ (i) تم ذاتی مصلحتوں اور خواہشوں کی بناء پر انکار کر رہے ہو۔ (ii) تم لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے کفر کر رہے ہو۔ ﴿2﴾ تم حق پر باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بنا رہے ہو۔ (i) اسلامی علوم میں تم نے حق کو باطل سے گڈمڈ کر دیا ہے۔ (ii) تم نے اسلامی تاریخ کے واقعات میں ملاوٹ کی ہے۔ (iii) تم نے ذخیرہ احادیث میں جعلی احادیث ملانے کی کوشش کی ہے جس کا پردہ الحمد للہ محدثین نے چاک کر دیا۔ آج صحیح اور غیر صحیح احادیث کو انہوں نے واضح کر دیا۔ (iv) تم نے ذخیرہ تفسیر میں ملاوٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ (v) تم نے مسلمانوں میں ایسے لوگ داخل کیے جنہوں نے مسلمان بن کر مسلمانوں کو گمراہ کیا ہے۔ (vi) مستشرقین نے طالب علموں کی ایک فوج بنائی ہے جو مسلمانوں کے اندر انتہائی اہم فکری مقامات پر قبضہ کیے ہوئے ہے۔ (vii) تم میں سے بے شمار ایسے لیڈر ہیں جنہیں یہودیوں اور عیسائیوں نے ہمارا لیڈر بنا دیا ہے۔ (الف) جو حق کو چھپاتے ہیں۔ (ب) جو حق کو ضائع کرتے ہیں۔ (ج) جو حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ (ج) جو باطل کو حق بنا کر پیش کرتے ہیں۔

سوال 6: اہل کتاب (یہودیوں اور عیسائیوں) کی سازشوں سے ہم کیسے بچ سکتے ہیں؟

جواب: ہمارے لیے جائے پناہ قرآن مجید ہے جو محفوظ ترین کتاب ہے۔ اس قرآن مجید کو سمجھ کر، اس قرآن مجید کے پیغام کو پھیلانا، اس قرآن مجید کے دامن میں امت مسلمہ کو پناہ دلوانا اور ہمیں محفوظ پناہ مل سکتی ہے۔

رکوع نمبر 16

﴿وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَيْنَا لَكُنَّا أَهْلًا بِمَا نَكْفُرُ وَأَكْفُرُوا كَفَرُوا ذُرِّيَّةً لَّعَلَّهُمْ

يَرْجِعُونَ﴾ (72)

”اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا کہ دن کے آغاز میں تم اس پر ایمان لاؤ جو نازل کیا گیا ان پر جو ایمان لائے۔ اور تم اس کی

شام کو کفر کرو تا کہ وہ واپس لوٹ آئیں۔“ (72)

سوال 1: ﴿وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَيْنَا لَكُنَّا أَهْلًا بِمَا نَكْفُرُوا كَفَرُوا ذُرِّيَّةً لَّعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾

”اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا کہ دن کے آغاز میں تم اس پر ایمان لاؤ جو نازل کیا گیا ان پر جو ایمان لائے اور تم اس کی شام کو کفر کرو تا کہ وہ واپس لوٹ آئیں“ صبح اسلام لا کر شام پھر جانے کے لوگوں پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

جواب: ”اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا کہ دن کے آغاز میں تم اس پر ایمان لاؤ جو نازل کیا گیا ان پر جو ایمان لائے اور تم اس کی شام کو کفر کرو تا کہ وہ واپس لوٹ آئیں“ ﴿1﴾ صبح اسلام لا کر شام پھر جانے کے لوگوں پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ عرب امیوں کے ذہن میں یہ تھا کہ اہل کتاب آسمانی کتابوں کو جانتے ہیں اگر وہ صبح ایمان لاتے ہیں اور شام کو پھر جاتے ہیں تو ضرور انہوں نے اسلام میں کوئی خفیہ کمزوری اور نقص پکڑا ہوگا۔ ﴿2﴾ کمزور طبیعت کے لوگ اور کم فہم لوگ جو دین کی حقیقت کو اچھی طرح نہیں سمجھتے اور جو ثابت قدم نہیں ہوتے متاثر ہوتے ہیں۔ اسلام کے بارے میں ان کے دل میں خلجان پیدا ہوتا ہے۔

سوال 2: یہودیوں اور عیسائیوں کی جانب سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے کیا جدید طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ یہودیوں اور عیسائیوں کی جانب سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے پورے عالم اسلام میں ایسے اساتذہ، محققین اور فلسفی چھوڑے ہوئے ہیں جو اسلام دشمنوں کے ایجنٹ ہیں۔ ﴿2﴾ انہوں نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایسے مصنفین، شعراء، فن کار اور صحافی اپنے جال میں پھنسائے ہوئے ہیں جن کے نام مسلمانوں جیسے ہیں، جو مسلمانوں کی اولاد ہیں لیکن اسلام دشمنی میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ﴿3﴾ ان تمام افراد کے کام یہ ہیں: (i) مسلمانوں کے دل و دماغ میں علم و ادب، صحافت اور فن کے ذریعے سے شکوک و شبہات پھیلانا۔ (ii) اسلامی نظریہ حیات کا مذاق اڑانا۔ (iii) اسلام کے اصولوں کی قدر و قیمت کم کرنا۔ (iv) اسلامی نظریہ حیات کو رجعت پسندی قرار دینا۔ (v) اسلامی تاریخ کا حلیہ بگاڑنا۔ (vi) ہر وقت تبلیغ کرنا کہ اسلامی نظریہ حیات کو چھوڑ دیا جائے، اسے عملی زندگی سے نکال دیا جائے۔ (vii) اخلاقی بنیادیں گرانا۔ (vi) جنسیت کو ہر قید و بند سے آزاد کرنا، اس کے لیے میراتھن ریس، فیشن میگزین، فیشن شو کا انعقاد کرنا۔ (vii) مسلمانوں کے ذہنوں اور ان کے طرز عمل میں ایسے تصورات اور روایات کو فروغ دینا جو اسلامی تصورات کے متضاد ہوں۔

سوال 3: مسلمان جب اہل کتاب کے ایجنٹ بن کر یہ کام کرتے ہیں تو بظاہر ان کا اسلام برقرار رہتا ہے، یہ کیسا طریقہ کار ہے؟

جواب: یہ وہی طریقہ کار ہے جس کے بارے میں رب نے فرمایا: صبح کو اسلام لاتے ہیں، شام کو انکار کر دیتے ہیں۔

﴿وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَىٰ اللَّهِ أَنْ يُؤْتَىٰ أَحَدًا مِمَّا أُوتِينَهُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۗ

قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ (73)

”اور تم کسی کا یقین نہ کرو سوائے اس کے جو تمہارے دین کی اتباع کرے، آپ کہہ دو یقیناً ہدایت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت ہے، یہ (نہ ماننا) کہ کسی ایک کو اس جیسا دیا جائے جو تمہیں دیا گیا تھا، یا وہ تم سے تمہارے رب کے پاس جھگڑا کریں گے۔ آپ کہہ دیں یقیناً اللہ تعالیٰ ہی

کے ہاتھ میں فضل ہے، جس کو وہ چاہتا ہے، عطا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔“ (73)

سوال 1: ﴿وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا بِاللَّهِ تَوَكَّلُوا عَلَيْهِمْ﴾ ”اور تم کسی کا یقین نہ کرو سوائے اس کے جو تمہارے دین کی اتباع کرے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور تم کسی کا یقین نہ کرو سوائے اس کے جو تمہارے دین کی اتباع کرے“ یقین اور اعتماد صرف اس پر کرو جو تمہارے دین کو ماننے والا ہے۔ ﴿2﴾ ”سوائے اس کے جو تمہارے دین کی اتباع کرے“ یعنی مسلمانوں کے مقابلے میں صرف اپنے دین کی اتباع کرنے والوں پر اپنے راز کھولو۔ ﴿3﴾ مسلمانوں کو ان سازشوں کی خبر اس لیے نہ دو کہ کہیں رب کے حضور پیش کرنے کے لیے انہیں تمہارے خلاف قوی حجت نہ مل جائے۔

سوال 2: یہودیوں کے اندر مسلمانوں کے لئے بغض کیوں تھا؟

جواب: یہودیوں کے اندر مسلمانوں کے لئے بغض اس لئے تھا کہ نبوت بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل میں چلی گئی تھی۔

سوال 3: ﴿قُلْ إِنْ أَهْلِي هَدَى اللَّهُ﴾ ”آپ کہہ دو یقیناً ہدایت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”ہدایت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت ہے“ اور وہ اسلام ہے۔ ﴿2﴾ یہ حق بیان اور کامل توفیق ہے۔ یہود نے ہدایت اور گمراہی کو ملا دیا اور لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ (ایسر التفاسیر: 182، 183) ﴿3﴾ ”آپ کہہ دو یقیناً ہدایت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت ہے“ یہود گمان کرتے تھے کہ وہ حق اور ہدایت پر ہیں حالانکہ یہودیت بدعت ہے۔ ﴿4﴾ ”ہدایت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت ہے“ اس سے مراد ہے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ جس کو چاہے ہدایت دے، جس کو چاہے نہ دے کسی کا مکر اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

سوال 4: ﴿أَنْ يُؤْتِي أَحَدٌ مِنْكُمْ مَّا أُوتِيْتُمْ﴾ ”یہ (نہ ماننا) کہ کسی ایک کو اس جیسا دیا جائے جو تمہیں دیا گیا تھا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”یہ (نہ ماننا) کہ کسی ایک کو اس جیسا دیا جائے جو تمہیں دیا گیا تھا“ یہودیوں کے قول کا تذکرہ ہے کہ یہ مت تسلیم کرو کہ نبوت کسی اور کو بھی مل سکتی ہے اور یہ کہ یہودیت کے علاوہ کوئی اور دین بھی حق ہو سکتا ہے۔ ﴿2﴾ یہودیوں کا قول ہے کہ یہ مت تسلیم کرو کہ کسی اور کو دین، نبوت اور فضل بھی مل سکتا ہے۔ (ایسر التفاسیر: 182)

سوال 5: ﴿أَوْ يَحَاجُّوكُمْ حُنْدًا رَبِّكُمْ﴾ ”یا وہ تم سے تمہارے رب کے پاس جھگڑا کریں گے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: یہودیوں کے قول کا تذکرہ ہے کہ اگر تم ان کے سامنے نبی اور دین اسلام کے حق ہونے کا اعتراف کرو گے تو وہ تم سے قیامت کے دن تمہارے رب کے پاس جھگڑا کریں گے اور تمہارے خلاف ان کے پاس دلیل ہوگی۔ اس وجہ سے وہ یہودیت کے دین حق ہونے پر اصرار کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ یہودیت کے ماسواہر دین باطل ہے۔

سوال 6: ﴿قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ﴾ ”آپ کہہ دیں یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں فضل ہے، جس کو وہ چاہتا ہے، عطا کرتا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”آپ کہہ دیں یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں فضل ہے، جس کو وہ چاہتا ہے، عطا کرتا ہے“ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ آپ کہہ دو کہ ایمان کی توفیق اور اسلام کی ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، یہود کے ہاتھ میں نہیں۔ ﴿2﴾ یعنی نبوت، کتاب اور ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے۔ (تفسیر سمرقندی: 223/1) ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے نبوت، کتاب اور ہدایت عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے۔

سوال 7: ﴿وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے“ ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ اپنے فضل میں وسعت والا ہے۔ وہ علیم جانتا ہے کہ دین اور شریعت کا مستحق کون ہے جسے وہ عطا کرے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ واسع العطاء ہے اور وہ علیم ہے مستحق کو جانتا ہے، وہ اسی کو عطا کرتا ہے جو اس کے اہل ہو۔ (تفسیر مراغی: 527/1) ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی تنگ دلی سے اپنے علیم ہونے کا یقین دلایا ہے کہ وہ اپنے سوا کسی اور کا حق نہیں سمجھتے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا دین اور شریعت مل جائے جب کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ دین اور شریعت کسے عطا کرے۔ ﴿4﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اپنی وسعت کا یقین دلایا کہ وہ جسے چاہے دے۔ یقیناً وہ وسعت والا ہے، جاننے والا ہے۔

﴿يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ (74)

”وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے۔“ (74)

سوال 1: ﴿يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ﴾ ”وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے“ رحمت سے خاص کر لینے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے“ رحمت سے مراد دین کی نعمت اور اس کی تکمیل کرنے والی چیزیں ہیں۔ ﴿2﴾ رحمت سے مراد قرآن، اسلام اور نبوت ہے۔ ﴿3﴾ رحمت سے خاص کر لینے سے مراد کسی کو اپنے دین کی نمائندگی کے لیے قبول کرنا ہے۔

سوال 2: اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت کا فیصلہ کس بنیاد پر ہوتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کی رحمت (نبوت) کا فیصلہ گروہی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ یہ فضل اسی پر ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے علم کے مطابق پسند کریں۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت قرآن اور اسلام کے لیے اس کو خاص کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ اپنے علم کے مطابق پسند کریں۔

سوال 3: ﴿وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے“ اس کے فضل کی وسعت بیان نہیں کی جاسکتی۔ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال بھی نہیں آسکتا۔ ﴿2﴾ اس کا فضل اور احسان وہاں تک پہنچتا ہے جہاں تک اس کا علم پہنچتا ہے جو ہر شے کو محیط ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ نے دین اور شریعت عطا کرنے کے لئے اپنے اختیار سے اپنے فضل کا شعور دلایا ہے کہ وہ اس رحمت کے لئے جس کو چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے۔

﴿وَمَنْ أَهْلَ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِقِطْعَةِ لُبِّكَ فَيَؤْتِيكَ الْإِمَامَةَ عَلَيْهِ﴾

﴿قَالَ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ مَا كَانُوا لِي بِأُولِي دِينٍ وَإِنِّي لَأَكْفُرُ بِاللَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبُيُوتِ﴾ (75)

”اور اہل کتاب میں سے ایسے بھی ہیں کہ آپ اگر اس کو ایک خزانے کا امین بنا دو تو بھی وہ اس کو ادا کر دے گا اور ان میں ایسے بھی ہیں کہ آپ اگر اس کو ایک دینار بھی امانت دو وہ بھی آپ کو اس وقت تک ادا نہیں کرے گا مگر جب تک آپ ان کے سر پر کھڑے رہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ یقیناً انہوں نے کہا کہ ان پڑھوں کے بارے میں ہم پر کوئی راستہ نہیں اور وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں۔“ (75)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟

جواب: اشعث بن قیس کہتے ہیں کہ یہ آیت میرے حق میں اتری۔ میرے چچا زاد بھائی کی زمین میں میرا کنواں تھا۔ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ ”گواہ لاؤ“ ورنہ اس سے قسم لے لو۔ میں نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ ﷺ! وہ تو قسم کھا جائے گا“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص کسی مسلمان کا مال مار لینے کی نیت سے خواہ مخواہ جھوٹی قسم کھائے تو جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا تو اس وقت اللہ تعالیٰ اس پر غضب ناک ہوگا۔ (بخاری: کتاب التفسیر)

سوال 2: ﴿وَمَنْ أَهْلَ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِقِطْعَةِ لُبِّكَ فَيَؤْتِيكَ الْإِمَامَةَ عَلَيْهِ﴾ ”اور اہل کتاب میں سے ایسے بھی ہیں کہ آپ اگر اس کو ایک خزانے کا امین بنا دو تو بھی وہ اس کو ادا کر دے گا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور اہل کتاب میں سے ایسے بھی ہیں کہ آپ اگر اس کو ایک خزانے کا امین بنا دو تو بھی وہ اس کو ادا کر دے گا“ جیسے سیدنا عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جن کو ایک قریشی نے بارہ سو اوقیہ سونا دیا تو انہوں نے واپس لوٹا دیا۔

سوال 3: ﴿وَمَنْ أَهْلَ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِقِطْعَةِ لُبِّكَ فَيَؤْتِيكَ الْإِمَامَةَ عَلَيْهِ﴾ ”اور ان میں ایسے بھی ہیں کہ آپ اگر اس کو ایک دینار بھی امانت دو وہ بھی آپ کو اس وقت تک ادا نہیں کرے گا مگر جب تک آپ ان کے سر پر کھڑے رہو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور ان میں ایسے بھی ہیں کہ آپ اگر اس کو ایک دینار بھی امانت دو وہ بھی آپ کو اس وقت تک ادا نہیں کرے گا مگر جب تک آپ ان کے سر پر کھڑے رہو“ اور اہل کتاب میں سے ایسے بھی ہیں کہ امانت میں خیانت کرتے ہیں۔ اگر آپ اس کو قلیل چیز بھی دو تو وہ آپ کو اس

وقت تک ادا نہیں کرے گا جب تک آپ اس کے سر پر کھڑے ہو کر اس سے مطالبہ نہ کرو۔ ان لوگوں میں کعب بن اشرف بھی شامل تھا۔
(تفسیر مرقا: 529/1)

سوال 4: یہودی (ان پڑھ عربوں) غیر یہودیوں کے مال ناجائز ہڑپ کرنے میں حرج کیوں نہیں محسوس کرتے تھے؟

جواب: ﴿1﴾ یہودیوں کا کہنا یہ تھا کہ امانت و دیانت تو صرف ایک یہودی کے دوسرے یہودی کے درمیان معاملات کے لیے ہے۔ اس لیے وہ (ان پڑھ عربوں) غیر یہودیوں کے مال ناجائز ہڑپ کرنے میں حرج محسوس نہیں کرتے تھے۔ ﴿2﴾ تالمود میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیلی کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں۔ مگر غیر اسرائیلی کا بیل اگر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر تاوان ہے۔ نیز اگر کسی کو کوئی گری پڑی چیز ملے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ گرد و پیش آبادی کن لوگوں کی ہے۔ اگر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیے اور اگر غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان وہ چیز رکھ لینی چاہیے۔ (تیسیر القرآن: 1/280, 281) ﴿3﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے لوگ مسئلہ پوچھتے تھے کہ ذمی یا کفار کی مرغی، بکری وغیرہ کبھی غزوے کی حالت میں ہمیں مل جاتی ہے تو ہم تو سمجھتے ہیں کہ اسے لینے میں کوئی حرج نہیں، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ٹھیک یہی اہل کتاب بھی کہتے تھے کہ امیوں کا مال لینے میں کوئی حرج نہیں، سنو جب وہ جزیہ ادا کر رہے ہیں تو ان کا کوئی مال تم پر حلال نہیں، ہاں وہ اپنی خوشی سے دے دیں تو اور بات ہے۔ (عبدالرزاق)

سوال 5: یہودیوں کے اخلاق پر جو روشنی قرآن مجید نے ان آیات میں ڈالی ہے، واضح کریں؟

جواب: ﴿1﴾ قرآن مجید نے یہودیوں کے اخلاق پر جو روشنی ان آیات میں ڈالی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے اخلاق و آداب کے پیمانے مختلف تھے۔ ﴿2﴾ ان میں سے کچھ لوگوں پر آپ اعتماد کر سکتے ہیں، مال کا ڈھیر بھی مل جائے تو وہ ادا کر دیں گے۔ ﴿3﴾ یہودیوں کا کہنا یہ تھا کہ امانت و دیانت تو صرف ایک یہودی کے دوسرے یہودی کے درمیان معاملات کے لیے ہے۔ ﴿4﴾ غیر یہودیوں (عربوں) کے مال تلف کرنے، ناجائز ہڑپ کرنے میں حرج محسوس نہیں کرتے تھے۔ ﴿5﴾ یہودی اپنے سارے اعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کسی فحش بات کا حکم نہیں دیتا۔

سوال 6: ﴿وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذْبُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ ”اور وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں“ تفسیر ابن کثیر میں سیدنا سعید بن جبیر سے نقل ہے کہ جب اہل کتاب نے (لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمُودِ سَبِيلٌ) کہا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کذب اعداء اللہ ”اللہ تعالیٰ کے دشمنوں نے جھوٹ کہا۔“ ﴿2﴾ اس طرح وہ دو گنا ہوں کے مرتکب ہوئے۔ حرام کھانا اور حرام خوری کو حلال سمجھنا۔ یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے۔ ﴿3﴾ جو عالم حرام اشیاء کو حلال کہتا ہے وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا حکم سناتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کا وہ حکم نہیں ہوتا، اسی کو جھوٹ کہتے

ہیں۔ (تفسیر سعیدی: 383/1)

﴿بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ (76)

”کیوں نہیں؟ جو بھی اپنا عہد پورا کرے اور (اللہ تعالیٰ سے) ڈرے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“ (76)

سوال 1: ﴿بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ﴾ ”کیوں نہیں جو بھی اپنا عہد پورا کرے اور (اللہ تعالیٰ سے) ڈرے“ کی وضاحت کریں؟
جواب: ﴿1﴾ ”کیوں نہیں جو بھی اپنا عہد پورا کرے اور (اللہ تعالیٰ سے) ڈرے“ عہد پورا کرنے سے یہاں مراد نبی ﷺ پر ایمان لانے کے لئے وہ عہد ہے جو ہر نبی کے واسطے سے ان کی امتوں سے لیا گیا۔ ﴿2﴾ اس عہد سے مراد وہ وعدہ ہے جو بندے اور رب کے درمیان ہے۔ ﴿3﴾ اس میں اللہ تعالیٰ کے وہ تمام حق شامل ہیں جو اس نے بندے پر واجب کیے ہیں۔ ﴿4﴾ اس عہد میں وہ وعدہ بھی شامل ہے جو بندے کا دوسرے بندوں سے ہوتا ہے اور اپنے عہد کو وہ پورا کر سکتا ہے جو خدا خوبی رکھتا ہو۔

سوال 2: ﴿فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ ”تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں سے محبت کرتا ہے“ کی وضاحت کریں؟
جواب: ”تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں سے محبت کرتا ہے“ جو شخص حقوق اللہ اور حقوق العباد سے متعلق سب گناہوں سے بچتا ہے وہ متقی ہے جس سے اللہ تعالیٰ محبت رکھتا ہے خواہ وہ ”عرب ان پڑھ لوگوں“ میں سے ہو یا دوسروں میں سے ہو۔

سوال 3: اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے کون سے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ امانت کو پورا کرنے والے۔ ﴿2﴾ عہد وفا کرنے والے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ

الْقِيَامَةِ وَلَا يَزْكِيهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (77)

”یقیناً جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی قیمت لیتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ہی قیامت کے دن ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ہی ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔“ (77)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟

جواب: سیدنا عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک شخص مال بیچنے کے لیے کھڑا ہوا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھالی کہ میں نے اس کے عوض اتنا اتنا مال دیا ہے (اور یہ جھوٹ تھا کیونکہ اس نے اتنا مال نہیں دیا تھا جتنا اس نے بتایا۔ تاجروں کی عادت ہوتی ہے کہ زیادہ نفع کمانے کے لیے گاہک کے سامنے جھوٹی قسم کھا جاتے ہیں کہ میں نے تو خود اتنے میں خریدا ہے) اس پر آیت (إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ

مَسَاءً قِيلًا) نازل ہوئی۔ (بخاری کتاب التفسیر: 166/5)

سوال 2: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ ”یقیناً جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی قیمت لیتے ہیں“ اللہ تعالیٰ کے عہد کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں سے محبت کرتا ہے“ اللہ تعالیٰ کے عہد سے مراد اس کی فرماں برداری اور تمام ذمہ داریوں کی ادائیگی ہے۔ ﴿2﴾ اطاعت ایک عہد ہے جو ایمان لانے والے اپنے رب سے کرتے ہیں۔ ﴿3﴾ جو لوگ دنیا کے فائدوں، مصلحتوں اور مفادات کے لئے اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری سے رک جائیں، مصلحت کا شکار ہو جائیں وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی قیمت لیتے ہیں۔ ﴿4﴾ تھوڑی قیمت سے مراد دنیا کے فائدے ہیں جو آخرت کے مقابلے میں بہت تھوڑے ہیں۔ ایک شخص جب ایمان لاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے فرماں برداری کا اور تمام ذمہ داریوں کی ادائیگی کا عہد کرتا ہے جو شریعت کی طرف سے عائد ہوتی ہیں۔ اس عہد کے لیے فائدوں اور مصلحتوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ ﴿5﴾ عہد والی زندگی وہ بناہ سکتا ہے جو نفع و نقصان کو نظر انداز کر کے یہ زندگی اختیار کرے۔ جو ہر مفاد کے موقع پر اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا عہد یاد رکھے۔ جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دے۔ ﴿6﴾ اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی قسموں کو وہ بیچ ڈالتا ہے جو آخرت کو اپنی دنیا کا سودا بنا لے، جو اپنے فائدوں اور مصلحتوں کی طرف جھک جائے۔ ﴿7﴾ جس کے نفس پر چوٹ پڑے یا دنیا کے مفاد کو خطرے میں دیکھے تو اللہ تعالیٰ کے عہد کو نظر انداز کر دے اور دنیا کو ترجیح دے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”منافق کی علامتیں تین ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب اس کو امین بنایا جائے تو خیانت کرے اور جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے۔“ (صحیح بخاری: 2749)

سوال 3: ایفائے عہد کا تعلق کس چیز کے ساتھ ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ایفائے عہد کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ کا خوف ہے جو وعدے پورے کرواتا ہے۔ ﴿3﴾ ایفائے عہد مصلحتوں کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔

سوال 4: ﴿أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ﴾ ”یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا“ ﴿1﴾ یعنی وہاں انہیں کوئی خیر اور بھلائی حاصل نہیں ہوگی۔ (تفسیر سعدی: 384/1) ﴿2﴾ آخرت کی خیر اور بھلائوں، جنت کی نعمتوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ (ابیر التفسیر: 183)

سوال 5: ﴿وَلَا يَجِدُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ہی قیامت کے دن ان کی طرف دیکھے گا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اللہ تعالیٰ نہ ان سے بات کرے گا“ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے اس لیے بات نہیں کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے

ناراض ہوگا کیونکہ انہوں نے رب کی رضا سے خواہش نفس کو مقدم سمجھا ہے۔ ﴿2﴾ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کوئی مال حاصل کرنے کے لیے جھوٹی قسم کھائی وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوگا۔ (صحیح بخاری: 4549) ﴿3﴾ ”اور نہ ہی قیامت کے دن ان کی طرف دیکھے گا“ اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوگا اس لیے قیامت کے دن ان کی طرف نہیں دیکھے گا۔

سوال 6: ﴿وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ ”اور نہ ہی ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور نہ ہی ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا“ ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے گناہوں سے پاک نہیں کرے گا نہ ان کے عیب زائل کرے گا۔ ﴿2﴾ بدبختی کے گھر میں ان کے لیے ہمیشہ قائم رہنے والا عذاب ہے۔ (ایسر التفسیر: 184) ﴿3﴾ جس سے دلوں کو بھی تکلیف ہوگی اور بدنوں کو بھی وہ ہے ناراضی کا عذاب، ویدار الہی سے محرومی کا عذاب اور جہنم کا عذاب۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ (تفسیر سعدی: 384/1) ﴿4﴾ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”تین آدمی ایسے ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا اور نہ انہیں گناہوں سے پاک و صاف کرے گا (معاف کرے گا) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے تین باریہ فرمایا۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ لوگ تو سخت نقصان اور خسارے میں ہوں گے، یہ کون لوگ ہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ٹخنوں سے نیچے کپڑا لگانے والا اور دے کرا حسان جتلانے والا اور جھوٹی قسم کھا کر سامان بیچنے والا۔“ (صحیح مسلم: 293) ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ نے عہد توڑنے والوں کو سزا سنائی ہے ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کی طرف نہیں دیکھے گا، اللہ تعالیٰ انہیں گناہوں سے پاک نہیں کرے گا۔

﴿وَأَنَّ مِنْهُمْ كَفِرًا يُقَالُونَ أَلَسِنْتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَاهُو مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَاهُو

مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (78)﴾

”اور بلاشبہ ان میں یقیناً ایک گروہ ہے جو کتاب پڑھتے ہوئے اپنی زبانوں کو مروڑتے ہیں تاکہ تم اسے بھی کتاب ہی سمجھو حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہے اور وہ اللہ تعالیٰ پر چھوٹ کہتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں۔“ (78)

سوال 1: ﴿وَأَنَّ مِنْهُمْ كَفِرًا يُقَالُونَ﴾ ”اور بلاشبہ ان میں یقیناً ایک گروہ ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور بلاشبہ ان میں ایک گروہ ہے“ ایک گروہ سے مراد یہود کا گروہ ہے جو مدینہ میں نبی ﷺ کے معاصرین تھے۔ ﴿2﴾

کعب بن اشرف، مالک بن صیف اور ان کی طرح کے لوگ تھے۔ (تفسیر مراغی: 1/532,533)

سوال 2: ﴿يَلُونُ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ﴾ ”وہ کتاب پڑھتے ہوئے اپنی زبانوں کو مروڑتے ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”وہ کتاب پڑھتے ہوئے اپنی زبانوں کو مروڑتے ہیں“ مجاہد کا قول ہے کہ وہ تحریف کرتے ہیں۔ (جامع البیان: 3/349) ﴿2﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اس سے مراد یہودی ہیں جو کتاب میں وہ اضافہ کرتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں کیا۔ (فتح القدير: 1/450,451)

سوال 3: ﴿لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ﴾ ”تا کہ تم اسے بھی کتاب ہی سمجھو حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”تا کہ تم اسے بھی کتاب ہی سمجھو حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے“ اس میں لفظی تحریف بھی شامل ہے اور معنوی تحریف بھی۔ ﴿2﴾ ”تا کہ تم اسے بھی کتاب ہی سمجھو حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے“ یعنی وہ اپنی زبانوں کو مروڑ کر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے یہی مراد ہے حالانکہ حقیقت میں وہ مراد نہیں ہوتی۔ انہوں نے وہ بات سمجھائی جو کتاب سے مراد نہیں۔

سوال 4: ﴿وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ ”اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں“ جو لفظ حق معنی پر دلالت کرتا ہے اس سے وہ باطل معنی مراد لیتے ہیں حالانکہ وہ حقیقت سے باخبر ہوتے ہیں۔

سوال 5: دین میں ملاوٹ کیسے ہوتی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کو خود ساختہ معنی پہنا کر۔ ﴿2﴾ دینی تعلیمات کو اپنے رویے کے مطابق ڈھال کر۔ (i) کبھی الفاظ بدل کر (زبان کے ہیر پھیر سے) (ii) کبھی الفاظ کا مفہوم بدل کر۔ ﴿3﴾ اپنے آپ کو بدلنے کی بجائے کتاب بدل کر۔ ﴿4﴾ جو چیز کتاب الہی میں نہیں اس کو عین کتاب الہی بنا کر۔

سوال 6: ﴿وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ ”اور وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں“ یہودی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں کیونکہ صحیح مفہوم کی نفی کرتے ہیں اور غلط مفہوم کا اثبات کرتے ہیں۔ ﴿2﴾ وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں، یہ علم کے بغیر اللہ تعالیٰ پر بات کرنے سے زیادہ بڑا جرم ہے۔

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ كَمَا يَقُولُ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (79) ﴾

”کسی انسان کا یہ حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب و حکمت اور نبوت دے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، بلکہ رب والے ہو جاؤ اس وجہ سے جو تم کتاب سکھاتے تھے اور اس وجہ سے جو تم پڑھتے تھے۔“ (79)

سوال 1: اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟

جواب: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ علمائے یہود اور نجران کے نصاریٰ رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہوئے اور آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو ابورافع قرظی نے کہا: اے محمد! کیا تم چاہتے ہو کہ ہم تمہاری عبادت کریں جس طرح نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں؟ تو ایک نصرانی نے بھی کہا: اے محمد! کیا تم واقعی ہم سے یہ چاہتے ہو؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: غیر اللہ کی عبادت کرنے یا اس کا حکم دینے سے ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس لئے نہیں بھیجا ہے، اور نہ ہی اس کا حکم دیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (لباب العقول فی اسباب النزول از علامہ سیوطی)

سوال 2: ﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ﴾ ”کسی انسان کا یہ حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب و حکمت اور نبوت دے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”کسی انسان کا یہ حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب و حکمت اور نبوت دے“ ﴿1﴾ ﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ ﴾ سے مراد ہے کہ کسی انسان کے لائق نہیں جسے اللہ تعالیٰ کتاب، حکم اور نبوت دے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ ﴿2﴾ الکتاب سے مراد اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی وحی ہے۔ ﴿3﴾ والحکم سے مراد حکمت یعنی دین کی سمجھ اور شریعت کے اسرار ہیں۔ ﴿4﴾ نبوت سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو غیب کی خبریں دینے اور وحی سے کلام کرنے کا عطا کردہ شرف ہے۔ (ایسر التفاسیر: 184,185) ﴿5﴾ ”الحکم“ سے مراد حکمت ہے اور وہ شریعت کی سمجھ اور فہم قرآن ہے جس پر عمل کرنا واجب ہے۔ (تفسیر منیر: 2/298)

سوال 3: ﴿ كَمَا يَقُولُ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ ﴾ ”پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ“ جس پر اللہ تعالیٰ کتاب نازل کرے، اسے علم سکھائے اور مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجے، اس کے لیے ناممکن ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ ایسی بات کا کسی نبی کی زبان سے ادا ہونا سب سے محال ہے۔ انبیائے کرام اعلیٰ کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے منع کرتے ہیں۔ ﴿2﴾ سیدنا

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ جو پہلے عیسائی تھے نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم نے اپنے علماء و مشائخ کو رب تو نہیں بنا رکھا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا یہ بات نہ تھی کہ جس چیز کو وہ حلال کہتے تم اسے حلال اور جسے وہ حرام کہتے تم اسے حرام تسلیم کرتے تھے؟ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ہاں یہ بات تو تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”یہی رب بنانا ہوتا ہے۔“ (تیسیر القرآن: 283/1) ﴿3﴾ ایک مرتبہ فارس کے جہاد کے موقع پر سیدنا ربیع بن عامر رضی اللہ عنہ بطور سفیر رستم کے پاس تشریف لے گئے۔ رستم اہل فارس کا صاحب اقتدار تھا۔ رستم نے کہا: تم لوگ کیوں آئے ہو؟ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف لے جائیں اور جو موجودہ ادیان ہیں ان کے ظلم سے بچا کر اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔ (ابن کثیر: البدایہ فی ذکر یوم القادیہ)

سوال 4: ﴿وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّكُمْ عَلِيمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْمُسُونَ﴾ ”بلکہ رب والے ہو جاؤ اس وجہ سے جو تم کتاب سکھاتے تھے اور اس وجہ سے جو تم پڑھتے تھے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”بلکہ رب والے ہو جاؤ اس وجہ سے جو تم کتاب سکھاتے تھے اور اس وجہ سے جو تم پڑھتے تھے“ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رب والے سے مراد علماء، علماء، حکماء ہیں۔ (تفسیر سفیان الثوری: 78) نبی اسلام لا کر کفر کا حکم کیسے دے سکتا ہے۔ تمام انبیاء یہ دعوت دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ وہی رب ہے، ہم سب اس کے بندے ہیں اور سب اسی کی اطاعت اور بندگی بجالائیں۔ ﴿2﴾ کوئی نبی لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ نہیں کر سکتا۔ ﴿3﴾ کوئی نبی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نبیوں اور فرشتوں کو رب بنا لو۔ ﴿4﴾ نبی اسلام کے راہ نما ہوتے ہیں۔ اسلام سے نکالنے کے لیے راہ نما نہیں بننے لہذا یہ دعویٰ کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام الہ ہیں بے بنیاد ہے۔ تم ربانی بن جاؤ اس سبب سے کہ تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو۔ اس میں یہ بات بھی آجاتی ہے کہ تم خود اہل علم ہو۔ تم اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول کی سنت پڑھتے ہو۔ اس کے پڑھنے پڑھانے سے علم بچتہ ہوتا ہے اور باقی رہتا ہے۔

سوال 5: ﴿بِمَا كُنتُمْ تَعْلَمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْمُسُونَ﴾ ”اس وجہ سے جو تم کتاب سکھاتے تھے اور اس وجہ سے جو تم پڑھتے تھے“ ربانی تعلیم کی پہچان کیا ہے؟

جواب: ”اس وجہ سے جو تم کتاب سکھاتے تھے اور اس وجہ سے جو تم پڑھتے تھے“ ﴿1﴾ ربانی تعلیم کی پہچان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اس سے ملائے۔ ﴿2﴾ وہ تعلیم لوگوں کے اندر اللہ تعالیٰ کے خوف اور محبت کے جذبات پیدا کرے۔ ﴿3﴾ وہ تعلیم جو انسانوں کا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف موڑ دے۔

سوال 6: کون سی تعلیم ربانی نہیں ہے؟

جواب: ﴿1﴾ جو تعلیم خدا پرستی کے علاوہ کسی اور ذات کی طرف رخ موڑنے والی ہو۔ ﴿2﴾ جو تعلیم شخصیت پرستی پیدا کرے۔ ﴿3﴾ جو انسانی جذبات کا مرکز غیر اللہ کو بناتی ہو وہ باطل ہے چاہے اس پر حق کا لیبیل لگا ہوا ہو۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ

لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَّا يَخْشَعُ هَمُّ اللّٰهِ تَعَالَىٰ كِيٰ پناه مانگتے ہیں ایسے علم سے جو نفع نہ پہنچائے اور ایسے دل سے جو اللہ تعالیٰ کے لئے نہ بچکے۔“ (صحیح مسلم: 6906)

سوال 7: ربانی تعلیم کا تقاضا کیا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ علم صحیح اور اس کی سمجھ اور اسرار شریعت کا فہم، عمل اور اطاعت کا تقاضا کرتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی جتنی معرفت رکھتا ہے اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پابندی کرتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ کتاب و حکمت اور نبوت دے تو وہ سب لوگوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کو جاننے والا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پابندی کرتا ہے۔ یہی ربانی تعلیم کا تقاضا ہے۔ ﴿2﴾ جو شرعی علوم کا علم حاصل کرتا ہے اور اس پر عمل کرنا ترک کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا علم اس کے لیے وبال، اس کی ہلاکت، فساد اور اس کی گمراہی کی دلیل بن جاتا ہے۔ ﴿3﴾ اللہ تعالیٰ کا قرب عمل کے بغیر ممکن نہیں۔ جس علم کے مطابق عمل نہیں کیا جاتا وہ علم صحیح نہیں رہتا۔ کفر اسلام کے منافی ہے اور اسلام دین فطرت ہے جو سارے انبیاء کا دین ہے۔ (تفسیر منیر: 300/2)

﴿وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَالِكَةَ وَالنَّبِيَّاتِ أُمَّهَاتٍ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هُنَّ سُبُلَ الْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ (80)

”اور نہ ہی وہ تمہیں یہ حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ، کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم فرماں بردار ہو۔“ (80)

سوال 1: ﴿وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَالِكَةَ وَالنَّبِيَّاتِ أُمَّهَاتٍ﴾ ”اور نہ ہی وہ تمہیں یہ حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ“

فرشتوں اور نبیوں کو رب بنانے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ”اور نہ ہی وہ تمہیں یہ حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ“ ﴿1﴾ ﴿أُمَّهَاتٍ﴾: رب کی جمع ہے۔ جس کے معنی سید، معبود ہیں۔ ﴿2﴾ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنانے سے مراد یہ ہے کہ نبیوں اور فرشتوں کو رب والی صفات کا حامل سمجھنا۔ (i) ان کو نفع و نقصان کا مالک سمجھنا۔ (ii) ان کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنا۔ (iii) اس کائنات کا نظام چلانے میں ان کے حصے کو تسلیم کرنا۔ ﴿3﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہیں نہ اپنی ذات کی عبادت کا حکم دے گا نہ کسی بھی دوسری مخلوق کی عبادت کا حکم دے گا خواہ وہ فرشتے ہوں یا انبیاء یا کوئی اور۔ (تفسیر سعدی: 386/1)

سوال 2: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هُنَّ سُبُلَ الْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ ”کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم فرماں بردار ہو“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم فرماں بردار ہو“ یہاں کفر سے مراد اسلام کو رد کرنا ہے۔ ﴿2﴾ کسی نبی سے ایسی بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ تمہیں کفر کا حکم دے۔ جو شخص کسی نبی کی طرف ایسی بات منسوب کرتا ہے وہ بڑے گناہ کا بلکہ

سے افضل اور ان کے سردار ہیں۔ (تفسیر سعدی: 387/1) ﴿7﴾ اب قیامت تک نبی ﷺ کی اتباع واجب ہے اور نجات صرف رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے ساتھ متعلق ہے۔ اب کسی اور پیغمبر کی اطاعت نہیں ہو سکتی تو کسی اور کی ذات کیسے اطاعت کی مستحق ہو سکتی ہے۔ ﴿8﴾ احادیث صحیحہ سے یہ بات واضح ہے کہ آپ ﷺ کے بعد تا قیامت کوئی نبی نہیں آئے گا۔ البتہ قیامت کے قریب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ضرور نازل ہوں گے۔ مگر اس وقت ان کی حیثیت آپ ﷺ کے تبع کی ہوگی یعنی وہ شریعت محمدیہ کی اتباع کریں گے۔ (تیسیر القرآن: 283/1)

سوال 2: ﴿تَلْوَ مَا تَمَّ اسْ بِرَايْمَانِ لَاؤْ كَے اور تَمَّ ضرور اس کی مدد کرو گے﴾ پیغمبر پر ایمان لانے اور اس کی مدد کرنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”تولوا ما تم اس پر ایمان لاؤ گے“ یعنی اس کی رسالت کی تصدیق کرو گے۔ ﴿2﴾ ”اور تم ضرور اس کی مدد کرو گے“ پیغمبر کی مدد کرنے سے مراد پیغمبر کا ساتھ دینا، اس کے ساتھ تعصب نہ برتنا، اپنے آپ کو دین کا اجارہ دار نہ سمجھنا، حق کی مخالفت نہ کرنا اور اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا ہے۔

سوال 3: ﴿قَالَ أَقْدَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذِكْمِ إِصْرِي قَالُوا أَقْدَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ﴾ ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟“ انہوں نے کہا: ”ہم نے اقرار کیا“ فرمایا: ”پھر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ تمام انبیاء سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ تمہیں بعد میں آنے والے پیغمبر پر ایمان لانا ہوگا۔ اس کی شریعت کی اطاعت کرنی ہوگی اور اس رسول کی مدد کرنا ہوگی۔ یہاں اس عہد کا اللہ تعالیٰ نے اقرار کروایا ہے کہ اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے عہد کی بھاری ذمہ داری کو قبول کروایا تو انہوں نے کہا: ”ہم نے اقرار کیا۔“ ﴿3﴾ سب رسولوں نے اس عہد کی ذمہ داری کو قبول فرمایا۔ ﴿4﴾ اس معاہدے پر اللہ تعالیٰ خود گواہ بنے ہیں۔ ﴿قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ﴾ ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”پھر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔“

سوال 4: انبیاء سے لیا گیا عہد دین کا کیسا تصور پیش کرتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ تمام انبیاء اللہ تعالیٰ کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ ﴿2﴾ تمام انبیاء ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ﴿3﴾ تمام انبیاء ایک دوسرے پر تکیہ کیے ہوئے ہیں۔ ﴿4﴾ تمام انبیاء اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے پابند ہیں۔ ﴿5﴾ دین ایک ہے۔ ﴿6﴾ ساری انسانیت کو اسی ایک دین پر چلایا جائے گا جس میں کوئی تبدیلی نہیں۔ ﴿7﴾ اس دین کو پہنچانے اور اس کو عملی نظام بنانے کے پیچھے انبیاء کا کوئی ذاتی مقصد نہیں ہوتا، نہ کسی ذاتی خواہش کا دخل ہوتا ہے، نہ انبیاء ذاتی عزت کے لیے کام کرتے ہیں۔ ﴿8﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات نے مختلف ادوار میں مختلف

نسلوں کی طرف دین کو پہنچایا ہے۔

سوال 5: دین کے اس تصور اور انبیاء سے لیے جانے والے عہد کا کیا نتیجہ سامنے آتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ دین کے اس تصور اور انبیاء سے لیے جانے والے عہد کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا دین خالص ہو جاتا ہے۔ ﴿2﴾ اس میں کوئی ذاتی تعصب نہیں ہوتا۔ ﴿3﴾ رسول کی ذات بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ ﴿4﴾ رسول کی قوم کا اس دین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ﴿5﴾ رسول کے ماننے والوں اور ان کے خاندانوں کے چھپے ہوئے اثرات سے بھی دین پاک رہتا ہے۔ ﴿6﴾ کسی شخصیت کا بھی اس دین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ﴿7﴾ اللہ تعالیٰ بھی ایک، دین بھی ایک اور انبیاء کا سلسلہ بھی ایک ہو جاتا ہے۔

سوال 6: آج ہم رسولوں سے لیے جانے والے عہد کی وفاداری کیسے کر سکتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ دین کی سمجھ بوجھ پیدا کر کے دین پر ایمان لا کر عہد وفا کر سکتے ہیں۔ ﴿2﴾ رسولوں پر ایمان لا کر۔ ﴿3﴾ رسولوں کی پیروی کر کے۔ ﴿4﴾ رسولوں کی مدد کر کے۔ ﴿5﴾ اسلامی نظام قائم کر کے۔ ﴿6﴾ تمام دوسرے نظاموں کا مقابلہ کر کے۔

﴿فَمَنْ تَوَلَّى بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ﴾ (82)

”پھر اس کے بعد جس شخص نے منہ موڑا تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔“ (82)

سوال 1: ﴿فَمَنْ تَوَلَّى بَعْدَ ذَلِكَ﴾ ”پھر اس کے بعد جس شخص نے منہ موڑا“ رسول کی اطاعت سے کون منہ موڑ سکتا ہے؟

جواب: ”پھر اس کے بعد جس شخص نے منہ موڑا“ رسول کی اطاعت سے صرف وہی منہ موڑ سکتا ہے جو فاسق ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے والا ہے۔ وہی اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے۔ وہی زمین میں فساد پھیلانے والا ہے۔ جو انبیائے کرام کا پیروکار ہے، یہودی ہو یا عیسائی یا کوئی اور اگر وہ محمد ﷺ پر ایمان نہیں لایا تو وہ اس پختہ عہد کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ اس عہد شکنی کی سزا کے طور پر جہنم میں ہمیشہ رہنے کا مستحق ہو گیا ہے کیونکہ وہ نافرمان ہے۔

سوال 2: اہل کتاب نے رسول اللہ ﷺ کی پیروی سے کیوں منہ موڑا، واضح کریں؟

جواب: ﴿1﴾ اہل کتاب نے رسول اللہ ﷺ کی پیروی سے تعصب کی وجہ سے منہ موڑا حالانکہ وہ دین جو انہیں کتاب تک پہنچا رسولوں کے توسط سے پہنچا ہے۔ اس میں انہوں نے پختہ عہد کیا تھا کہ نبی ﷺ پر ایمان لائیں گے، ان کی مدد کریں گے۔ ﴿2﴾ اہل کتاب کہتے تھے ہم اپنے دین کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے حالانکہ ان کے دین کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نبی ﷺ پر ایمان لائیں۔

سوال 3: ﴿فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ﴾ ”تو وہی لوگ نافرمان ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”تو وہی لوگ نافرمان ہیں“ جو محمد ﷺ پر ایمان نہیں لایا تو وہ اللہ تعالیٰ کے پختہ عہد کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ اس عہد شکنی کی سزا کے

طور پر جہنم میں ہمیشہ رہنے کا مستحق ہو گیا ہے کیونکہ وہ نافرمان ہے۔

﴿ أَفَعَبِّرُونَ اللَّهَ بِئِبْتِغُونَ وَلَئِنِ اسْتَسْلَمَ مِنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَاِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴾ (83)

”کیا وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا کسی اور کو تلاش کرتے ہیں؟ حالانکہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز خوشی یا ناخوشی سے اس کی فرماں برداری

کرتی ہے اور اسی کی طرف وہ لوٹائے جائیں گے۔“ (83)

سوال 1: ﴿ أَفَعَبِّرُونَ اللَّهَ بِئِبْتِغُونَ ﴾ ”کیا وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا کسی اور کو تلاش کرتے ہیں؟“ اللہ تعالیٰ کے دین اور غیر اللہ کے نظامات میں کیا بنیادی فرق ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”کیا وہ اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا کسی اور کو تلاش کرتے ہیں؟“ اللہ تعالیٰ کے دین اور غیر اللہ کے نظامات میں بنیادی فرق ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام ہے اور غیر اللہ کے نظامات خود ساختہ ہیں۔ ﴿2﴾ اسلام دین فطرت ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور غیر اللہ کے نظامات فطری خلا پیدا کرتے ہیں۔ ﴿3﴾ اسلام فرد کی ذات، اجتماعی نظام، نظام زندگی اور کائنات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور غیر اللہ کے دیئے ہوئے نظریات میں کہیں فرد کی ذات کو دبایا گیا تو کہیں اجتماعی نظام کو حاوی کیا گیا۔ غیر اللہ کے دیئے ہوئے نظریات میں کائنات اور انسان کے نفس کے اندر جاری قوانین کی مخالفت ہے۔ ﴿4﴾ اسلامی نظام زندگی سے انسان کو راحت اور اطمینان ملتا ہے، غیر اللہ کے دیئے ہوئے نظریات سے انسان بے چین اور پریشان رہتا ہے۔ وہ ذوق یقین سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ ﴿5﴾ اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرنے کی خواہش نہ درست ہے نہ مناسب اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے دین سے بہتر کوئی دین نہیں۔

سوال 2: ﴿ وَلَئِنِ اسْتَسْلَمَ مِنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا ﴾ ”حالانکہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز خوشی یا ناخوشی سے اس کی فرماں برداری کرتی ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”حالانکہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز خوشی یا ناخوشی سے اس کی فرماں برداری کرتی ہے“ اس کائنات کی زندہ اور غیر جان دار اشیاء اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔ ہر ایک اللہ تعالیٰ کے قانون میں بندھا ہوا ہے۔

سوال 3: ”حالانکہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز خوشی یا ناخوشی سے اس کی فرماں برداری کرتی ہے“ سے انسان کو کس طرف توجہ دلائی گئی ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”حالانکہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز خوشی یا ناخوشی سے اس کی فرماں برداری کرتی ہے“ سے انسان کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ساری کائنات رب کے آگے جھکی ہوئی ہے اور تمہاری فطرت بھی یہی چاہتی ہے کہ تم رب کے آگے جھک جاؤ تو اللہ تعالیٰ کے فرماں

بردار بن جاؤ۔ ﴿2﴾ انسان کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر اسلام کے خلاف راستہ اختیار کرو گے تو فطرت کے خلاف راستہ اختیار کرو گے۔ اپنی طبیعت اور مزاج کے خلاف راستہ اختیار کرو گے۔ اس لیے اپنے خلاف نہ چلو۔ ﴿3﴾ اگر اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کیا تو تباہ ہو جاؤ گے، راستہ گم کر بیٹھو گے، اپنی شخصیت ہی گم کر بیٹھو گے۔ ﴿4﴾ اگر اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ کی پہچان گم کر دو گے جس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ﴿5﴾ مومن خوشی سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں جب کہ کچھ مجبوراً اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار ہیں، اس میں باقی تمام مخلوقات شامل ہیں۔ ﴿6﴾ کافر بھی اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں، اس سے نکل نہیں سکتے۔

سوال 4: ﴿وَالَّذِينَ يُرْجُونَ﴾ اور اسی کی طرف وہ لوٹائے جائیں گے، کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور اسی کی طرف وہ لوٹائے جائیں گے“ سے دو چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ﴿1﴾ عمومی۔ سب نے اس کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ ﴿2﴾ خصوصی۔ انسانیت نے لوٹ کر اللہ تعالیٰ کے نظام کی طرف ہی جانا ہے۔ ﴿3﴾ تمام مخلوق اسی کے پاس لوٹ کر جائے گی۔ وہ سب کے درمیان فیصلہ کرے گا اور انہیں جزا و سزا دے گا۔

﴿قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنزِلَ عَلٰۤى اٰبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيٰعْقُوْبَ وَاٰلِ سَبۡطِ وَاُوۡتٰى مُوسٰى وَاٰلِ عِيۡسٰى

وَالنَّبِيُّوۡنَ مِنْۢ بَآلِهِمۡ لَا نَفَرۡتۡ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنْهُمۡ وَوَعۡدِنَا لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿84﴾

”آپ کہہ دو کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اس پر بھی جو ہمارے اوپر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو ابراہیم پر اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولاد پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو موسیٰ کو، عیسیٰ کو اور تمام انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں۔“ (84)

سوال 1: ﴿قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنزِلَ عَلٰۤى اٰبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيٰعْقُوْبَ وَاٰلِ سَبۡطِ وَاُوۡتٰى مُوسٰى وَاٰلِ عِيۡسٰى

وَالنَّبِيُّوۡنَ مِنْۢ بَآلِهِمۡ﴾ ”آپ کہہ دو کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اس پر بھی جو ہمارے اوپر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو ابراہیم پر اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولاد پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو موسیٰ کو، عیسیٰ کو اور تمام انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”آپ کہہ دو کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محمد ﷺ! آپ اور جو مومن آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور الوہیت پر ایمان لائے ہیں کہہ دیں کہ ہم اپنے رب سبحانہ و تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کے اسماء و صفات کا اعتراف کرتے ہیں۔ (تفسیر الہیمر: 78/1) ﴿2﴾ ”اور اس پر بھی جو ہمارے اوپر نازل کیا گیا“ یعنی قرآن مجید پر ایمان لائے۔ ﴿3﴾ ”اور اس پر بھی جو ابراہیم پر اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر نازل کیا گیا“ جو تمام انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا۔ ﴿4﴾ ”اور ان کی اولاد پر نازل کیا

گیا، یعنی یعقوب اور ان کے بیٹوں، پوتوں پر نازل کیا گیا۔ ﴿5﴾ ”اور اس پر بھی جو موسیٰ کو، عیسیٰ کو اور تمام انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، یعنی تورات، زبور، انجیل اور جو تمام انبیاء پر رب کی طرف سے نازل کیا گیا۔ ﴿6﴾ پہلے یہ حکم دیا گیا کہ محمد ﷺ پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں۔ یہاں یہ حکم دیا گیا کہ سب انبیاء پر، کتابوں پر اور اسلام پر ایمان لائیں جو سب انبیاء کا دین تھا۔

سوال 2: ﴿لَا تَقْرَأُ بَيْنَهُمْ﴾ ”ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے“ انبیاء کے درمیان تفریق کرنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: ﴿1﴾ انبیاء کے درمیان تفریق کرنے سے مراد ایک نبی کو ماننا باقیوں کو نہ ماننا ہے۔ ﴿2﴾ انبیاء کے درمیان تفریق کرنے سے مراد ایک کی فضیلت ثابت کرنا اور باقیوں کو کم درجے کا ثابت کرنا ہے۔ ﴿3﴾ انبیاء کے درمیان تفریق کرنے سے مراد کسی نبی کو سچا کسی کو جھوٹا سمجھنا ہے۔ ﴿4﴾ ”ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے“ ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان بھی تصدیق اور تکذیب کے اعتبار سے فرق نہیں کرتے۔ (تفسیر منیر: 2/309)

سوال 3: ﴿وَمَنْ لَّهُ مُسْلِمُونَ﴾ ”اور ہم اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور ہم اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں“ ہم اللہ تعالیٰ کے آگے سر تسلیم خم کرنے والے ہیں۔ ﴿2﴾ ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔ ﴿3﴾ ہم اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کرتے ہیں۔ ﴿4﴾ ہم اس کی مخلصانہ عبادت کرتے ہیں۔

﴿وَمَنْ يَتَّبِعْ عَزِيزًا إِلَّا سُلَامًا وَدِينًا فَكُنْ يُقْبَلُ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَيْرِينَ﴾ (85)

”اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے

والوں میں سے ہوگا۔“ (85)

سوال 1: ﴿وَمَنْ يَتَّبِعْ عَزِيزًا إِلَّا سُلَامًا وَدِينًا فَكُنْ يُقْبَلُ مِنْهُ﴾ ”اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا“ جو شخص شہادتوں کے اقرار کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ہدایت اخذ نہیں کرتا، اس نظام کو قبول نہیں کرتا جو نبی ﷺ لے کر آئے ہیں، ان کی لائی ہوئی شریعت کو اپنی زندگی میں نافذ نہیں کرتا، اپنے سارے فیصلے اس کتاب کے مطابق نہیں کرتا اس کا پھر کوئی اور طریقہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے دین اسلام پسند کیا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے اس پسندیدہ دین کے علاوہ کسی اور دین پر چلے گا اس کا عمل ناقابل قبول ہوگا کیونکہ دین اسلام میں اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت قبول کرنا اور رسولوں کی فرماں برداری کرنا شامل ہے۔ جب تک یہ کام نہ کرے اس وقت تک

اس نے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دینے والا اور اللہ تعالیٰ کے ثواب کا باعث بننے والا عمل نہیں کیا اور اسلام کے سوا ہر مذہب باطل ہے۔ (تفسیر سعوی: 388/1) ﴿3﴾ مسند احمد میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن اعمال حاضر ہوں گے، نماز آ کر کہے گی: اے اللہ! میں نماز ہوں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو اچھی چیز ہے، صدقہ آئے گا اور کہے گا: اے پروردگار! میں صدقہ ہوں، جواب ملے گا: تو بھی خیر پر ہے، روزہ آ کر کہے گا: میں روزہ ہوں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو بھی بہتری پر ہے، پھر اسی طرح سے اور اعمال بھی آتے جائیں گے اور سب کو یہی جواب ملتا رہے گا، پھر اسلام حاضر ہوگا اور کہے گا: اے اللہ! تو سلام ہے اور میں اسلام ہوں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو خیر پر ہے۔ آج تیرے ہی اصولوں پر سب کو جانچوں گا۔ پھر سزا یا انعام دوں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے ﴿وَمَنْ يَبْتَغِ عَذَابَ الْإِسْلَامِ دِينًا لَكُنْ يُفْعَلْ مِنْهُ﴾ اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔“ (تفسیر ابن کثیر: 436/1)

سوال 2: ﴿الْإِسْلَامُ﴾ کیسا دین ہے؟

جواب: ﴿1﴾ اسلام صرف عبادات اور بندگی کے طریقوں تک محدود نہیں۔ ﴿2﴾ صرف ذکر، اذکار اور مراقبہ تک بھی محدود نہیں۔ ﴿3﴾ محض روحانی اور اخلاقی اصلاح کے کسی نظام تک بھی محدود نہیں۔ ﴿4﴾ اسلام ایک منظم نظام حیات ہے۔ (i) جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی تعلیمات پر ہے۔ (ii) جس میں دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ (iii) جس میں عبادات اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں۔ (iv) جس میں ذکر بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ (v) جس میں اللہ تعالیٰ کے خوف کے تحت دلوں کی اصلاح ہو۔ (vi) جس میں معاشرت کے طور طریقے بھی اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے اخذ کیے گئے ہوں۔ (vi) جس میں قانونی فیصلے بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق ہوں۔

سوال 3: ﴿وَهُوَ فِي الْأَخْدَانِ مِنَ الْخُسْرَيْنِ﴾ اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگا، کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿الْخُسْرَيْنِ﴾ سے مراد ہلاک ہونے والے ہیں کیونکہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔ خسارہ اٹھانے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہر چیز میں خسارہ اٹھایا حتیٰ کہ اپنی جانوں کو بھی خسارے میں ڈال دیا۔

﴿كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

الظَّالِمِينَ﴾ (86)

”اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا؟ حالانکہ انہوں نے گواہی دی کہ یقیناً رسول سچا

ہے اور ان کے پاس واضح دلیلیں بھی آچکی تھیں اور اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“ (86)

سوال 1: ﴿كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ﴾ اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جنہوں نے ایمان لانے کے

بعد کفر کیا؟ اللہ تعالیٰ کس کو ہدایت کا راستہ نہیں دکھاتے؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا؟“ اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت کا راستہ نہیں دکھاتے جو اسلام کی نعمت پا کر کفر کا رویہ اختیار کرے۔ ﴿2﴾ جو ظلم کا رویہ اختیار کرے۔ ﴿3﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: انصار کا ایک شخص اسلام لے آیا پھر مرتد ہو گیا پھر لوٹ آیا اور شرک کرنے لگا پھر نادام ہوا۔ اس نے اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف پیغام بھیجو اور پوچھو: کیا میرے لیے توبہ ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ﴾ اس آیت تک: ﴿وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ ﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ اس کی قوم کے لوگوں نے اس کی طرف پیغام بھیجا تو وہ اسلام لے آیا۔ (جامع البیان: 3/366)

سوال 2: ﴿وَشَهِدُوا أَنَّ الرُّسُولَ حَقٌّ﴾ ”حالانکہ انہوں نے گواہی دی کہ یقیناً رسول سچا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”حالانکہ انہوں نے گواہی دی کہ یقیناً رسول سچا ہے“ انہوں نے گواہی دی کہ یقیناً محمد ﷺ سچے ہیں۔

سوال 3: ﴿وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾ ”اور ان کے پاس واضح دلیلیں بھی آچکی تھیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور ان کے پاس واضح دلیلیں بھی آچکی تھیں“ ان کے پاس نبی ﷺ جو کچھ دین حق میں سے لے کر آئے اس کی صحت کی دلیلیں اور نبی ﷺ کی صداقت کی دلیلیں آچکی تھیں۔ ﴿2﴾ نبی ﷺ کی ذات، آپ ﷺ کی تعلیمات کے بارے میں گواہی کہ وہی تعلیم لائے ہیں جو پچھلے انبیاء لاتے رہے۔

سوال 4: ﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا“ انہوں نے ظلم کیا اور حق کو پہچان کر اس کو ترک کیا۔ انہوں نے ظلم اور خواہش نفس کی پیروی کرتے ہوئے باطل کو اختیار کر لیا حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ باطل ہے۔ اس لیے انہیں ہدایت کی توفیق نہیں ملتی۔ ﴿2﴾ ہدایت کی امید اس کے لیے کی جاسکتی ہے جو حق کو نہ پہچانے لیکن اسے حق کی تلاش ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہدایت کے اسباب میسر فرمادے اور گمراہی سے بچالے۔

﴿أُولَئِكَ جَزَاءُهُمْ أَنْ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ (87)

”یہ لوگ، یہی سزا ہے ان کی کہ یقیناً ان پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور سارے انسانوں کی لعنت ہے۔“ (87)

سوال 1: ﴿أُولَئِكَ جَزَاءُهُمْ أَنْ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ ”یہ لوگ یہی سزا ہے ان کی کہ یقیناً ان پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور سارے انسانوں کی لعنت ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”یہ لوگ، یہی سزا ہے ان کی کہ یقیناً ان پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور سارے انسانوں کی لعنت ہے“ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر

خیر اور بھلائی سے محروم کر دیا ہے۔ ﴿2﴾ لعنت سے مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محرومی ہے۔

سوال 2: اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور انسانوں کی لعنت کے مومن پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

جواب: ﴿1﴾ اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور انسانوں کی لعنت کا مومن پر یہ اثر مرتب ہوتا ہے کہ اگر دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو تو وہ کانپ اٹھتا ہے۔ ﴿2﴾ مومن اسلام کے سوا کسی اور دین کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔

﴿خُلِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ﴾ (88)

”اس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ وہ مہلت دیئے جائیں گے۔“ (88)

سوال 1: ﴿خُلِدِينَ فِيهَا﴾ ”اس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں“ اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں“ اس سے مراد یہ ہے کہ لعنت، عقوبت اور آگ میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿2﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک بار کی رحمت سے محرومی ہمیشہ کی محرومی ہوگی۔ ﴿3﴾ پھر عذاب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ﴿4﴾ کسی قسم کی مہلت نہ دی جائے گی۔ ﴿5﴾ ابو العالیہ کہتے ہیں ﴿خُلِدِينَ فِيهَا﴾ سے مراد ہے کہ وہ آگ میں یعنی لعنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿هُذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُونَ﴾ وَلَا يُؤَدُّ لَّهُمْ فِئْتًا مِّنْهُنَّ ﴿یَوْمَ﴾ یہ دن ہے جس میں وہ کچھ نہ بولیں گے اور نہ ہی انہیں اجازت دی جائے گی کہ وہ معذرت پیش کریں۔ (المرسلات: 35، 36)

سوال 2: ﴿لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ﴾ ”ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ وہ مہلت دیئے جائیں گے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا“ یعنی ان کا عذاب نہ تو ختم کیا جائے گا نہ ہلکا کیا جائے گا۔ ﴿2﴾ ”اور نہ وہ مہلت دیئے جائیں گے“ کیونکہ مہلت کا دور ختم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنی عمر دے دی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ انہیں اگر دوبارہ دنیا میں آنے کا موقع دیا جائے تو پھر وہی کام کریں گے جس سے انہیں روکا گیا تھا۔

﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا﴾ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (89)

”مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اپنی اصلاح کی تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔“ (89)

سوال 1: ﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا﴾ ”مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اپنی اصلاح کی“ اس کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اپنی اصلاح کی“ یعنی جن لوگوں نے کفر اور ظلم کے بعد توبہ کی اور اپنی اصلاح کی۔

﴿2﴾ ”اور اپنی اصلاح کی“ جن لوگوں نے ایمان اور صالح اعمال کے ساتھ اپنے نفوس کی اصلاح کی۔ ﴿3﴾ توبہ دراصل تزکیہ، تطہیر اور اصلاح ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّهَا ۗ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا﴾ یقیناً کامیاب ہو گیا وہ جس نے اسے پاک کیا۔ اور یقیناً نامراد ہوا وہ جس نے اس کو بادیا۔ (الشمس: 10، 9)

سوال 2: اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ کب تک قبول کرتا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک کہ جان حلق میں نہ آجائے۔ ﴿1﴾ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک کہ جان حلق میں نہ آجائے۔“ (ابن ماجہ 4253) ﴿2﴾ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے پہلے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیں گے۔“ (صحیح مسلم: 6861)

سوال 3: ﴿فَإِنَّ اللَّهَ عُفُوٌ رَّحِيمٌ﴾ ”تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے“ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کے گناہوں کو بخش دے گا اور اپنی رحمت سے انہیں جنت میں داخل کرے گا۔ (ایسر التفاسیر: 188) ﴿2﴾ اللہ تعالیٰ نے توبہ اور اصلاح کا عزم رکھنے والوں کی دلی کیفیت سے اپنی رحمت کا یقین دلایا ہے۔ اگر انسان توبہ پر آمادہ ہو سکتا ہے تو رب اس سے بڑھ کر اس کے گناہ معاف کر کے، اس کی مغفرت کر کے اس پر رحمت کر سکتا ہے۔

سوال 4: اللہ تعالیٰ کفر اور گمراہی کے باوجود اسلام کے دروازے کھولے رکھتا ہے۔ اسلام کا دروازہ کیسے کھلتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ کفر اور گمراہی کے باوجود اللہ تعالیٰ اسلام کے دروازے کھولے رکھتا ہے، واپسی کے دروازے بند نہیں کرتا یوں توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتا ہے۔ ﴿2﴾ اسلام بندے اور رب کے درمیان کسی اور ہستی کو حائل نہیں رہنے دیتا۔ جب بھی بندہ سچے دل سے اپنے گناہوں پر پشیمان ہو، وہ زمین کے کسی گوشے میں ہو، اپنے رب کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے آئندہ کبھی نہ کرنے کا عہد کر کے اپنے گناہوں پر توبہ کر سکتا ہے۔ ﴿3﴾ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ہدایت کا دروازہ کھولنے کے لیے انسان خود دستک دے۔ ﴿4﴾ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان توبہ کے بعد عمل صالح شروع کر دے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ إِذْ دَاوُوا كُفْرًا لَنْ نُقَبِّلَ تَوْبَتَهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (90)

”یقیناً جن لوگوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا، پھر کفر میں بڑھتے ہی گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی اور وہی لوگ گمراہ

ہیں۔“ (90)

سوال 1: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ﴾ ”یقیناً جن لوگوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”یقیناً جن لوگوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا“ قداہ رضی اللہ عنہ اس آیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دشمن یہود ہیں جنہوں نے انجیل کا اور عیسیٰ علیہ السلام کا کفر کیا پھر اپنے کفر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا انکار کر کے بڑھ گئے۔ (جامع البیان: 3/369) ﴿2﴾ ابو العالیہ اس آیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دشمن یہود اور عیسائی ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا پھر اپنے گناہوں کی وجہ سے کفر میں اور بڑھ گئے پھر اپنے کفر میں ہی اپنے گناہوں کی بخشش مانگی۔ اگر وہ اس سے پہلے ہدایت پر ہوتے تو ان کی توبہ قبول ہوتی لیکن وہ اپنی گمراہی پر رہے۔ (الدر المنثور: 2/88)

سوال 2: ﴿ثُمَّ إِذَا دُوا كُفْرًا﴾ ”پھر کفر میں بڑھتے ہی گئے“ کفر میں آگے کیسے بڑھا جاتا ہے؟

جواب: ﴿1﴾ ”پھر کفر میں بڑھتے ہی گئے“ توبہ نہ کر کے، اپنے رویے کی اصلاح نہ کر کے، کافرانہ رویے پر اصرار کر کے کفر میں آگے بڑھا جاتا ہے۔ ﴿2﴾ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روک کر، بدگمانیاں پھیلا کر، شبہات پیدا کر کے، دلوں میں وسوسے ڈال کے، بدترین سازشیں اور ریشہ دوانیاں کر کے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن کامیاب نہ ہونے پائے کفر میں آگے بڑھا جاتا ہے۔

سوال 3: ﴿لَنْ نُقْبَلَ تَوْبَهُمْ﴾ ”ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ جسے توبہ کی توفیق نہیں ملتی اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اس لیے ”ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی“ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَقَدْ أَقْبَلْنَا تَوْبَهُمْ وَابْتِغَاءَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِرُوا بِهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ اور ہم ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو پھیر دیں گے جیسا کہ یہ لوگ پہلی بار اس پر ایمان نہیں لائے تھے۔ (الانعام: 110) ﴿فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ﴾ پھر جب وہ پھر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا۔ (الصف: 5) ﴿2﴾ ”ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی“ اس لیے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر ایمان نہیں لائے تھے۔ جب انہوں نے کفر پر اصرار کیا تو اس کے ساتھ ان کی توبہ کیسے قبول کی جائے!

سوال 4: ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ ”اور وہی لوگ گمراہ ہیں“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ﴿1﴾ ”اور وہی لوگ گمراہ ہیں“ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی ہے کہ وہی لوگ گمراہ ہیں۔ جو اس حال میں ہو اس کی توبہ کبھی قبول نہیں ہوتی۔ ﴿2﴾ اس سے بڑی گمراہی کیا ہو سکتی ہے کہ انسان آنکھوں سے دیکھ کر سیدھی راہ کو ترک کر دے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلٌّ عَنِ الْأَرْضِ وَذَمًّا وَلَا لِيُؤْتُوا مِنْهَا مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾

﴿أَلَيْسَ وَمَالِهِمْ مِنْ نُصْرَتِنَا﴾ (91)

”یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے اس حال میں کہ کافر تھے تو ان میں سے کسی ایک سے زمین بھر سونا بھی ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور

اگر چہ وہ اس کو فدیے میں دے، یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا۔“ (91)

سوال 1: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا ذَاوَاتُ مَائِهِمْ كُفَّارًا﴾ ”یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے اس حال میں کہ کافر تھے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے اس حال میں کہ کافر تھے“ اس سے مراد سارے کافر ہیں جنہوں نے کفر کی حالت میں جان دی۔

سوال 2: ﴿فَلَنْ يُغْفَبَ لَكَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِثْلُ حَافِيَةِ أَرْتَأَىٰ لَهُمْ﴾ ”تو ان میں سے کسی ایک سے زمین بھر سونا بھی ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور اگر چہ وہ اس کو فدیے میں دے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”تو ان میں سے کسی ایک سے زمین بھر سونا بھی ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور اگر چہ وہ اس کو فدیے میں دے“ قیامت کے دن انسان چاہے گا اپنے بدلے میں کچھ دے کر اپنی جان بچالے۔ اس کو پورا کرنے کے لیے اس دن اس کے پاس کوئی مال نہیں ہوگا۔ اور اگر ہو بھی تو ان میں سے کسی ایک سے زمین بھر سونا بھی ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور اگر چہ وہ اس کو فدیے میں دے۔

سوال 3: کسے صدقہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں؟

جواب: ﴿1﴾ جو انسان زندگی میں اللہ تعالیٰ کے اصولوں کے خلاف خرچ کرتا ہے اس کے صدقہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ﴿2﴾ دارالعمل کے ختم ہونے کے بعد زمین بھر کر بھی صدقہ کرنے کا ارادہ ہو تو قبول نہیں ہوگا۔

سوال 4: ﴿أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ ”یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے“ انہیں آگ سے ہرگز نہیں نکالا جائے گا بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

سوال 5: ﴿وَمَا لَهُمْ مِنَ الْبُصْرِ﴾ ”اور ان کے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا“ کی وضاحت کریں؟

جواب: ”اور ان کے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا“ وہ دن ہوگا جس میں مال اور بیٹے نفع نہیں دیں گے مگر جو اپنے رب کے پاس قلب سلیم لے کر آیا جو شکر، شکر اور سارے گناہوں سے پاک ہوگا وہ آگ سے نجات پائے گا اور جنت میں داخل ہوگا۔ (امیر التفسیر: 189) سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تبارک و تعالیٰ جہنم والوں میں سے کم عذاب والوں میں سے فرمائے گا: اگر دنیا اور جو کچھ اس میں ہے تیرے لیے ہو تو کیا تو اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ دے دے گا؟“ وہ کہے گا: ”جی ہاں!“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ”میں نے تجھ سے اس سے بھی کم ترین چیز کا مطالبہ اس وقت کیا تھا جب تو آدم کی پشت میں تھا کہ تو (مجھ سے) شکر نہ کرنا۔“ (صحیح مسلم: 7083)